حیدر قریشی کی ادبی خدمات
☆ اُردو شاعری کے بہت سے شعروں سے اُن کی
زندگی کے اہم واقعات کا سراغ مل سکتا ہے لیکن
میری دانست میں حیدر قریشی اُردو کے واحد شاعر
ہیں جنہوں نے اپنے بارے میں اپنی شاعری میں
بہت کچھ بتا دیا ہے اتنا کچھ کہ اگر کوشش کی جائے تو
اُن کی ایک مکمل سوانح عمری مرتب کی جا سکتی ہے
پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد
اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور (پاکستان)
پروفیسر نذر خلیق

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

حیدر قریشی کی ادبی خدمات

نذر خلیق

ناشر

میاں محمد بخش پبلشرز

محلّہ رحیم آباد خان پور

"Haider Qureshi`s Valueable Literarey Countribution"

By: Prof. Nazar Khaleeq

نام کتاب:	حیدر قریشی کی ادبی خدمات
مرتب:	نذر خلیق
سال اشاعت:	۲۰۰۳ء
کمپوزنگ:	برائٹ وے خانپور
ناشر	ابوذر خلیق
قیمت	-/300روپے
مطبوعہ	جھوک پرنٹرز ملتان
ڈیزائن سرورق	شاہد دھریجہ
بک بائنڈنگ	ظہیر بک بائنڈر ملتان

~~~~~~~~~~~~~~

۱۵۵۲ ایل، گلی نمبر۱۲،

قاسم آباد، راولپنڈی

ای میل سے رابطہ کے لئے

khaleeqkhanpur@yahoo.com

....

MiaN Mohammad Bukhsh Publishers

Raheem Abaad, Khan Pur,

Distt.Rahim Yar Khan,Pakistan.
~~~~~~~~~~~~~~

حیدر قریشی کی زندگی کی گولڈن جوبلی پر
ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر
نذرانۂ خلوص و محبت

گر قبول افتد، زہے عزّ و شرف

پھر وقت کے برگد کے تلے، گیان کی دُھن میں
نکلا ہوا گھر سے کوئی سادھو ہے کہ تُو ہے

ترتیب

بحیثیت شاعر (غزل گو،نظم نگار اور ماہیا نگار)

بحیثیت افسانہ نگار

بحیثیت خاکہ نگار اور یاد نگار

بحیثیت انشائیہ نگار،سفر نامہ نگار اور کالم نگار

پیش لفظ

ڈاکٹر سعادت سعید

شعبہ اردو۔انقرہ یونیورسٹی۔ترکی

ادبی تقاریظ وتناقیص کے اس دورِ میں جس نوع کی میانہ روی درکار تھی اسے حیدر قریشی کے سخن فہموں نے اپنی استحقاقی طرفداری سے فروغ دینے کا اہتمام کر ہی دیا ہے تو بندے نے بھی اس میدان میں کودنے سے عار محسوس نہیں کی۔غیر جانبداری کا فقدان کھل رہا ہے تو کیا لوگ لکھنا ہی چھوڑ دیں؟ میر تقی میر کے تذکرے نکات الشعرا سے لے کر زاہد ڈار پر مستقبل قریب وبعید میں لکھے جانے والے تنقیدی صحیفے تک تنقیدی وتیرہ اگر یکساں رہا ہے تو کیا آپ بالیقین کہہ سکتے ہیں کہ سماجی انقلاب کے ابلقِ گراں خواب کی صہیل ہمیں ڈرا رہی ہے؟ میر تقی میر کو ہمہ جہت شاعر نظیر اکبر آبادی کی عوامیت بلکہ یوں کہیے کہ لسانی محیطگی پسند نہ آئی تو معلوم ہوا مستقبل بعید کا ایک بڑا شاعران کی جانب داری کا تیر کھا کر تا ہنوز کمیں گاہ کی طرف دیکھ رہا ہے۔زر بلکہ افراطِ زر کے زور پر کتابیں لکھوانے والے لکھاری شرمندۂ تعبیر ہو ہوا کر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالے منمنا ہی رہے تھے کہ پتہ چلا ایک فلمی بوتل کا جن غالب جیسے عندلیب گلشن نا آفریدہ کی عسرت زدگی کو بیچ بچا کر اردو ادب کی ایک نادرۂ روزگار کے ہتھے چڑھ گیا۔کتاب کاروباری نے دوشیزہ شاعری کی زینت کی نقاب کشائی میں جو اہم کردار ادا کیا ہے اس پر دھرتی قلعی تو کیا ہوتی گل وگلزار ہو کر رہ گئی ہے۔حیدر قریشی کی درویشی شان میں گستاخی کرتے ہوئے اگر میں مزید دیوآسا ادیبوں کی پگڑی اُچھالنے کا کارِ ثواب اپنے صوابدیدی اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے موخر کر رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنی دیدہ دلیریوں کا کفارہ ادا کر چکے ہیں۔حیدر قریشی کی ادبی خدمات کا اعتراف اس امر کی کھلی شہادت ہے کہ تا حال ادبی ضمیر کی مکمل موت واقع نہیں ہوئی۔مفصل سے اٹھنے والے اس غبار نے شاہی ایوانوں سے لے کر گدائی کٹیاؤں تک سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔اس کی راہ میں درِ محبوب بھی آیا ہے اور مامنِ رقیب بھی۔

عہد جدید میں نظم ایک جاندار اور اہم شعری صنف ہے۔ ہیت اور مواد کے اعتبار سے اس میں متنوع تجربوں کی عکس بندی ہوئی ہے۔ حیدر قریشی نے بھی اس صنف کے امکانات کو بروئے کار لانے میں حسب مقدور اپنا حصہ ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی رومانی نظموں سے لے کر ''شالاط'' تک اپنے جذبے، فکر اور احساس کی کئی اوگھٹ گھاٹیاں پار کی ہیں۔ ان کی غزلوں اور ماہیوں کے انفرادی انداز بیان کی داد ان پر اظہار خیال کرنے والے قریباً سبھی نقادوں نے دی ہے۔ تاہم ان کی نظمیں فکری اور احساساتی اعتبار سے زیادہ جامع، منظّم اور مجمل ہیں۔ ان میں ان کی انفرادی تخلیقی شخصیت کا بھرپور اظہار ہوا ہے۔ یہ نظمیں فرد، اجتماع، ملک، دنیا، زمین، فلک، مذہب، عقیدہ، جبر، استحصال، تعصب، منافرت، محبت، انسان، خدا، عشق، حسن، فکر، اسطور وغیرہ کے تناظر میں حیدر قریشی کی ذات کے اظہار کا قوی وسیلہ بنی ہیں۔ حیدر قریشی اس امر سے آگاہ ہیں کہ صنف نظم میں ذاتی اور اجتماعی کیفیات متنوع پیرایوں میں اجاگر ہوسکتی ہیں۔ اس میں جذبے، تخیل اور فکر کی ترکیبی وحدت کی بنیاد پر، پُرقوت اظہار کے دریچے وا ہوتے ہیں۔ حیدر قریشی صنف نظم کی مطلوبہ وملزومہ کلی وحدت کا اہتمام اس طور کرتے ہیں کہ اس کے اجزا کا حسن اور تاثر برقرار رہتا ہے۔

لفظوں کو جستجو ہوئی اپنے وجود کی
مفہوم اپنے رشتے نئے ڈھونڈنے لگے
معنوں کی اک بساط بھی بچھنے لگی نئی
محبوب کے حوالے سے تفہیم چاند کی
اب صرف ایک قصہء پارینہ بن گئی

ایٹم کے دَور نے ہر اک شے کو بدل دیا
تہذیبِ نَو کے نام پہ قدریں بدل گئیں
حسِ لطیف مٹ گئی، انسان پٹ گئے
یہ دُور سے چمکتا ہوا چودھویں کا چاند
دراصل پتھروں کا اک ایسا طلسم ہے

جو اس کی چاندنی کے سرابوں میں تیر کر
پہنچے وہاں تو روح تک پتھرا کے رہ گئے
لیکن میں اپنے دور سے بالکل الگ تھلگ
اور اپنے نظریات کو بھی رکھ کے اک طرف
لفظوں کے وہ پرانے مفاہیم چوم کر
سوچوں تو تیرا چاند سا چہرہ دکھائی دے
میں ڈوب جاتا ہوں تری کرنوں کے نُور میں
تیری نگاہوں سے یوں اُمڈتی ہے چاندنی
لیکن میں جانتا ہوں کہ تُو صرف چاند ہے
وہ چاند جس کا دل ہے فقط پتھروں کا ڈھیر
ڈرتا ہوں تیرے قُرب سے پتھرا نہ جاؤں میں
میں چاہتا ہوں صرف تجھے سوچتا رہوں

جب جانتا ہوں دل ترا ہے پتھروں کا ڈھیر
پھر آئینہء روح کیوں ٹکراؤں گا بھلا؟
تسخیر کر کے میں تجھے کیا پاؤں گا بھلا؟
اچھا ہے تجھ کو دور سے ہی دیکھتا رہوں
اچھا ہے تجھ کو دور سے ہی سوچتا رہوں (**چاند کی تسخیر کے بعد**)

حیدر قریشی کی اس نظم میں جو مختلف اجزا بروئے کار آئے ہیں ان کی داخلی ساخت ان کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہی انداز ان کی کئی دوسری نظموں میں بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی ذیل کے عنوانوں والی نظمیں ملاحظہ ہوں: **خلا۔ چاند کی تسخیر کے بعد۔ نصف سلور جوبلی۔ ایبٹ آباد۔ درد۔ ایک اداس کہانی۔ میں پھر آنسوئوں کا گلا گھونٹ دوں گا۔ پھاگن کی سفاک ہوا۔ فاصلوں میں ملاپ۔ تمہارے لیے ایک نظم** وغیرہ۔

اصطلاح علم بیان میں اشعار کے اس مجموعے کو نظم کہتے ہیں جو کسی مرکزی خیال کا حامل ہے۔ نظم میں ہیت اور مخصوص موضوعات کی قید نہیں ہوتی۔ حیدر قریشی نے نظم کے فنی نظام کا خاص خیال رکھا ہے۔ ان کی نظموں میں موضوعاتی اور معنوی وحدت کی خوبی انہیں اپنے متعدد معاصرین سے ممیّز کرتی ہے۔ وہ خیال کی تدریجی بنت کے ہنر سے واقف ہیں۔ معنوی ارتقا کے مطابق خیال کی مناسب بندوں کی صورت تقسیم کا ہنر ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

تخلیق در تخلیق

خدا خلّاق ہے انسان کی تخلیق کرتا ہے
یہی انساں پھر اپنی جستجو میں خود نئی تخلیق کرتا ہے
یہی انسان لفظوں سے، سُروں سے اور رنگوں سے
کہیں نظموں، کہیں نغموں، کہیں پینٹنگز کو زنجیر کرتا ہے
یہ نظمیں، گیت، تصویریں کہ تخلیقات ہیں اس کی
مگر اس کی طرح یہ سب بھی اپنے اپنے جسموں کے گھروں میں
سانس لیتی ہیں، معانی کے کئی پرتوں کی صورت خود نئی تخلیق
کرتی ہیں، نئی تخلیق میں پھر اپنی ہی تفہیم کرتی ہیں
یہ ہر خلّاق کا، تخلیق کا، جیسے
خود اپنی کھوج، اپنی جستجو، تفہیم کا
تخلیق در تخلیق کا کوئی انوکھا سلسلہ سا ہے
اسی تخلیق در تخلیق ہی میں ارتقا کی داستاں جادو جگاتی ہے
''کہانی ارتقا کی کیا فقط آگے کو ہی بڑھتی چلی جاتی ہے
یا بس اک دائرے میں گھومنا اس کا مقدر ہے؟''

زمانہ سوچ میں غلطاں و پیچاں ہے!
مگر مجھ سے مری اک نظم سرگوشی میں کہتی تھی:
''زمانہ جو بھی کہتا ہے، یقیناً اس کی ہر اک بات میں

اک جزوی سچائی بھی ہوتی ہے۔ کہانی ارتقا کی
آگے بھی بڑھتی ہے لیکن دائرے کی شکل میں
ایسے!''---------

یہ کہہ کر نظم نے اس دائرے کو
ڈرائنگ کر کے ہی دکھایا تھا کہ اس میں سے
کوئی الہامی نغمہ سا اُبھر آیا!

اسی نظم کو دیکھیے اس میں مختلف بند معنوی ربط و تسلسل کے تناظر میں باہمی طور پر پیوست ہیں۔ حیدر قریشی نظم میں اپنے فکر کے مطلوبہ وقفوں کے اعتبار سے بندوں کی تشکیل کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اچھی نظم میں فکری واحساساتی وقفے نظم کے داخلی تسلسل پر منتج ہوتے ہیں۔ حیدر قریشی نے اپنی آزاد نظموں کی تعمیر میں مختلف مصرعوں کی ترتیب و تسلسل سے معنوی پس منظر کی توسیع کا کام لیا ہے۔

نئی شالاط

وہ شہد اور زہر میں گوندھے ہوئے
سوئے ہوئے سارے زمانے جاگ اٹھے ہیں
ہماری داستاں تو داستاں در داستاں کا سلسلہ سا ہے
مگر اس بار لگتا ہے کہانی ہی نرالی ہے
نہ اب وہ آریاؤں کے ہلاکت خیز حملے ہیں
نہ دشتِ قیس ہے، نے خسرو پرویز کے حیلے
نہ اب تھل کا سفر درپیش، نے تختِ ہزارہ ہے
نہ اب گجرات کی جانب رواں جانِ بخارا ہے
فقط میں ہوں!
فقط میں ہوں اکیلا' تنہا اپنے آپ سے بچھڑا ہوا
پھر بھی تمہاری سادگی کے حُسن میں یکجا ہوئے جاتے ہیں

لیلیٰ، شیریں، سسی، ہیر اور سوہنی کے سب جلوے

تمہاری آریائی روح جیسے سرزمینِ دل پہ پیہم حملہ آور ہے
مگر یہ کیسے حملے ہیں
مسیحائی کی بھی تاثیر رکھتے ہیں
یہیں تک ہوتا گر قصہ تو پھر بھی دل کے بچنے کی
کوئی تدبیر ممکن تھی
مگر اب کے ستم یہ ہے
کہ میں اردو کا اک ٹوٹا ہوا شاعر بھی ہوں جاناں!
جو المانی زمیں تک جانے کیسے آن پہنچا ہوں
جو تم تک آن پہنچا ہوں!

حیدر قریشی کی یہ نظم نہ صرف ان کی اپنی ذات کی شعوری مرئیت کی مظہر ہے بلکہ اپنے اس طبقے کے کرب کا واشگاف اظہار بھی ہے جو نیم قصباتی فضاؤں کو جبری یا ارادی اعتبار سے خیر باد کہہ کر ترقی یافتہ صنعتی معاشروں میں جا بستے ہیں۔ **شالاط** آرزو کشی، برتری اور تسخیر کی علامت دکھائی دیتی۔ اس حوالے سے حیدر قریشی نے مجید امجد کے دکھ کا احاطہ بھی کیا ہے۔ **تیامت** (سمیری دیو مالا کی ایک سمندری بلا) **ایک دراوڑ کا پیغام آریائوں کے نام** اور **دعا** جیسی نظمیں تخلیق کر کے حیدر قریشی نے انسان کی بے بسی اور اس پر ہونے والے اور ہو رہے مظالم کی موثر تصویر کشی کی ہے۔ اسی پس منظر میں انہوں نے مروجہ عصری ماحول اور جبر و ستم کے تاریخی اور تہذیبی دھاروں کی شناخت کا کارِ خیر بھی سرانجام دیا ہے۔

پروفیسر نذر خلیق نے درست لکھا ہے ''حیدر قریشی عصرِ حاضر کے ایک اہم شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کے تخلیقی اظہار کی کئی جہات ہیں۔ ایک کثیر الجہت ادیب ہو کر حیدر قریشی نے مختلف اصنافِ ادب میں اپنی ذات کا عکس دیکھا اور دکھایا ہے۔ شاعر کی حیثیت سے غزل، نظم اور ماہیا ان کے اظہار کے پیمانے ہیں۔ اردو ماہیا میں حیدر قریشی کو جو تاریخی مقام اور حیثیت حاصل ہے اس کے بارے اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔'': حیدر قریشی کو خود بھی اس

امر کا احساس ہے کہ ان کی شناخت ان کے کل کام کے تناظر میں بنے گی۔ ان کا خیال ہے کہ ''اگر کوئی کمزور تخلیق کار کئی اصناف میں کام کرے گا تو اس کا ضعف بڑھے گا لیکن اگر کوئی اچھا تخلیق کار کئی اصناف میں اظہار کرے گا تو اس کا ایک کم از کم معیار ہر صنف میں دکھائی دے گا۔''

حیدر قریشی کی نظم **دعا** ملاحظہ ہو

الٰہی
کعبۂ دل کی طرف نظرِ کرم فرما
کہ اس پر ابرہہ، اک لشکرِ جرّار لے کر چڑھتا آتا ہے
یہ ہاتھی والے اپنی نو کلیسیائی عظمت کے لئے
اِس کعبۂ دل کو بڑا خطرہ سمجھتے ہیں
سو اِس کو ایک ہی ریلے میں
پامال کرنے پر تُلے،
چڑھتے ہی آتے ہیں
ادھر میں ابنِ عبدالمطلب بھی، اپنے بابا کی طرح
اس لشکرِ جرّار سے لڑنے کی طاقت ہی نہیں پاتا
مجھے ان ہاتھی والوں سے تو اپنے اونٹ
واپس مانگنے کی بھی نہیں ہمت

خداوندا!
یہ اندھے ظلم کے ہاتھی
یہ جابر۔۔۔۔۔جَور کے ساتھی

حطیمِ دل تلک بھی آن پہنچے ہیں
مِرے مولا!
تجھے معلوم ہے یہ کعبۂ دل تو ترا گھر ہے

سوا پنے گھر کے مالک اپنے گھر کی خود حفاظت کر
اس اندھے ظلم کے عفریت کو
اور جبر کی اس رِیت کو پامال کرا یسے
کہ دنیا پھرابابیلوں کے ہاتھوں
ہاتھی والوں کی ہلاکت کا نظارہ دیکھ لے مالک!

میرے خیال میں دنیا میں جب تک ناانصافی کا دیو پائے کوب رہے گا اس نظم کی علامتی حیثیت بھی برقرار رہے گی اس کے نئے معنی سامنے آتے رہیں گے۔حیدر قریشی کے ہاں دھند، بجھی کہکشاں، اندھا خلا انسان کی ازلی اور ابدی تنہائی کی عکاسی کرنے والے استعارے ہیں، انہیں بے بس تنہا انسان کے گرد اک سفاّک سناٹے مسلسل رقصاں نظر آتے ہیں۔حیدر قریشی کی بعض نظموں میں مجرد، مطلق، کائناتی اور آفاقی قسم کی معنویت کی تشکیل سے زیادہ ٹھوس انسانی، تاریخی تہذیبی اوراساطیری حوالوں کی بنیاد پر سماج اور فرد کے رشتوں کی واقعیت یا ان کے امکاناتی شعور کو متعین کرنے کا مقصد اہم ٹھہرا ہے۔حیدر قریشی کی نظمیں معاصر انسانوں کی آرزوؤں، تمناؤں، امنگوں مجبوریوں اور ناکامیوں کی داستان سناتی ہیں۔ان نظموں میں فرد اجتماع کی علامت بنتا دکھائی دیتا ہے۔داستان ایک زمانے کی حکایت کے طور پر دکھائی دی ہے۔حیدر قریشی نے کائناتی، آفاقی یا یوروپی آزاد خیالی پر مبنی انسان دوستی کا پول کھولنے میں کسی قسم کی لگی لپٹی سے کام نہیں لیا۔متوسط طبقے کے فرد کی حیثیت سے انہوں نے وہی کچھ لکھا جو شعوری طور پر محسوس کیا۔ان کی شاعری ان کے طبقاتی شعور ہی سے عبارت ہے انہوں نے اپنے طبقے سے غیریت نہیں برتی۔حیدر قریشی یا کوئی اور شاعر تمام طبقوں یا تمام انسانوں کی آرزوؤں، شکستوں، امنگوں یا جدوجہد کو پیش کر ہی نہیں سکتا کہ ایسا ہونا نہ صرف تاریخ میں ناممکن ہے بلکہ انسانی شعور بھی اپنی حدود کے اندر ایسا کرنے سے قاصر ہے۔البتہ آزاد خیالی کے نتیجے میں ایسی تنقید ممکن ہے یا ایسے نعرے بلند کئے جاسکتے ہیں۔ان کی نظم **درد** ہی کو لے لیجئے اس میں پیش کیا جانے والا منظر ازلی اور ابدی انسانی دکھ کی استعاراتی صورتحال کا نقیب بن جاتا ہے۔اس نظم میں ان کا شعری برتاؤ میراجی کی نظموں کی یاد دلاتا ہے ۔گہرے سناٹے میں دُور سے آتی کالے انجن کی سیٹی کی آواز، دل کو بھاتی ہوئی لرزتی، سسکتی صدا، دُور ہوتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، تانگے کے پہیوں کی آواز سے مل کے جادو

جگاتی ہے۔دکھ کا احساس دلاتی ہے، دُور ہوتے منظر، ٹوٹتی چوڑیوں کی چھنک، زخم خوردہ مسکراتی، گیت گاتی۔بانسری کی دُکھی اور سُریلی صدا، سَرخوشی اور دُکھ کا رَچاؤ! یہ سب کچھ دل میں کچھ ایسے اترتا ہے جیسے الہام ہو! یہ ساری صدائیں شاعر کو آشنا معلوم ہوتی ہیں اسے جانتی ہیں وہ اِن سب کو پہچانتا ہے یہ انسانی دردوں کی عکاس صدائیں ہیں۔ایسے درد جنہیں شاعر اپنا مونس جانتے آئے ہیں!

دردوغم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا! دوری، تنہائی، دکھ، بے بسی! حیدر قریشی کے استعارے اپنی صورت حال کی تجسیم کرتے ہوئے انسانی صورت حال کی تصویر کشی کر رہے ہیں!

فیض احمد فیض نے اپنی کتاب میزان میں اظہار اور ترجمانی کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر شاعر اپنے پڑھنے والوں کا تصور کئے بغیر محض اپنی تسکین کے لئے کسی جذبے کو ادا کرنے کی کوشش کرے تو اس عمل کو اظہار کہیں گے۔ترجمانی کے عمل کو انہوں نے اظہار کے مدمقابل کے طور پر قبول کیا ہے ان کا کہنا ہے اگر شاعر یہی جذبہ نہ صرف ادا کرے بلکہ اسے دوسروں تک پہنچائے تو اس دوسروں تک پہنچانے کے عمل کو ہم ترجمانی پکاریں گے۔

شاعری میں اظہار کی نوعیت کے بارے میں ہیڈیگر کا قول ہے۔

”شعری اظہار ایک ایسا نامیاتی کل ہے جس میں زندگی کے حقیقی اور غیر حقیقی ہر دو انواع کے مظاہرات ترکیبی صورت اختیار کرتے ہیں“

حیدر قریشی کی غزلیں؛ نظمیں اور ماہیے اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ انہوں نے مقامی اور بین الاقوامی معاشرت کے وسیع میدانوں میں ایک فرد کی حیثیت سے جن تجربوں کا سامنا کیا انہیں اپنے مخصوص تہذیبی وثقافتی عناصر کے تناظر میں قارئین تک بخوبی پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔حیدر کی شاعری میں روایتی لفظیات اور گھسے پٹے خیالات سے گریز کا جو عمومی رویہ موجود ہے اس پر غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی انفرادیت کو اپنی تہذیبی وثقافتی زندگی کے نئے سانچوں کے پس منظر میں دریافت کیا ہے۔اس حقیقت سے کون واقف نہیں ہے کہ شاعر اپنے ارد گرد موجود اشیا؛ واقعات اور کیفیات کو اپنے تخیلی عمل کے وسیلے سے صورت بخشتا ہے۔موثر شاعری زندگی؛ معاشرتی صورت حال اور شاعر کی انفرادیت تینوں کے اتحادی عمل سے گہرے طور پر متعلق ہوتی ہے۔حیدر قریشی کے شعری مجموعوں سلگتے خواب؛ عمرِ گریزاں؛ محبت کے پھول

اوردعائے دل کا سرسری مطالعہ قارئین کو باور کراتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں اپنے تجربات کی محض عکاسی نہیں کی۔ان کی تخلیقی ترجمانی کی ہے انہوں نے نقالی محض سے گریز کیا ہے۔شعری اظہار میں نقالی محض کا عمل ایک جزو کی حیثیت تو رکھتا ہے لیکن کل میں اور بہت سے لوازمات شامل ہوتے ہیں۔جزوکل سے بڑا نہیں ہوتا کل کا حصہ ہوتا ہے۔نقالی اور ترجمانی اظہار کے اجزا ضرور ہیں،مکمل اظہار نہیں ہیں۔اظہار اور ترجمانی کا اختلاف قاری اور شاعر کو خانوں میں بانٹنے سے جنم لیتا ہے شاعر اور قاری میں دوئی کی ناقابل عبور خلیج حائل نہیں ہونی چاہیے۔شاعر بیک لمحہ قاری بھی ہوتا ہے اور شاعر بھی۔وہ ایک ثابت وسالم شخصیت کا نام ہے۔اسے لخت لخت کر کے دیکھنے سے ہی اظہار اور ترجمانی کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔حیدر قریشی کی غزلیں،نظمیں اور ماہیے ان کے نفسیاتی کرب،موہوم جذبوں اور الجھنوں کے عکاس ہیں۔

ان میں ان کی زندگی کے متنوع پہلو اپنی پوری منطقی بنیادوں سمیت موجود ہیں ۔رحیم یار خاں،لاہور،ایبٹ آباد اور جرمنی میں رہتے ہوئے انہوں اپنے انفرادی اور اجتماعی مسائل کو مخصوص ماحول کے پس منظر میں نمایاں طور پر پیش کیا ہے۔ان کا شعری اظہار خلا میں معلق کسی چیز کا نام نہیں ہے اس کی جڑیں زمین میں پیوست دکھائی دیتی ہیں۔وائٹ ہیڈ نے اس ضمن میں ایک بڑی عمدہ بات لکھی ہے کہ شعری تجربہ، تمام اشیا سے، شاعر کے کلی رشتوں کا مرہون منت ہے۔اظہار اور ترجمانی کی تمیز اس لئے بھی باقی نہیں رہتی کہ یہ ایک نفسیاتی معاملہ ہے۔ایک نظم ایک وقت میں ایک شخص پر جو اثر چھوڑتی ہے وائٹ ہیڈ کے بقول اس نظم کو دوبارہ پڑھنے کے بعد وہی شخص اس سے مختلف تاثر لے سکتا ہے۔سادہ اور مانوس خیالات پر مشتمل نظموں کا معاملہ مختلف ہے۔ان میں تشریحی مغالطّوں کا زیادہ احتمال نہیں ہوتا۔

حیدر قریشی نے ایسی شاعری تخلیق نہیں کی جس میں مدعا عنقا ہوتا دکھائی دیتا ہے اور صرف شاعر یا خالق ہی اپنے تجربے کے معانی کی گہرائیوں کو دریافت کرسکتا ہے۔کسی اور شخص کے لئے اس شاعری کے معانی شاعر کے معانی سے مختلف ہو سکتے ہیں۔اس لئے جب اس قسم کی شاعری کا قاری یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے شاعر کے معانی کو گرفت میں لے لیا ہے تو وہ کسی مغالطے کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے۔قاری ایسی شاعری کو اپنے معانی دیتا ہے۔

اس کا ذاتی رجحانِ طبع اور طرزِ فکر شاعری کو اپنے مخصوص معانی عطا کرسکتا ہے۔حیدر قریشی کی

شاعری اس قسم کے جھنجھٹ سے پاک ہے۔ثریا شہاب کے ساتھ ایک مکالمے میں حیدر قریشی کہتے ہیں:

’’جن لوگوں نے ادب کو حصول مقصد کا ذریعہ بنایا وہ بائیں بازو کے تھے یا دائیں بازو کے تھے۔انہوں نے ادب کی جگہ پمفلٹ پیش کیا۔ہر فنکار کا کوئی نہ کوئی نظریہ یا تصور ضرور ہوتا ہے سو جب اس کا نظریہ اس کے باطن کی آواز بن کر آتا ہے تو اعلیٰ فن پارہ بن جاتا ہے لیکن جب وہ اپنے باطن کی آواز پر دھیان دیئے بغیر خارجی سطح پر اپنے نظریات کا پرچار شروع کرتا ہے تو صرف پروپیگنڈہ ادب کو وجود میں لاتا ہے۔۔۔۔اقبال اور فیض دو انتہاؤں کے نظریات رکھنے والے شاعر تھے لیکن دونوں نے زیادہ تر اپنے باطن کی آواز پر لکھا اس لئے وہ اعلیٰ شاعر تھے۔سو میرے نزدیک تخلیقی عمل کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے۔البتہ اس سے کسی مقصد کی ترجمانی بھی ہوتی ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔اسے ایک مثال سے یوں سمجھ لیں کہ ہوا کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ ہر ذی روح کو اس کی مطلوبہ گیس فراہم کرے۔اگر ہوا سے یہ مقصد بھی حاصل ہو رہا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔یہی معاملہ ادب اور مقصدیت کا ہے۔‘‘

ایسا بھی نہیں ہے کہ شاعر کا تجربہ قاری تک کسی حد تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔اظہار کے عمل میں لفظوں کا وسیلہ شاعر اور قاری کے درمیان مشترک بنیاد مہیا کرتا ہے۔اظہار اکثر رسا تو ہوتا ہے لیکن زرخیز تب ہوتا ہے جب شاعر ترسیل کے عمل میں کسی حد تک اس تجربے کے اسرار کو بھی پیش کر دیتا ہے جس سے اس کی تشکیل ہوئی ہو۔ایسا شعری اظہار ازخودنئی حقیقت بن جاتا ہے۔اس میں شاعر اپنی حقیقت تخلیق کرتا ہے وہ کسی معروضی شے کی نقل نہیں کرتا اور نہ ہی اس کی تصویر بناتا ہے حیدر قریشی کی شاعری میں اظہار اور ترجمانی کو دو علیحدہ علیحدہ خانوں میں تقسیم کرنے کا جھگڑا بے کار نظر آتا ہے۔انہوں انسانی حیات و کائنات کے مختلف حوالوں کو ملانے کا جو کشٹ کھینچا ہے اس پر وہ خود بھی مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں:

’’میں ادب کو مذہب اور سائنس کی طرح الگ،آزاد اور بامعنی سرگرمی سمجھتا ہوں مختلف طریق کار ہونے کے باوجود مذہب اور سائنس کی جستجو کا رخ کائنات کے عظیم تر اسرار کی جانب ہے اور ادب بھی میرے نزدیک اسی کی جستجو سے عبارت ہے البتہ ادب کی جستجو کی نوعیت مجاز کے وسیلے سے جمالیاتی ہے سو کسی ایک صنف کو اپنا خاص شعبہ سمجھنے کی بجائے میں ادب کو اپنا شعبہ سمجھتا ہوں

۔ہاں شاعری کو میں اپنی پہلی محبت مانتا ہوں‘‘۔

(حیدر قریشی سے انٹرویو از ثریا شہاب)

ممتاز حسین نے اپنے مضمون ’’رسالہ در معرفت استعارہ‘‘ میں مابعد اطبیعاتی منطق کی احتجاجی صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’اگر آج آرٹ عہد عتیق کے طلسمات اور اساطیر اور قرون وسطیٰ کی اخلاقیات سے آزاد ہے تو کل وہ باقیات قرون وسطیٰ اور طبقات نظام کی سیاسیات سے بھی آزاد ہوگا۔ یہ ایک عجیب کشمکش ہے لیکن اس کشمکش سے وہ سحر اور وہ آرٹ پیدا ہوں گے جس کا خواب یورپ کے رومانی شعرا نے اپنی تحریک کے عروج کے زمانے میں دیکھا تھا۔ رومانی شعرا نے سرمایہ دارانہ رشتوں کی مخالفت میں ہی شاعری کی ہے۔ انہوں نے اپنے احساسات اور ندائے تخیل سے اس بات کی تصدیق کی کہ انسان ایک ہے۔ وہ ناقابل تقسیم ہے۔ وہ انسان ہے نہ کہ آقا اور غلام، زمیندار اور کسان۔ کامگار اور سرمایہ دار۔ منشی اور کوتوال۔ اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے اس بغاوت کو بہ قوت جذبہ پروان چڑھایا اور عقل کی مخالفت کی۔ لیکن جو چیز سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ انہوں نے سرمایہ دارانہ طبقے کی عقل کے خلاف بغاوت کی۔ نہ کہ انسانی عقل کے خلاف۔ ورنہ ورڈز ورتھ اپنے تخیل کو عقل مرتفع کا نام کیوں دیتا۔ انہوں نے اس عقل کے خلاف بغاوت کی جو اسیر سود وزیاں تھی۔ جو انفرادی تگ ودو یا سماج کی بیہمانہ قدر کو عام کئے ہوئے تھی اور جو احساسات وجذبات کی اطلاعات سے اس لئے کنارہ کش تھی کہ ان کا فیصلہ تاجر کے استحصال کے خلاف تھا‘‘

ممتاز حسین نے رومانوی شاعری کے بطن میں موجود انسان دوستی کا سراغ لگا کر منشور پرست نقادوں اور فنکاروں کو آئینہ دکھایا ہے یعنی کہا ہے: شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

سلطانہ مہر کے ایک سوال کے جواب میں حیدر قریشی نے اپنے ادبی نقطہ نظر کو مزید واضح کیا ہے:

’’اگر ادب ذات اور کائنات کا اظہار ہے تو خود ہی سوچئے کیا یہ کائنات ایٹم کے پارٹیکلز سے لے کر عظیم کہکشاؤں تک کوئی آسان اور عام فہم کائنات ہے؟ اسی طرح دوسروں کی ذات کو چھوڑ دیں ہم میں سے ہر شخص اپنی ذات میں اتنا پیچیدہ ہے کہ زندگی بھر بھی اپنے آپ کو شائد ہی سمجھ پائے۔ اس لیے تو حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ "جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا"۔ لہٰذا مشکل اور پیچیدہ ذات وکائنات کے اظہار کے لیے آسان زبان اور اسلوب کا مطالبہ کچھ مناسب

نہیں لگتا۔ میں فن کے اظہار کے ساتھ اس کے ابلاغ کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں لیکن اگر کسی تخلیقی لمحے میں فنکار کسی ایسی ارفع سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا اظہار، ابلاغ کی عمومی سطح سے بلند ہو جاتا ہے تو میں اس کی عظمت کو بھی مانتا ہوں البتہ جدیدیت کے نام پر اور پی آر شپ کے زور سے جن لوگوں نے جان بوجھ کر ابلاغ کو مشکل بنایا ہے ان کے مصنوعی اظہار سے جو یبوست پھیلی ہے میں اس کی مذمت کرتا ہوں یہ سارے لوگ سرے سے ادیب ہی نہیں ہیں ذرائع ابلاغ پر قبضہ کے باعث اور پی آر شپ کے زور سے جو جعلی ادیب سامنے آئے ہیں ان کی جعل سازی خود بخود ختم ہو جائے گی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے نام نہاد "جدیدیوں" کا جدید ادبی رجحانات سے اور جدید ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے‘‘

اب جب بات جدید ادب کے دائرے میں آ ہی گئی ہے تو یہاں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اگر نئے اور عظیم کی تلاش میں غالب نسخہ حمیدیہ جیسا عظیم مجموعہ تخلیق کرنے کے باوجود یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں:

آتش کدہ ہے سینہ مرا سوزِ نہاں سے　　　اے وائے اگر معرض اظہار میں آوے

انسان، زندگی اور کائنات کے پیچیدہ عمل کو شعر وادب کے دائرے میں سمیٹنے کے لیے جس قسم کے استعاراتی اظہار کی ضرورت ہوتی ہے وہ رواجی دائرہ بیان کے زمرے میں نہیں آتا۔ اس لیے میر جیسا سادہ اور عام فہم شاعر جو ایک مقام پر یہ کہتا ہے کہ

’’شعر میرے ہیں گو خواص پسند۔ گفتگو پر مجھے عوام سے ہے‘‘۔۔۔۔ اچانک چیخ بھی اٹھتا ہے:

رہی نا گفتہ مرے دل میں داستاں میری　　　نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

میر کے استعارے! علامات! رمزیں! کنایئے!! شعر سخن کا پردہ ہو کر ان کا فن بن گیا سو جدید وقدیم کی قضیہ دلیل کم نظری ہے۔ ممتاز حسین نے استعارے کی اہمیت واضع کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’استعارے کی دنیا میں جو مستعار منہ کے اوصاف کو مستعار لہ کے اوصاف میں جمع کر دیا جاتا ہے اور مستعار لہ کا ذکر گرا دیا جاتا ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ مستعار لہ مستعار منہ سے اوصاف حقیقی یا اپنی معنویت میں متحد ہو جاتا ہے۔ لیکن استعارہ مستعار جو ٹھہرا اس میں یہ اتحاد جزوی ہوتا ہے نہ کہ کلی کیونکہ مستعار منہ مستعار لہ سے مماثل ہوتے ہوئے بھی متغائر ہوتا ہے۔ اس لئے اس اتحاد کے باوصف ان میں تخالف بھی موجود رہتا ہے۔ مستعار منہ کے حقیقی معنی کی تردید مستعار لہ کا

حقیقیمعنی کرتا ہے۔اور یہ ان کے اسی اتحاد اور تخالف کا نتیجہ ہے کہ اصل معنی مستعار منہ سے تجاوز کرتا ہے یا جست کرتا ہے جو ایک ترکیبی معنی ہوتا ہے۔ یہ معنی جو حقیقت اور مجاز کے اتحاد و تخالف سے پیدا ہوتا ہے اصل حقیقت کو توسیع دیتا ہے نہ کہ اسے قطعیت کے ساتھ محدود کرتا ہے۔حقیقت خواہ کسی ذرے کی ہو یا انسان کی اپنے حجابات میں لامحدود ہے کیونکہ وہ کائنات کی حقیقت سے بے شمار رشتوں میں مربوط ہے۔کسی بھی حقیقی تجربے کی حرف بہ حرف سچائی کو صرف استعارے ہی کے ذریعے پیش کیا جا سکتا ہے جو اس کو قطعیت کے ساتھ محدود نہیں کرتا بلکہ اس کی لامحدودیت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔استعارہ مستعار منہ سے آگے گزر جاتا ہے۔ یہ حقیقی تجربے کو وسعت دیتا ہے نہ کہ اسے گھیرتا اور متعین کرتا ہے جو کہ ایک منطقی تصور کا کام ہے۔استعارے کا مفہوم کثیر سمتی اور متحرک ہوتا ہے۔استعارہ صرف خیال ہی کو نہیں چھوتا ہے بلکہ خیال کے ساتھ جو جذبات اور احساسات وابستہ ہوتے ہیں ان کی شدت اور گہرائی بھی ابھارتا ہے۔ وہ متحرک اس معنی میں ہے کہ استعارے کا مفہوم اپنی اشاریت کی وجہ سے تخیل کے لئے معنی کی راہیں کھولتا ہے نہ کہ اس کی راہ روک کر بیٹھ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ تو عالم وجود میں اسی لئے آیا تھا کہ اصل حقیقت کے صرف محدود ہی نہیں بلکہ لامحدود پہلوؤں کی طرف اشارہ کرے۔ اشارے کو یقیناً تابناک ہونا چاہئے۔لیکن اس میں وہ ابہام بقول غالب تو رہے ہی گا جس پر تشریح قربان ہوتی ہے۔ کیونکہ حقیقت کا لامحدود پہلو ہمیشہ مبہم ہوتا ہے۔ یہاں مسئلہ حسن معنی کے امکانات پر مرمٹنے کا ہے نہ کہ متعین تصورات میں گھر کے رہ جانے کا۔استعارہ حقیقت کا آئینہ ہوتا ہے۔ نہ کا اس کا پردہ حجاب۔اس کی رمزیت حقیقت کی طرف ایک جنبش نگاہ کے کرنے میں ہے نہ کہ اس کے پردہ خفا کے بننے۔حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھانے ہی کا نام استعارہ ہے۔ جہاں معانی کو براہ راست منکشف کرنے کے لئے ذہن آدم نے اگر اسباب نطق سے کوئی آلہ کار وضع کیا ہے تو وہ استعارہ ہی ہے استعارے کا استعمال بذات خود کوئی مقصد نہیں ہے۔استعارہ تو ذہنی تصویر کا صرف ایک فارم ہے۔مقصد اصل حقیقت تک پہنچا ہے۔نہ کہ استعارے کو روائتی حیثیت سے برتنا ہے۔روائتی استعارے کو برتتے رہنے کی دھن روائتی خیال کو دھراتے رہنے کی دھن بن جاتی ہے۔ ہماری شاعری آخر آخر جو گل و بلبل کے تصورات میں اسیر ہو کر رہ گئی اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہمارے شعرا نے یا تو فارسی زبان کے روائتی استعاروں سے کام لیا یا پھر ان استعاروں کے کلیدی الفاظ مثلاً گل و بلبل، دام و

قفس، مرغ چمن، باد نسیم، جام و مے خانہ وغیرہ کو لغوی معنوں میں اس طرح برتنے لگے جیسے صنعت لفظی میں الفاظ کو الفاظ کی نسبت سے برتا جاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ الفاظ اپنی استعاراتی قوت کھونے لگے۔لیکن جب سے روایت پرستی کا یہ زور کم ہوا اور لفظ نیچرل ہماری تنقید میں داخل ہوا تو نئے استعاروں کے علاوہ پرانے کلیدی الفاظ کی مدد سے نئے استعارے بھی وجود میں آئے ہیں۔ چنانچہ اب ان پرانے الفاظ کے تلازمات ذہنی اور انجمنی نئے ماحول اور نئے خیالات کے مطابق بدلتے جارہے ہیں۔اس میں علامہ اقبال اور دور حاضر کے چند غزل گو شعرا کا بالخصوص بڑا ہاتھ ہے۔تاہم یہ کہنا پڑے گا کہ اس قسم کے تصرفات کے امکانات محدود ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی سے نئی ذہنی تصویریں اور نئے سے نئے استعارے وضع کئے جائیں جن کی تخلیق کے لئے آج سامان مجلسی پچھلے زمانے کے مقابلے میں زیادہ موجود ہیں‘‘

منی پلانٹ

زمین سے جُڑا رہوں
تو تب بھی لہلہاؤں میں
زمیں سے کاٹ کر مجھے
بوتلوں میں پانی بھر کے ڈال دو
تب بھی میں ہرا رہوں
پَر ہی جمانے کی مجھے کہیں جگہ ملے
میں جہاں بھی جا بسوں
وہیں ہرا بھرا رہوں
بلکہ میں جہاں رہوں
نصیب اُس کے جاگ اُٹھیں
میں کوئی خشک شاخ تو نہیں
کسی درخت کی!

منی پلانٹ آرزو برآری، اور تمنا تکمیلی کا عکاس ہے۔لیکن اس کے مقابلے میں درخت کی خشک شاخ آج کی زندگی کا استعارہ ٹھہرتی ہے۔’**محبت کا خدا**‘،’**حاصل**

زندگی'،'عجیب دشمن'،'یہ دل'،'بے فیض موسم کا دکھ'،'ہوا'،'دعا گزیدہ'،'ایک خواہش کی موت'،'سرسوں کا کھیت''۔حیدر قریشی کے قلم سے کیسی کیسی عمدہ نظمیں نکلی ہیں۔ان کی شاعری میں ہوا کا استعارہ اپنی مختلف جہتوں سمیت استعمال ہوا ہے
پھاگن کی یخ بستہ سفاک ہوا،خوشبوئیں جذب کرتی ہوا،بگولے بنتی آریائی ہوا'شُوکتی' پھنکارتی ناگن ہوا،ڈائن بنتی برہم ہوا وغیرہ۔شاعر کو ہوا کی افادیت کا بھی احساس ہے!

جہاں بھی زندگی ہے
اس ہوا کی حکمرانی ہے
ہوا نہ ہو اگر تو زندگی معدوم ہو جائے
نہ پھر یہ دل کے دریا ہوں کہ جن میں
روٹھنے والے
مسافت کو ادھورا چھوڑ کر
خود آن بستے ہیں
جہاں ان کی حسیں یادوں کے سب منظر مہکتے ہیں!

حیدر قریشی نے صنف نظم کو اپنے مربوط تاثرات کی ترسیل کے لیے استعمال کیا ہے۔ریزہ کاری اور اختصار اظہاری کے لیے انہوں نے غزل اور ماہیے کی اصناف کا سہارا لیا ہے۔ان اصناف میں ان کا فنی اظہار بھی تاثیر کا حامل ہے۔انہوں نے شاعری کی ان اصناف کے تمام لفظی ومعنوی اور خارجی وداخلی لوازم کی پاسداری کی ہے۔

خارجی دنیا کے وسیع موضوعات اور تجربات کو اختصار سے قلم بند کرنا بھی دنیا کے اہم شاعروں کا قابل توجہ وتیرہ رہا ہے۔غزل کے ایک شعر یا ماہیے کے تین مصرعوں میں کسی گہرے تاثر کی تزئین و تجسیم کرنا اور اسے ایک خود مکتفی حقیقت میں ڈھالنا آسان کام نہیں ہے۔خانوں میں بٹا ریزہ کارانہ اظہار بھی داخلی وحدت کا تقاضا کرتا ہے۔اس میں در آنے والے فالتو لفظ یا صوت کا احساس بہت شدت سے ہوتا ہے۔غزل کا ایک شعر یا مکمل ماہیا کسی غیر فنی خارجی عنصر کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔خیال اور مجموعی تاثر کے درہم برہم ہونے کا احساس شاعر کے سر پر تلوار کی

طرح لٹکتا رہتا ہے۔اچھا شعر اور ماہیا بے جا تفصیل اور شتر گربگی سے پاک ہوتا ہے۔غزل کے بڑے شاعروں مثلاً میر اور غالب نے غزل کو اپنے انفرادی تجربے کے اظہار کا اہم ذریعہ بنایا انہوں نے اس کے وسیلے سے اپنے مخصوص آہنگ اور انداز بیان کو فروغ دیا۔شاعری میں مخصوص آہنگ تجربے کی نوعیت وحیثیت سے متشکل ہوتا ہے۔حیدر قریشی کی غزلوں اور ماہیوں میں استعمال ہونے والی زبان فعالیت کا پرتو لیے ہوئے ہے۔ان کی نظموں کی لسانی ساخت غزلوں اور ماہیوں میں استعمال ہونے والی زبان سے خاصی الگ ہے۔

حیدر قریشی نے اپنے تجربات کی نوعیّتوں کی مناسبت سے اظہار و بیان کے سانچے منتخب کیے ہیں۔شاعر اپنے لسانی اور فنی اظہار کے دوران اپنے تجربے کی تخلیق نو کے عمل سے گزرتا ہے۔غزل،نظم یا ماہیے کی وحدتیں شاعر کے خیال کی نوعیت وحیثیت کے مطابق بروئے کار آ کر مناسب ترتیب و تنظیم میں ڈھلتی ہیں۔اکثر صورتوں میں یہ شاعر کے ذہن میں متشکل تجربے کی مرہون منت ہوتی ہیں۔حیدر قریشی نے اپنے تجربوں کی لسانی تنظیم کے لیے مناسب ہیئتوں کا انتخاب کیا ہے۔

اپنی علامتوں،استعاروں،تشبیہوں اور تمثالوں کی زندہ اور متحرک تزئین وتشکیل کے عمل نے انہیں ایسے معاصر شعرا کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جنہوں نے اپنے وسیع انفرادی،سماجی،علمی،فکری تجربوں کو لفظوں کے حسیاتی وصوتیاتی کوائف کی مدد سے صفحہ قرطاس کی زینت بنایا ہے۔

بسا اوقات ان کے ہاں جنگل،کنواں،صحرا اور سمندر جیسے عمومی الفاظ تلمیحوں اور اسطوروں کی گہرائیوں کے عکاس بن جاتے ہیں۔یعنی جنگل رام چندر جی،کنواں سے حضرت یوسف،صحرا حضرت اسماعیل اور حضرت امام حسین اور سمندر حضرت یونس کے واقعات کی طرف اشارے کرتے نظر آتے ہیں۔

عجیب کرب و بلا کی ہے رات آنکھوں میں — سسکتی پیاس لبوں پر فرات آنکھوں میں
مرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے — یہ میری آنکھوں میں،کس رُت میں کیسے خواب لگے
نہ پُورا سوچ سکوں،چھو سکوں،نہ پڑھ پاؤں — کبھی وہ چاند،کبھی گُل،کبھی کتاب لگے
خلاف دنیا کی کیا کیا گواہیاں نہ گئیں — گناہِ عشق کی پر بے گناہیاں نہ گئیں
فقیر بن گئے تیری محبتوں کے اسیر — مگر مزاج کی وہ بادشاہیاں نہ گئیں
اپنی کچھ نیکیاں لکھنے کے لئے بھی حیدر — اپنے ناکردہ گناہوں سے سیاہی مانگوں

روشنی روشنی سی ہر سُو ہے   یہ ترا دھیان ہے کہ خود تو ہے

مِری سچائی، میری بے گناہی سب پہ ظاہر ہے
کہ اب جنگل، کنویں، صحرا، سمندر بول اُٹھتے ہیں

غزل کے شاعر متنوع کیفیات کو محسوس اور بیان کرنے میں خاصی مہارت پیدا کر لیتے ہیں۔حیدر قریشی کی غزل میں بھی ان کوائف کا احساس ہوسکتا ہے۔بے سبب ہنسنا، دلگیر ہونا، دو دلوں کا نہ مل سکنا، ہجر، خراماں خوشبو سے فاصلے محسوس کرنا، محبوب کا بخل، صوفی، سادھو بننے کا خیال، عشق کا بھید نہ پاسکنا، لامکاں کا مکین کو ڈھونڈتا، مذہبی عقیدتوں کا بیان، انہونیاں ہونا غرض حیدر قریشی نے اپنی غزلوں میں بہت کچھ سمو دیا ہے۔

کہیں آئینوں سے ٹکراتے پتھر بدن اپنے خون میں ڈوبے دکھائی دیتے ہیں، کہیں کوئی بے خواب راستوں میں مسافروں کے بارے میں استفسار کرتا ہے۔تشنگی میں ڈوبے لوگ دیکھتے رہتے ہیں اور ٹھنڈی ہوا سے کھیلتے بادل بادل گزر جاتے ہیں۔کبھی کعبے میں جانے یا پتھر تراش کر خدا کو تلاش کا خیال آتا ہے، کبھی اُداسیاں کسی کی چاہت پر غیر واجب الادا قرض کی صورت نظر آتی ہیں۔اس امر کا احساس بھی ہوتا ہے کہ اب ایڑیوں سے کوئی چشمہ نہیں ابلے گا نہ کسی کی قسمت میں کوئی بیتِ ایل ہے۔حیدر قریشی کی غزلوں میں دریا کی لہروں پر، یا صحرا کے سینے میں محبت کا نیا قصہ تشکیل ہونے کی بشارت بھی ملتی ہے۔کہیں دیا بجھا کر فیصلہ کرنا کربلائی علامت بن جاتا ہے۔عشق میں پیہم فریب کھانا یقین کی ایک دولت کی صورت شاعر کے لیے باعث تسکین ٹھہرتا ہے۔حیدر قریشی نے موت وحیات کے حساس موضوع کے حوالے سے عمدہ اشعار لکھے ہیں وہ موت سے بار بار آنکھیں چار کر کے اس کی آنکھوں میں زندگی بھرنا چاہتے ہیں۔زندگی سے مخاطب ہو کر فخر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: زندگی! دیکھ بجھتے ہوئے لوگ ہم   بزمِ جاں میں رات بھر چمکتے رہے

حیدر قریشی کہتے ہیں کہ موت کسی وقت بھی آسکتی انسان کا اسپ جاں پر زین کس کے رکھنی چاہیے

موت کی بھی حقیقت اُنہیں سے کھُلی   زندگی کے جو دل میں دھڑکتے رہے

میری دھرتی سے پرے، کوئی بلاتا ہے مجھے   کہکشاؤں کی عجب راہ دکھاتا ہے مجھے

موت آئی ہوئی ہے مجھے لینے کے لئے اور   یہ زندگی پاس اپنے ہی رکھنے پہ اَڑی ہے

ہے زندگی و موت میں اک معرکہ برپا   جیتے کوئی، ہم پہ یہی اک رات کڑی ہے

شاعر کے خیال میں موت کے سفر کی تیاری انسان پر لازم ہے لیکن اس کے لیے پہلے زندگی کے معاملات کو سنبھالنے کا کٹھن کام بھی انسان کے ذمے ہے۔موت کا خوف برحق مگر زندگی کی ناپائیداری کا خیال کر کے بھی انسان نے صدق دل سے کمر ہمت باندھ کر انسانیت کو بہت کچھ دیا ہے۔زندگی کا نیا ڈھب نکالنے کے لیے گھڑی بھر میں ہزار بار مرنے والے زندگی کے لیے عمدہ کام کر جاتے ہیں۔حیدر قریشی کی غزلوں اور نظموں دونوں میں موت کے موضوع پر عمدہ خامہ فرسائی ملتی ہے۔زندگی کے مختلف رنگ دیکھنے کے لیے حیدر قریشی کے یہ عمدہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں

یہ ساری روشنی حیدؔر ہے ماں کے چہرے کی   کہاں ہے شمس وقمر میں جو نُور خاک میں ہے

اس میں مل جائے گا جا کر مرے اندر کا خلا   اور بڑھ جائے گا باہر کا خلا میرے بعد

جورِ اہلِ ملامت پہ چلا جاتا ہو   مت الجھنا کبھی ایسے کسی سودائی سے

مرحلے آئے تھے خوف اور گنہ کے پہلے   روشنی گیان کی پھر پھُوٹی تھی تنہائی سے

شہرِ جاں کی دیکھ کر یخ بستگی   خواہشیں تک ہم جلانے لگ گئے

رنگ سارے نظر کا تھے جادو   اور سب ذائقے زباں کے تھے

داستاں گو کی ذات سے اُبھرے   جتنے کردار داستاں کے تھے

آج تو کھُل کے ہنس دیئے حیدؔر   دل کے زخموں کے جتنے ٹانکے تھے

برف، بادل، ندی، سمندر، اَشک   پانی بھی کتنے روپ دھارتا ہے

اگلی نسلوں میں چلی جائے روانی اپنی   زندگی! ختم نہیں ہوگی کہانی اپنی

روشنی کا استعارہ کرلیا   دل نے ہر آنسو ستارا کرلیا

واقفیت ہے اِن سے اپنی برسوں کی   دُکھ تو ہمارے ملنے جلنے والے ہیں

آنکھیں اس کی بھی ہیں اب برسات بھری   حیدؔر مَیل دِلوں کے دُھلنے والے ہیں

تم نے وہ منظر ہی کب دیکھے ہیں، جب   درد سمندر، دل دریا میں گرتے ہیں

یا آنکھوں میں خاک برستی تھی حیدؔر   یا اب پیہم اَشک دُعا میں گرتے ہیں

حیدر قریشی کے ماہیے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے جہاں ایک طرف اپنے ارد گرد کی زندگی کو ایک مفکر کی آنکھ سے دیکھا ہے وہاں دوسری طرف انسان کی عمومی خوشیوں، یادوں، سوگواریوں، غموں، آنسوں، امیدوں، حسن

پرستیوں، شاہد وستیوں، آنسوؤں، قہقہوں، ستم
ظریفیوں، بیوقوفیوں، تنہائیوں، حضوریوں، مہجوریوں اور دوریوں کا پر تاثیر انداز سے جائزہ لیا
ہے۔ اکبر حمیدی لکھتے ہیں

’’شاید حسن پرستی اور عشق بازی کا یہی جذبہ ہے جس نے اسے "ماہیا" جیسی صنف کا عاشق بنا دیا
اور اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ ماہیا ماہیا کر دی نی میں آپو ماہیا ہوئی۔ اردو ادب میں ماہیا تحریک
خالصتاً حیدر قریشی کا کارنامہ ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی قابل ذکر رسالہ ہوگا جس میں اب ماہیا شائع
نہیں ہو رہا ہوگا۔ اس پر پی ایچ ڈی کرنے کی خبریں بھی آرہی ہیں اور بھارت کے رسالے "
گلبن" نے تو ماہیا نمبر بھی شائع کیا ہے۔ خود حیدر قریشی نے ماہیا صنف پر پوری کتاب شائع کر
وائی ہے۔ عشق تو ایک بے پناہ جذبے کا نام ہے جو انسان سے ہو یا فن سے یا کسی دوسرے نصب
العین سے، حیدر قریشی نے اپنی اس قوت کا رخ تخلیقی ادب کی طرف موڑ دیا ہے تاہم اس منہ زور
جذبے کا رخ تبدیل کرنے کے لئے بھی بے پناہ قوت ارادی کی ضرورت ہوتی ہے۔‘‘

حیدر قریشی نے اپنی مذہبی عقیدتوں کو بھی ماہیوں کی زینت بنایا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے
حضرت علیؑ کے بعض فرمودات سے اکتساب بھی کیا ہے۔ ان کے انسان اصلاحی کے ضمن میں لکھے
گئے ماہیے بھی بہت موثر ہیں وہ چاہتے ہیں کہ انسان کا دل شہر مدینہ ہو جائے کہ یوں نورِ محبت سے
ہر سینہ روشن ہوسکتا ہے۔ ان کے خیال میں انسان کو ایسے خاک نشینوں کی تلاش ہونی چاہیے جن
کے ماتھے اور دل نور کے خزینے ہیں۔ سورج ان کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں اور ستاروں کے
اَسرار ان کی باتوں میں۔ اگرچہ وہ خاک پہ رہتے ہیں لیکن فی الحقیقت افلاک پہ رہتے ہیں۔

حیدر قریشی کے مندرجہ ذیل ماہیے ان کے شعری شعور کی وضاحت کرتے نظر آتے ہیں

یہ بھید نہ کھل پائے
دل بھر آنے پر
کیوں آنکھ بھی بھر آئے

رہ جاتی ہیں تعبیریں
خواب ہیں ہم شاید

اور اصل ہیں تصویریں

رائن سے چناب مِلا
کوئی حقیقت تھی
یا خواب سے خواب مِلا

دل کو شاداب کیا
تیری محبت کے
غم سے سیراب کیا

پھولوں کو پرونے میں
سوئی تو چبھنی تھی
اس ہار کے ہونے میں

کیسے اِترائے تھے
پہلے پہل دل پر
جب زخم سجائے تھے

اس درد خزانے کے
چل دو نفل ہی پڑھ
رب کے شکرانے کے

حضرت علیؑ کے بعض فرمودات سے اکتساب

اللہ کو جان لیا

جس نے بھی اپنے
من کو پہچان لیا
(من عرف نفسہ فقد عرف ربہ)

اب سمجھ میں آیا ہے
علم کے نقطے کو
جہلا نے بڑھایا ہے
(علم ایک نقطہ تھا جسے جاھلوں نے بڑھا دیا ھے)

دنیا میں خراب ہوا
محبوب اور محبّ
میں عشق حجاب ہوا
(المحبتہ حجاب بین المحب والمحبوب)

(توحید کا بھید)

وہ شخص ہی جاہل ہے
جو توحیدِ خدا
کے بارے میں سائل ہے

اپنے ماہیوں کے حوالے سے حیدر قریشی کا کہنا ہے:

''۱۹۹۰ء میں میں اکیلا پنجابی ماہیے کے وزن کے مطابق اردو میں ماہیے لکھ رہا تھا اور آج چھ سال کے مختصر سے عرصہ میں درست وزن کو اپنانے والے ماہیا نگاروں کی تعداد (تادم انٹرویو) ۴۸ ہو چکی ہے میرے ماہیوں کا مجموعہ "محبت کے پھول" چھپ چکا ہے بھارت سے گیارہ اہم ماہیا نگاروں کا ایک اہم انتخاب بھی آ گیا ہے صوبہ کرناٹک کا ایک روزنامہ اپنے ادبی صفحہ کا ماہیا نمبر چھاپ رہا ہے۔اگلے برس دو ماہیا نگاروں کے ماہیوں کے مجموعے آ رہے ہیں، میری تحقیق اور تنقید کی یک مو ضوعی کتاب "اردو میں ماہیا نگاری" بھی اگلے برس چھپ کر آ رہی ہے۔پاکستان اور بھارت کے بعض ادبی رسائل نے ماہیا نمبر چھاپنے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ بھارت کی ایک یونیورسٹی میں ماہیے کے موضوع پر پی ایچ ڈی لیول کا کام شروع ہونے کی خبر بھی ملی ہے سو یہ خوش کن صورتحال

ہے۔''

حیدر قریشی نے اپنے اشعار،فکشن اور خاکوں میں نئی حقیقتوں کی آئینہ سازی کے لیے نئے استعاروں اور تمثالوں کو برتنے کا شعوری اہتمام کیا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں اور خاکوں میں اپنے خیالات سے منسلک جذبات اور احساسات کو شدت اور گہرائی سے ابھارا ہے۔حیدر قریشی کو مکمل احساس ہے کہ نیا ادبی تناظر استعاراتی اور علامتی اسلوب سے متعین ہوتا ہے۔جوگندر پال کے ساتھ ایک ریڈیائی مکالمہ میں ان کا کہنا ہے:''جدید افسانے کا جو تجربہ پاکستان میں ہوا وہ تقریباً ۱۹۶۰ء میں انتظار حسین سے شروع ہوا۔انتظار حسین، خالدہ حسین اور انور سجاد نے اپنے اپنے ڈھنگ سے لکھا۔لیکن ایک مقام ایسا آیا کہ جہاں کہانی پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگا کہ میرے ساتھ شاید کوئی دھوکہ ہو رہا ہے یا یہ کہ کہانی اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی چلی گئی اور کچھ یہ بھی تھا کہ کہانی پن جدید افسانے سے غائب ہوتا چلا گیا۔میں سمجھتا ہوں اب ہمارے افسانہ نگار ایک خاص ڈھب سے کہانی کو واپس لا رہے ہیں افسانے میں---لیکن کوئی پلاننگ کر کے نہیں---جیسے انتظار کے ہاں ہے کہ وہ ایک طرف دیو مالا سے استفادہ کرتے ہیں دوسری طرف کافکا کے اسٹائل کو اپناتے ہیں اور یوں اپنا افسانہ بنا لیتے ہیں---تو ان لوگوں نے اس طرح کی کوئی پلاننگ نہیں کی بلکہ تخلیقی انداز سے اپنے آپ کو دریافت کرتے ہوئے افسانہ لکھا ہے''

سو کہانی چاہے نانی اماں سنائے یا کسی داستان میں کوئی شہزادی پہیلیوں کی صورت میں اجاگر کرے۔کائنات کی تجرید کہانی بن کر سامنے آئے! کہانی تو کہانی ہے! تجرید اور تجسیم کا مرکب کہیں تجسیم زیادہ ہے کہیں تجرید۔کہیں مکمل تجسیم تو کہیں مکمل تجرید! ہر استعاراتی افسانہ متحرک ہے اس کی مفاہیمی اشاریت تخیل کے نئے در کھولتی ہے۔حیدر قریشی کے فکشن کو دور جدید کے اہم نقادوں نے سراہا ہے۔ اس حوالے سے قابل قدر مضامین لکھے گئے ہیں"(''حیدر قریشی کی افسانہ نگاری''از پروفیسر جیلانی کامران۔۔''روشنی کی بشارت کے افسانے''از جوگندر پال''۔۔۔روشنی کے شیشا گھر میں''از دیوندر اسر۔۔۔''افسانے'' از قیصر تمکین۔۔۔''افسانے۔روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں''از ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی۔۔۔''افسانے۔''روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں''از بیگم وسیم راشد''۔۔۔۔حیدر قریشی کے افسانے''از انجلا ہمیش)

سب نقادوں کی متفقہ رائے ہے کہ حیدر قریشی کے افسانوں میں در آنے والے استعارے معانی

کے راستے کا پتھر نہیں ہیں۔ وہ قاری کا رستہ نہیں روکتے۔ جیلانی کامران کے بقول نیا افسانہ نیا آسرا
انسان اور بے آباد زمین کی روداد بیان کرتا ہے۔ حیدر قریشی کے افسانوں کا تناظر بھی یہی
ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کے انسان کو درپیش بعض
فکری، مابعدالطبیعاتی، سماجی، اخلاقی اور سیاسی مسائل کا خوش اسلوبی سے احاطہ کیا ہے۔ان کی
علامتیں حقیقت کے توسیعی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ان میں در آنے والے اشارے
روشن اور تابناک ہیں۔ جیلانی کامران نے اس کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے''افسانے کی اس
دنیا میں جسے حیدر قریشی نے دریافت کیا ہے۔ روشنی کی کرن ایک ایسا استعارہ ہے جسے ملحوظ رکھنا
ضروری ہے۔ روشنی کی کرن رات کے پچھلے پہر ظاہر ہوتی ہے۔ کبھی اس کے ساتھ انسانی شعور کے
وہ رشتے آشکار ہوتے ہیں جن کی ترتیب آسمانی نشانات نے کی ہے۔ اور کبھی یہ کرن امید بن کر
گلاب کے پودے کی صورت اختیار کرتی ہے اور کبھی محبت بن کر دل میں ظہور کرتی ہے۔ یہ کرن
کشف اور رویا بن کر دل کا خوف دور کرتی ہے اور سفید پرندوں کو اپنے پاس بلاتے ہوئے انسانوں
کو وحدت کی دعوت دیتی ہے۔''

ان افسانوں میں استعارے کا وہ ابہام غالب ہے جس پر تشریح قربان ہے۔ استعارے حقیقت
کے لامحدودہ مبہم پہلوؤں کو گرفت میں لیتے ہیں وہ حسنِ معنی کے امکانات کی نشاندہی کرتے
ہیں۔ کہانی کی سادہ صورت پر مر مٹنے والے متعین تصورات میں گھر کے رہ جاتے ہیں۔

جوگندر پال رقمطراز ہیں''حیدر قریشی اسی وسیع تر زندگی کی دریافت کے لئے اپنی کہانیاں تخلیقتا
ہے۔ اپنے اس کھلے کھلے راستے کو طے کرکے اسے دور یا نزدیک کسی شیشے کے محل میں اقامت نہیں
اختیار کرنا ہے، بلکہ راستوں سے راستوں تک پہنچنا ہے اور ہر راستے پر تباہ حال زندگی کی باز آباد
کاری کئے جانا ہے۔''

حیدر قریشی کے افسانے استعاروں کے لبادے میں ملفوف حقیقت کے آئینے ہیں۔ وہ اس کا پردہء
حجاب نہیں بنے۔ انہوں نے حقیقتوں کے رخ سے با اہتمام پردے اٹھائے ہیں۔ معانی کے سلسلہ
ہائے دراز کو براہ راست منکشف کیا ہے۔ ان کے لیے استعارے حقیقت اظہاری کا وسیلہ رہے
ہیں۔ دیوندر اسر کہتے ہیں:''روشنی کی کرن ان کی کہانیوں کی مرکزی علامت ہے جس کے پرت در
پرت کھلنے سے ان کا ضمیر اور کُل کائنات نورانی خزانہ بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے یہ تلاش باہر کے آدمی

کو بھیتر کی دنیا میں لے جاتی ہے، جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام، نہ کوئی کنارا، نہ حد اور نہ طول و
عرض! بس خلا ہی خلا ہے، سپیس ہی سپیس ہے، وقت ہی وقت ہے۔''

ایسے میں حیدر قریشی کے لیے روائتی استعارے برتنا ممکن نہ تھا۔ وہ روائتی خیال دہرانے سے
گریزاں رہے ہیں۔ روایت پرستی سے کنارہ کش ادیب ہی روایتی لفظوں میں نئی جان ڈالنے کا
کام کرسکتے ہیں۔ ان میں نئی علامتیں بنانے کی تخلیقی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ حیدر قریشی کو اپنے
عہد کے موضوعات سے انصاف کرنے کے لیے نئی علامت سازی اور تلازمہ کاری کی ضرورت کا
مکمل احساس ہے وہ نئی تصویریں اور نئی تمثالیں وضع کرنے کے دانشورانہ کام کی اہمیت سے نابلد
نہیں ہیں۔ اپنی موافقت اور مخالفت میں لکھی جانے والی تحریروں کو یک جا چھاپنے کی اجازت
دے کر حیدر قریشی نے اعلیٰ ظرفی کے سرخاب کا خون نہیں ہونے دیا۔

حیدر قریشی کا باطن فی الحقیقت سوزِ رواں کے ایک ایسے آتش کدے سے معمور ہے جس نے معرضِ
اظہار میں آنے ہی میں عافیت جانی۔ بسا اوقات سّرِ نہانی کا جامہء اظہار میں رونق افروز نہ ہوسکنا
بھی کوتاہیِ فن کی دلیل بن جاتا ہے۔

میں نذر خلیق صاحب کو''حیدر قریشی کی ادبی خدمات'' کتاب ترتیب دینے پر مبارک باد پیش کرتا
ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس سے نہ صرف حیدر قریشی کی ادبی خدمات کو بہتر طور پر سمجھا سکے گا بلکہ
اس سے ان کے فن کی تفہیم کی نئی راہیں سامنے آئیں گی۔

میرے ہاتھ پر قسمت کی لکیر' دماغ کی لکیر سے ٹکرا کر رُک گئی ہے۔ میں جب کسی بات پر اڑ گیا تو
بڑے سے بڑے فائدے کو بھی نظر انداز کر دیا اور یوں کئی بار اپنا نقصان کیا۔ دوسری طرف میری
بیوی مبارکہ کے ہاتھ پر قسمت کی لکیر بہت واضح' صاف اور روشن ہے۔ سو میری خوش قسمتی دراصل
میری بیوی کی مرہونِ منّت ہے۔ اسی طرح میرے ہاتھ پر شہرت کی لکیر نہیں ہے۔ اس کے باوجود
اگر محبت کرنے والے چند دوست اچھے لفظوں میں اور مجھ سے برہم احباب مجھے ملامت کرکے
بھی یاد کرلیتے ہیں تو اس تھوڑی سی''شہرت'' کا سبب اباجی کے دو خواب ہیں۔
(حیدر قریشی کی **کھٹی میٹھی یادیں** کے باب **دعائیں** اور **قسمت** سے)

حیدرقریشی کی ادبی خدمات

نذر خلیق

۱۹۷۰ء کے بعد ابھرنے والے اردو ادب کے لکھنے والوں میں حیدر قریشی بے حد اہم نام ہے۔ان کی ادبی کارکردگی نہ صرف مختلف الجہات ہے بلکہ ہر جہت میں ان کی تخلیقی قوت،اور ادبی بصیرت یکساں طور پر کارفرما دکھائی دیتی ہے۔

''حیدر قریشی کی ادبی خدمات'' کا پیش لفظ لکھنے لگا ہوں تو مجھے ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید اور انشائیہ نگاری پر لکھے ہوئے ڈاکٹر انور سدید کے دو مضامین کے دو اہم اقتباس شدت سے یاد آرہے ہیں۔مگر ان اقتباسات کا حوالہ آخر میں۔۔۔پہلے یہاں حیدر قریشی کے بارے میں اپنے اس آرٹیکل کو شامل کر رہا ہوں جو حیدر قریشی کے مجموعی ادبی کام پر مشتمل ویب سائٹ www.haiderqureshi.com میں بطور تعارف شامل ہے۔

ادبی تعارف

پروفیسر نذر خلیق
(شعبہ اردو۔گورنمنٹ کالج خانپور)

حیدر قریشی عصرِ حاضر کے ایک اہم شاعر اور ادیب ہیں۔ان کے تخلیقی اظہار کی کئی جہات ہیں۔ایک کثیر الجہت ادیب ہو کر حیدر قریشی نے مختلف اصنافِ ادب میں اپنی ذات کا عکس دیکھا اور دکھایا ہے۔شاعر کی حیثیت سے غزل،نظم اور ماہیا ان کے اظہار کے پیمانے ہیں۔اردو ماہیا میں

حیدر قریشی کو جو تاریخی مقام اور حیثیت حاصل ہے اس کے بارے اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔

ان کی غزل اور نظم کا اپنا ایک الگ ذائقہ ہے۔نئے افسانے کے باب میں حیدر قریشی نے نہ تو لکیر کے فقیر کا کردار ادا کیا ہے اور نہ ہی ''جدیدیت'' کی رو میں بہہ گئے ہیں۔خاکہ نگاری میں حیدر قریشی کی ایک الگ پہچان ہے۔ابھی تک خاکہ نگاری کا رویہ بڑی اور عظیم شخصیات تک محدود تھا۔بعض ادبا نے عام انسانی کرداروں کی عظمت پر اکا دکا خاکے لکھے۔حیدر قریشی نے اپنے قریبی عزیزوں کے خاکے لکھ کر زندگی کے ان کرداروں سے ہمیں آشنا کیا ہے جو دراصل ہم سب کے آس پاس موجود ہیں لیکن جن کی اہمیت کو کبھی ہم نے محسوس نہیں کیا۔انشائیہ نگاری میں حیدر قریشی کا کام بہت زیادہ نہیں لیکن ان کے تھوڑے سے انشائیے بھی ان کی انفرادیت کے مظہر ہیں۔حیدر قریشی کی ''کھٹی میٹھی یادیں'' دراصل ان کی خاکہ نگاری ہی کی توسیع ہیں۔حیدر قریشی کا سفر نامہ ''سوئے حجاز'' ان کا عمرہ کا سفر نامہ ہے۔اس کے بارے میں اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ معتقدات سے ہٹ کر ادبی رنگ میں جو سفر نامہ حیدر قریشی نے لکھا ہے،ابھی تک ارضِ حجاز کے حوالے سے کسی اور کا اس انداز کا سفر نامہ سامنے نہیں آیا۔حیدر قریشی نے تنقید و تحقیق کے شعبہ میں ماہیے کے حوالے سے تاریخی نوعیت کا کام کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے ملے جلے مضامین کو تاثراتی تنقید کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ان مضامین سے حیدر قریشی کے ادبی رویوں اور اندازِ نظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔حیدر قریشی سے بعض ادباء نے انٹرویوز بھی لئے ہیں۔ریڈیو،اخبار،رسالے یا کسی کتاب کے لئے دیئے گئے ان انٹرویوز سے نہ صرف ادب کے بارے میں حیدر قریشی کے خیالات کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے بلکہ ان سے حیدر قریشی کے فن کی تفہیم میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ایک انٹرنیٹ انٹرویو میں حیدر قریشی سے ان کے فن اور شناخت کے حوالے سے جو سوال کیا گیا اور حیدر قریشی نے جو جواب دیا وہ اس تعارف میں پیش ہے:

''**سوال**: آپ نے غزل بھی کہی،نظم بھی۔افسانہ بھی لکھا،انشائیہ اور خاکہ بھی۔تحقیق بھی کی اور تنقید بھی اور ان سب پر مستزاد کہ ماہیے پر تخلیقی،تنقیدی اور تحقیقی تینوں سطح پر کام کیا۔اتنی اصناف میں آپ اپنی شناخت کیسے سمجھتے ہیں؟

جواب: میرا خیال ہے کہ میری شناخت اگر کبھی بنے گی تو میرے سارے کام کے تناظر میں بنے

گی۔ایک بات واضح کردوں کہ اگرکوئی کمزورتخلیق کارکئی اصناف میں کام کرے گا تو اس کا ضعف بڑھے گا لیکن اگرکوئی اچھا تخلیق کار کئی اصناف میں اظہار کرے گا تو اس کا ایک کم ازکم معیار ہر صنف میں دکھائی دے گا۔میں ریا کاری کی انکساری سے کام نہیں لوں گا۔مجھے اتنا علم ہے کہ اگر آنے والے وقت میں ادب کی کوئی اہمیت اورقدر و قیمت رہی تو میرے کام کے بارے میں‘میری ادبی شناخت کے بارے میں آنے والا وقت ہی فیصلہ کرے گا۔وہ وقت جس میں ‘۔۔۔میں‘۔۔۔آپ‘۔۔۔میرے موجودہ مخالفین ۔۔۔اور موجودہ دوستوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں ہوگا۔تب جو بھی فیصلہ ہوگا درست فیصلہ ہوگا!‘‘

بے شک حیدرقریشی کے بارے میں اصل فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا لیکن فی الوقت بھی حیدرقریشی کے فن کو خراجِ تحسین پیش کرنے والوں میں اوران کی ادبی خدمات کا اعتراف کرنے والوں میں اردو کے متعدد نامور شعراء‘ادباء‘ناقدین اور محققین شامل ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا‘ کالی داس گپتا رِضا‘ پروفیسر جیلانی کامران‘ جوگندر پال‘ ڈاکٹر انور سدید‘ دیوندر اِسّر‘ مظہر امام‘ ڈاکٹر صابر آفاقی‘ میرزا ادیب‘ اکبر حمیدی‘ علامہ شارق جمال‘ مجروح سلطانپوری‘ ضمیر جعفری‘ ڈاکٹر فہیم اعظمی‘ ناصر عباس نیّر‘ ڈاکٹر ذکاء الدین شایاں‘ ڈاکٹر قمر رئیس‘ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی‘ نذیر فتح پوری‘ رؤف خیر اور متعدد دیگر اہم نام ہیں جن کے مضامین یا تاثرات اسی ویب سائٹ کے ایک الگ سیکشن میں شامل کئے جا رہے ہیں۔ایسے اہم ادباء کے تاثرات سے آنے والے وقت میں حیدرقریشی کے بارے میں ہونے والے فیصلے کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

اب کچھ ذاتی حوالے سے

اس تعارف کے ساتھ مجھے یہاں حیدرقریشی کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں بھی کچھ بیان کرنا ہے۔خانپور میں وہ میرا اسکول کا زمانہ تھا اور حیدرقریشی دسویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد مقامی شوگر ملز میں ملازمت شروع کر چکے تھے۔دورانِ ملازمت انہوں نے پرائیویٹ طور پر حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا اور تب ایم اے اردو کی تیاری کر رہے تھے۔یہ ۱۹۷۴ء کے اواخر یا ۱۹۷۵ء کے اوائل کی بات ہے۔ایم اے اردو لکھنے سے مجھے محسوس ہوا ہے کہ حیدرقریشی کی

اُن دنوں میں سٹڈی کا انداز ایسا تھا کہ مجھ پر بھی ایم اے اردو کرنے کی دھن سوار ہوگئی۔تب وہ اپنے زیرِ مطالعہ کتب پر گفتگو کرتے، گویا انہیں اسی بہانے یاد کرتے۔علامہ اقبال پر انہوں نے خصوصی تیاری کی تھی اوران کے فلسفۂ خودی پر گفتگو کرنے کے لئے خانپور کے احباب ان کے لئے ناکافی تھے تب ان کی حالت ایسے ہوتی تھی جیسے اتنا بڑا علم کا خزانہ ان سے سنبھالا نہیں جا رہا اور کوئی ان کے ساتھ مل کر اسے بانٹنے والا نہیں ہے۔اقبالیات کے پرچے کی تیاری کے باعث حیدرقریشی اقبالؔ سے بے حد متاثر تھے۔بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انہوں نے سب سے زیادہ نمبر اسی پرچہ میں لئے تھے۔لیکن بات صرف نصابی تیاری کی نہیں، حیدرقریشی فکری طور پر اقبال سے متاثر تھے۔بعد میں ایک وقت آیا جب وہ اپنے مذہبی عقائد کے باعث اقبالؔ سے دور ہوئے لیکن یہ دوری وقتی تھی، حیدرقریشی میرؔ اور غالبؔ کی طرح اقبالؔ کے بھی اسیر ہیں۔یہ جملۂ معترضہ خاصا طویل ہوگیا۔۔۔ذکر ہو رہا تھا حیدرقریشی سے میرے ابتدائی رابطے کا۔۔۔ان دنوں میں ان کے محلّہ کے ایک دوست نصرت شیخ صاحب ہفت روزہ مدینہ بھاولپور کے نمائندہ برائے خانپور تھے۔ان سے میری دعا سلام تھی۔ان کے ذریعے میرا حیدرقریشی سے تعارف ہوا۔پھر کوئی ایسی بات ہوئی کہ نصرت شیخ صاحب مجھ سے ناراض ہوگئے۔مجھے کچھ لکھنے کا شوق تھا، کچھ صحافت میں کشش محسوس ہوتی تھی۔نصرت شیخ صاحب سے دوستی کرکے میں گویا خانپور کے ایک ’’بڑے صحافی‘‘ سے صحافت سیکھتا تھا۔ان سے ناراضگی ہوئی تو میں نے حیدرقریشی سے رابطہ کیا۔ان کو بتایا کہ میں ’’مدینہ‘‘ میں لکھنا چاہتا تھا لیکن دوست سے ناراضگی ہوگئی ہے۔حیدرقریشی نے میری عمر اور جذبے کو دیکھتے ہوئے میری حوصلہ افزائی کی۔لکھنے کے لئے چند مفید مشورے دیئے۔اور پھر کہا کہ جو کچھ لکھوں ان کا حوالہ دے کر اخبار کو براہ راست بھیج دوں۔مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے بزمِ فرید خانپور کی کوئی ادبی رپورٹ بھیجی تھی اور وہ فوراً ’’مدینہ‘‘ میں چھپ گئی تھی۔ایک دن حیدرقریشی نے مجھ سے پوچھا کہ ’’مدینہ‘‘ کا نمائندہ بننا ہے؟۔۔۔اُس وقت اور اُن حالات کے مطابق دیکھا جائے تو میرے لئے ناقابلِ یقین بات تھی۔میں نے بے یقینی کے ساتھ حامی بھر لی۔تب حیدر قریشی نے علاّمہ منظور احمد رحمت کے نام ایک خط لکھا اور میں ’’مدینہ‘‘ کا نمائندہ برائے ضلع رحیم یارخاں مقرر ہوگیا۔یہ ۳؍نومبر ۱۹۷۵ء کی تاریخ تھی۔میری عمر تیرہ سال تھی اور میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔تب مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی؟ میرا خیال ہے کہ میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں

لگایا جا سکے گا۔اسی دوران ہم نے خانپور میں چند ادبی تقریبات کیں۔ان میں سے ایک تقریب اختر انصاری اکبرآبادی کے اعزاز میں ہوئی۔اس کا چرچا انتظار حسین کے کالموں میں ہوا۔انتظار حسین کے دسمبر ۱۹۷۶ء کے وہ دلچسپ کالم اسی کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔۱۹۷۷ء میں حیدر قریشی نے ایک فلمی رسالہ ''سنگیت'' جاری کیا۔اس کا علم شاید بہت کم ادیبوں کو ہوگا اور ادبی دنیا کے لئے شاید یہ ایک انکشاف ہو کہ حیدر قریشی نے کبھی فلمی رسالہ نکالا تھا۔میں ''سنگیت'' کی ادارت میں شامل تھا۔اس فلمی رسالے کا گٹ اپ اور معیار ''شمع'' جیسا تھا لیکن اس کا صرف ایک ہی شمارہ نکلا۔خانپور میں بیٹھ کر لاہور کی فلمی دنیا کے بارے میں رسالہ جاری رکھنا مشکل کام تھا۔۱۹۷۸ء کے آخری مہینوں میں سے کسی مہینہ میں ''جدید ادب'' جاری ہوا اور یہ ادبی رسالہ پھر کئی سال تک جاری رہا۔

حیدر قریشی نے مجھے ہر حال میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کی تلقین کی تھی۔اسی دوران میں نے ہفت روزہ ''مدینہ'' بھاولپور میں خبروں کی ترسیل کے علاوہ ویسے بھی مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ایک مضمون ان میں ایسا بھی لکھا گیا جو حیدر قریشی کے اُس وقت کے عقائد پر ضرب لگاتا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مجھ سے ناراض ہو گئے۔یہاں پر مجھے ایک اور واقعہ یاد آ گیا ہے،ایک بار میں حیدر قریشی کے ساتھ ان کے گھر کے سامنے چھوٹے سے پلاٹ میں بیٹھا ہوا تھا۔ایک دوست وہاں تشریف لائے۔حیدر قریشی نے ان سے بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملایا جو انہیں ناگوار گزرا اور انہوں نے حیدر قریشی کے ساتھ کچھ بدتمیزی کی۔تب میں نے جماعت اسلامی کے ہفت روزہ ''زندگی'' میں حیدر قریشی کی حمایت میں نہایت پرزور طریقے سے لکھا۔کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بحیثیت ادیب اور بحیثیت انسان حیدر قریشی ہمیشہ میری پسندیدہ شخصیت رہے ہیں۔تب اُن کی جماعت کے جو عقائد تھے،ان پر تنقید میرا دینی حق تھا اور اس کا حیدر قریشی کی ذات سے کوئی تعلق نہ تھا۔بہر حال اُن دنوں میں وہ جتنے سخت مذہبی تھے اپنے طویل تجربے کے بعد پھر ویسے نہ رہے۔اور اب تو ماشاء اللہ بہت زیادہ لبرل ہو گئے ہیں۔لیکن تب جو ناراض ہوئے تو ہمارے تعلق میں کھچاؤ سا آ گیا۔ذاتی حیثیت میں اس ناراضگی کے دوران میں نے انہیں منانا چاہا،وہ مان بھی گئے لیکن ان میں پہلی سی گرمجوشی نہیں تھی۔پھر وہ خانپور چھوڑ گئے اور میں اپنی تعلیم کا ایک مرحلہ مکمل کر کے لیکچرر ہو گیا۔اس دوران حیدر قریشی سے ان کے ایبٹ آباد میں قیام کے دوران ایک دو بار رابطہ ہوا۔لیکن رابطہ پوری طرح

بحال نہیں ہوا تھا کہ وہ جرمنی چلے گئے۔جب تک مجھے ان کا جرمنی کا ایڈریس ملتا اور میں ان سے رابطہ کرتا تب تک مجھے انہوں نے ایک خط لکھا جو محکمہ ڈاک کی غفلت کے باعث مجھ تک نہیں پہنچا۔بہر حال میرا خط ملتے ہی حیدر قریشی سے رابطہ ہوا اور معلوم ہوا کہ وہ تو خود مجھے ایک خط لکھ چکے تھے۔اب یہ رابطہ محکمہ ڈاک کی کسی غفلت کا شکار نہیں ہو سکتا،کیونکہ اب ہمارا رابطہ انٹرنیٹ پر قائم ہے۔

ہفت روزہ ''مدینہ'' بھاولپور میں حیدر قریشی کی شاعری اور نیم سماجی و سیاسی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے۔میں سمجھتا ہوں وہ تحریریں حیدر قریشی کی ادبی نشوونما میں اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔اس کا اعتراف حیدر قریشی نے خود ان الفاظ میں کیا ہے:

''بھاولپور کے ہفت روزہ ''مدینہ'' کے ایڈیٹر علامہ منظور احمد رحمت کی خصوصی توجہ،محبت اور حوصلہ افزائی کا اعتراف نہ کروں تو احسان فراموشی ہوگی یہ وہ دور تھا جب میں ابھی قلم پکڑنا سیکھ رہا تھا۔علامہ منظور احمد رحمت نے ہفتہ روزہ ''مدینہ'' میں نہ صرف بزمِ فرید کی ادبی رپورٹیں شائع کیں بلکہ مجھے مختلف ادبی اور سماجی موضوعات پر لکھنے کی تحریک کر کے نثر نگاری کی طرف راغب کیا۔میری ابتدائی دور کی ڈھیروں ڈھیر غزلیں ''مدینہ'' میں چھپتی رہیں۔اگرچہ اب وہ غزلیں میرے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں لیکن آج میں جتنا بھی چھوٹا موٹا ادیب ہوں اس میں ہفت روزہ مدینہ بہاولپور کی حوصلہ افزائی اور علامہ منظور احمد رحمت کی محبت کا بہت حصہ ہے۔''

(''میری محبتیں''،دہلی ایڈیشن۔ص۱۵۲)

اور یہ کتاب ''حیدر قریشی کی ادبی خدمات''

حیدر قریشی کے بارے میں یہ کتاب مرتب کرنے کا ارادہ بہت پہلے سے تھا۔اپنے پی ایچ ڈی کے تھیسس کی تیاری کی وجہ سے اس طرف پوری توجہ دینے کا موقعہ نہیں مل رہا تھا۔اس دوران انڈیا سے ایک کتاب ''حیدر قریشی فن اور شخصیت'' شائع ہو کر آئی۔اسے سہ ماہی ''اسباق''،پونہ کے ایڈیٹر اور معروف شاعر نذیر فتح پوری اور مراٹھی دنیا میں اردو کے معروف خدمتگار سنجے گوڑ بولے

نے بڑے سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔اگر چہ اس میں حیدر قریشی کےفن کی ہر جہت کومس نہیں کیا جا سکا تاہم مجھے اس سے اپنی کتاب مرتب کرنے کے لئے اچھا آئیڈیا مل گیا ہے۔اس کتاب سے مجھے شدت سے تحریک ملی کہ میں اپنی کتاب جلد مرتب کرلوں۔اسی دوران اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور سے عزیزہ منزہ یاسمین نے اپنے ایم اے اردو کا مقالہ جوحیدر قریشی کےفن کے بارے میں تھا،مکمل کیا۔اس کی خبر سب سے پہلے مجھے ڈاکٹر انور صابر صاحب سے ملی۔پھر مجھے اسلامیہ یونیورسٹی بھاولپور کے شعبہ اردو کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد صاحب نے اس کے اچھے علمی معیار کی بابت بتایا تو مجھے لگا کہ جو کام پہلے میرے کرنے کا تھا وہ دوسرے احباب کئے جا رہے ہیں۔چنانچہ اس خبر سے بھی مجھے تحریک ملی کہ اب اپنا ادھورا پروجیکٹ مکمل کرلوں۔پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد میرے ساتھ بہت ہی شفیق ہیں اور انہیں میرے اس ارادے کا پہلے سے علم تھا،انہوں نے بھی مجھے کسی نہ کسی رنگ اس کام کوکرگزرنے کی تحریک کی۔چنانچہ ان سارے عوامل کے نتیجہ میں اب یہ کتاب ''حیدر قریشی کی ادبی خدمات'' شائع ہو رہی ہے۔

یہاں اس حوالے سے ایک دو وضاحتیں بیان کردوں۔کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں اب اس انداز کی کتابیں شائع ہونا کوئی زیادہ اہم بات نہیں رہی۔بیرون ملک مقیم اوسط درجے کے شعراء سے لے کر بے وزن اور جعلی شعراء تک اپنی شان میں ایسی کتابیں چھپوانے کی استطاعت رکھتے ہیں اور ادھر پاکستان اور انڈیا میں ایسے ''استادوں'' کی کمی نہیں ہے جو ایسے لوگوں کی معقول معاوضہ پر ''اصلاح'' کر کے نہ صرف پے در پے ان کے شعری مجموعے چھاپ سکتے ہیں بلکہ ان کی شان میں ایسی کتابیں بھی چھاپ سکتے ہیں۔

بیرون ملک سے قطع نظر خود اندرون ملک بھی بعض ایسے شاعروں پر کتابیں دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے جن میں شاعر کی تعریف میں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے جاتے ہیں لیکن اندر ایک شعر بھی ایسا نہیں ملتا جو دل میں اتر جانے والی تاثیر رکھتا ہو۔ایسے لوگ مشاعروں اور تقریبات میں تو چل جاتے ہیں کیونکہ ان کی حیثیت عارضی ہوتی ہے لیکن کتابی صورت میں آ کر جلد یا بدیر ان لوگوں کا بھرم کھل جاتا ہے۔

ایسے بے ہنگم ماحول میں حیدر قریشی کی ادبی خدمات کا یہ مختصر سا جائزہ سنجیدہ اہلِ ادب کے لئے زیادہ بامعنی ہو جاتا ہے۔اس میں حیدر قریشی کےفن کے ہر گوشے کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی

ہے۔لیکن مجھے اعتراف ہے کہ حیدر قریشی کی بعض اہم حیثیتوں پر خاطر خواہ مضامین حاصل نہیں کئے جا سکے اور ان پر ابھی مزید بہت کچھ لکھے جانے کی گنجائش ہے۔ویسے بھی حیدر قریشی کی ادبی خدمات اتنی اہم ہیں کہ ان پر ابھی بہت کام کرنے کی ضرورت ہے،لیکن یہ ضرور ہے کہ میں نے کوشش کی ہے کہ حیدر قریشی کےفن کی ہر جہت کو سامنے لایا جا سکے۔حتیٰ کہ انہوں نے عالمی صورتحال کو دیکھتے ہوئے حال ہی میں جو کالم لکھنا شروع کئے ہیں،ان کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔
تا کہ ان کی یہ جہت بھی سامنے آ سکے۔

حیدر قریشی کے بارے میں بعض متنازعہ امور پر کوئی بات کرنے کے بجائے اشارتاً دو اہم امور کی نشاندہی کئے دیتا ہوں۔تفصیل میں اس لئے نہیں جا رہا ہوں کہ حیدر قریشی کا کہنا ہے وہ اس مسئلہ پر خود کھل کر لکھنا چاہتے ہیں تا کہ نہ صرف ساری غلط فہمیاں دور ہوں بلکہ بہت سی آف دی ریکارڈ باتیں بھی کھل کر آ جائیں۔حیدر قریشی کب ایسا کر پاتے ہیں اب یہ ان کی صوابدید پر ہے۔اپنے اس پیش لفظ کے آغاز میں،میں نے جن بعض حوالوں کا ذکر کیا تھا اس سلسلے کا ڈاکٹر انور سدید کا ایک حوالہ پیش کرتا ہوں۔ڈاکٹر انور سدید۔''ڈاکٹر وزیر آغا کی تیکنیک'' مضمون میں رقمطراز ہیں:

''**ادب کی پرکھ** کا سوال ایک نجی محفل کی گفتگو سے اٹھا تو ان کے داخلی اضطراب نے ایک نئے سوال کو جنم دیا۔

'پچھلے دنوں ایک نجّی محفل میں اردو کے ایک بزرگ نقّاد نے کسی تازہ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میرے لیے اس کتاب کو پسند کرنا ناممکن ہے۔اس لیے کہ یہ تو میرے عقائد ہی کے خلاف ہے۔اور میں سوچنے لگا کہ ادب کی پرکھ کے سلسلے میں اگر عقیدے کو کسوٹی مقرر کیا جائے تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے؟''(بحوالہ کتاب شام کا سورج از انور سدید۔ص ۲۶۰)

اس اقتباس میں اٹھائے گئے سوال پر مزید کوئی اضافی تبصرہ اپنی طرف سے کرنے کے بجائے یہاں خود ڈاکٹر وزیر آغا کے ایک خط کا اقتباس درج کئے دیتا ہوں۔یہ خط حیدر قریشی کے اوّلین شعری مجموعہ کی اشاعت کے موقعہ پر ان کے نام لکھا گیا تھا۔حسنِ اتفاق ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے سوال سے تعلق رکھنے والا یہ تبصرہ بھی ان کے اپنے ایک خط ہی سے مل گیا ہے۔

''آپ کی غزلوں کا معیار اتنا اچھا ہے کہ مجھے یقین ہے کہ اگر اہلِ وطن نے چندروز

کے لئے بھی اپنے تعصّبات کو سلا دیا تو وہ ان کی تعریف کرنے پر خود کو مجبور پائیں گے‘‘
(مکتوب ڈاکٹر وزیر آغا بنام حیدر قریشی۔ تحریر کردہ ۲۸؍مئی ۱۹۹۱ء)

دوسرا حوالہ بھی ڈاکٹر انور سدید کا ہے جو انہوں نے وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کے باب میں لکھا ہے۔ میں اس میں ایک تصرف سے کام لے رہا ہوں۔ جہاں وزیر آغا کا نام آیا ہے وہاں حیدر قریشی کا نام دے رہا ہوں اور جہاں انشائیے کا ذکر آیا ہے وہاں ماہیے کا نام لکھ رہا ہوں۔ اس تصرف سے کسی تبصرے کے بغیر ظاہر ہو جائے گا کہ تاریخ کس طرح اپنے آپ کو مختلف ناموں کی تبدیلی کے ساتھ دہراتی ہے اور یہ بھی دیکھا جا سکے گا کہ تاریخ کے نئے دہرانے کے عمل میں کون کہاں کھڑا ہے۔ ’’شام کا سورج‘‘ کے صفحہ ۵۲۶ پر درج مضمون ’’ڈاکٹر وزیر آغا، بحیثیت انشائیہ نگار‘‘ کا پہلا پیراگراف مذکورہ تصرف کے ساتھ پیش ہے۔

’’**حیدر قریشی** شاید اُردو زبان و ادب کے واحد ادیب ہیں جن کا نام (نثر) **شاعری** کی ایک صنفِ اظہار ’’**ماہیا**‘‘ کے ساتھ کچھ اس پختگی سے وابستہ ہو گیا ہے کہ اب اس صنف کا تصوّر **حیدر قریشی** کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا اور کچھ لوگ اس صنف کے ساتھ نتھی ہونے کی کوشش کر رہے ہیں تو ان کا رویّہ اسی طرح کا ہے جیسے ڈاکٹر لطیفؔ نے میرزا غالبؔ کے بارے میں اختیار کیا تھا۔ یعنی وہ خود غالبؔ تو کیا ہُد ہُد کی سطح کا شعر کہنے کی قدرت بھی نہیں رکھتے لیکن بیڑہ تنقیصِ غالبؔ کا اُٹھا لیتے ہیں۔ میں اس قسم کے نقادوں کی دنیادارانہ دانشمندی کا معترف ہوں کہ آج جب **ماہیا** کے مثبت زاویوں کے ذکر میں **حیدر قریشی** کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کا ذکر بھی ہو جاتا ہے جنہوں نے اس کی مخالفتِ بے جا کا عہد کر رکھا ہے اور اس عمل میں وہ تنقیدی دیانت کو بھی قربان کر ڈالنے سے گریز نہیں کرتے لیکن خود کبھی **ماہیا** نہیں لکھا اور نہ اس کی پہچان رکھتے ہیں۔‘‘

اس اقتباس کے بعد میرے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہاں بات صرف ماہیے کی نہیں حیدر قریشی کے سارے قابلِ قدر ادبی کام کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری اس کتاب کی اشاعت کے بعد حیدر قریشی کے ادبی کام کی تفہیم کا کام تعصّبات سے بالاتر ہو کر ہوگا اور ان کی خدمات کا رسمی طور پر نہیں بلکہ کما حقہ طور پر اعتراف کیا جائے گا اور یہ سلسلہ مستقبل میں مزید بڑھے گا۔ انشاء اللہ!

ادبی و شخصی کوائف حیدر قریشی

مرتّب: سعید شباب

نام: قریشی غلام حیدر ارشد

قلمی نام: حیدر قریشی

ولدیت: قریشی غلام سرور

پیدائش: سرکاری کاغذات میں یکم ستمبر ۱۹۵۳ء ‘

درست خاندانی روایت: ۱۳؍جنوری ۱۹۵۲ء

مقامِ پیدائش: چناب نگر (سابق ربوہ)

آبائی علاقہ: رحیم یار خاں، خان پور (سابق ریاست بہاولپور)

تعلیم: ایم اے (اردو)

ادبی سفر کا آغاز: ۱۹۷۱ء

اصنافِ ادب: **شاعری میں**۔ غزل، نظم، ماہیا

نثر میں: افسانہ، خاکہ، انشائیہ، سفرنامہ، یادنگاری، تحقیق و تنقید

جُملہ کتب: **شاعری**: سلگتے خواب (غزلیں)‘

عمرِ گریزاں (غزلیں، نظمیں، ماہیے)‘

محبت کے پھول (ماہیے)‘

دعائے دل (غزلیں، نظمیں)

چاروں مجموعوں کا مجموعہ **غزلیں، نظمیں، ماہیے**

تخلیقی نثر: روشنی کی بشارت (افسانے)‘ قصے کہانیاں (افسانے)

افسانے (دونوں مجموعے ایک جلد میں)'   ایٹمی جنگ (تین افسانے اردو اور ہندی میں)
میں انتظار کرتا ہوں (افسانوں کا ہندی ترجمہ)
میری محبتیں (خاکے)'۔۔۔۔سُوئے حجاز (سفرنامہ)'۔۔۔۔فاصلے قربتیں (انشائیے)
افسانے' خاکے' انشائیے (چار کتابیں ایک جلد میں، زیر اشاعت)
کھٹی میٹھی یادیں (یادنگاری)

تحقیق و تنقید: ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت (مضامین)
اردو میں ماہیا نگاری (تحقیق و تنقید)
اردو ماہیے کی تحریک (مضامین)
اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما (مضامین)
تحقیق و تنقید کی دو مزید کتب مکمل ہیں۔ جلد شائع ہوں گی۔

ادارت : ادبی رسالہ ''جدید ادب'' خانپور کی ادارت نو سال تک کی۔ یہی جریدہ پھر جرمنی سے جاری کیا، مگر فی الوقت بند کر دیا ہے۔ جلد اشاعت کا آغاز متوقع ہے

ویب سائٹ: خورشید اقبال، نذر خلیق اور میری ترتیب دی ہوئی ایک ویب سائٹ قائم ہے

www.haiderqureshi.com

اس ویب سائٹ پر حیدر قریشی کی بیشتر کتب آن لائن دستیاب ہیں، مزید میٹر بھی اپ لوڈ کیا جا رہا ہے۔ تاحال آج کے ادباء میں سے کسی بھی ادیب کی یہ سب سے بڑی اور معیاری ویب سائٹ ہے۔ اس کے علاوہ ان دو ویب سائٹس پر حیدر قریشی کا حالاتِ حاضرہ پر فکر انگیز اور مستقل نوعیت کا کالم **منظر اور پس منظر** باقاعدگی سے موجود ہوتا ہے۔

www.urdustan.net

اور   www.alqamaronline.com

حیدر قریشی پر ہونے والا ادبی کام:

۱۔**حیدر قریشی فکر و فن**
مصنف محمد وسیم انجم (مطبوعہ ۱۹۹۹ء)
ناشر: انجم پبلشرز، کمال آباد نمبر۳، راولپنڈی۔ پاکستان

۲۔**حیدر قریشی فن اور شخصیت**
مرتبین: نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے (مطبوعہ ۲۰۰۲ء)
ناشر: اسباق پبلی کیشنز۔ پُونہ، انڈیا

۳۔**حیدر قریشی کی ادبی خدمات**
مرتب: نذر خلیق (مطبوعہ ۲۰۰۳ء)
ناشر: میاں محمد بخش پبلشرز۔ خانپور۔ پاکستان

۴۔**حیدر قریشی شخصیت اور فن**
منزہ یاسمین کا تحقیقی مقالہ
اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے ایم اے اردو کا خصوصی پرچہ

حیدر قریشی کا موجودہ پتہ:

Rossertstr.6,
65795 Hattersheim,   Germany.
Tel.0049-6190-930078
E-mail:hqg7860000@aol.com

اردو پروگرام رکھنے والے احباب attatchment کے تحت اردو میں ای۔میل کر سکتے ہیں۔

''میں وہی ہوں کنواریاں جس کے لیے ہزاروں برس سے انتظار کر رہی تھیں۔
اور میں وہی ہوں.....چاند، سورج اور ستارے جس کے آگے سجدہ ریز ہوں گے۔
اور میں وہی ہوں جو اپنے باپ کے تخت کا حقیقی وارث ہے۔
مگر میں سوتیلے جذبوں کا شکار ہوں۔
میں سوچتا ہوں۔
میں کن امتحانوں آزمائشوں اور ابتلاؤں سے گزر رہا ہوں؟''
حیدر قریشی کے افسانہ **میں انتظار کرتا ہوں** سے ایک اقتباس

حیدرقریشی۔۔پورا آدمی

اکبرحمیدی

حیدرقریشی کا شماران لوگوں میں ہوتا ہے جن کی قسمت میں سوائے کامیابی کے کچھ اور لکھا ہی نہیں جاتا۔حیدرقریشی نے کامیابی کی شہزادی کو وقت کے بہت بڑے دیو کی قید سے نکال کر حاصل کیا ہے۔ میں اسے گزشتہ کم سے کم پچیس برسوں سے یا شاید اس سے بھی زیادہ عرصہ سے جانتا ہوں، پہچانتا ہوں بلکہ اس کی دوستی کے اس حلقے میں داخل ہوں جہاں کسی پردہ داری کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ہم دونوں بڑے اعتماد اور تسلی کے ساتھ دوسروں کے بارے میں جس قسم کی باتیں کرنا چاہتے ہیں، کر لیتے ہیں۔

وہ متوسط قامت کا کھلتے ہوئے گندمی رنگ کا، بھرے بھرے جسم والا آدمی ہے۔کبھی اس کے چہرے پر داڑھی نما بال ہوتے تھے جو اَب مرورِایام کے ساتھ باقی نہیں رہے اور اب ان کی ضرورت بھی نہیں رہی کیونکہ اب وہ پاکستان میں نہیں رہتا، جرمنی میں رہائش اختیار کر چکا ہے۔ اس کے مزاج میں ایک بات میں نے حیران کن حد تک دیکھی ہے، حالانکہ اکثر حالتوں میں باتیں یا تو اچھی ہوتی ہیں یا حیران کن۔ وہ عام طور بے حد جذباتی ہے۔مگر دوستوں کے ساتھ متحمل مزاج۔۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے جھگڑے ہمیشہ دوسرے لوگوں سے ہوئے ہیں، دوستوں سے نہیں۔ دوستوں کے ساتھ اس نے بعض اوقات زودرنج ہونے کا مظاہرہ تو کیا ہے مگر ناراضگی کا نہیں۔اس کے مزاج میں حسن پرستی کا رنگ شروع سے ہی اچھا خاصا ہے جو اس کی غزلوں میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔یہی حسن پرستی کا جذبہ ہے جس نے ایک زمانے میں اسے کوچہ عشق کی سیر بھی کر وادی تھی، مگر کچھ اس طرح کہ وہ اس گلی میں ایک طرف سے داخل ہوا، اور دوسری طرف سے خیر و

عافیت سے نکل آیا، اپنی خیر و عافیت کے ساتھ بھی اور دوسرے فریق کی خیر و عافیت کے ساتھ بھی۔ مِیر صاحب کی طرح اس نے بھی یہاں عزت داروں کی عزت کا پاس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دشت وصحرا کی خاک اڑانے سے بچ کر جرمنی پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

شاید حسن پرستی اور عشق بازی کا یہی جذبہ ہے جس نے اسے "ماہیا" جیسی صنف کا عاشق بنادیا اور اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ ماہیا ماہیا کردی نی میں آپو ماہیا ہوئی۔اردو ادب میں ماہیا تحریک خالصتاً حیدرقریشی کا کارنامہ ہے۔اردو کا شاید ہی کوئی قابل ذکر رسالہ ہوگا جس میں اب ماہیا شائع نہیں ہو رہا ہوگا۔اس پر پی ایچ ڈی کرنے کی خبریں بھی آ رہی ہیں اور بھارت کے رسالے" گلبن" نے تو ماہیا نمبر بھی شائع کیا ہے۔خود حیدرقریشی نے ماہیا صنف پر پوری کتاب شائع کروائی ہے۔عشق تو ایک بے پناہ جذبے کا نام ہے جو انسان سے ہو یا فن سے یا کسی دوسرے نصب العین سے، حیدرقریشی نے اپنی اس قوت کا رخ تخلیقی ادب کی طرف موڑ دیا ہے تاہم اس منہ زور جذبے کا رخ تبدیل کرنے کے لئے بھی بے پناہ قوت ارادی کی ضرورت ہوتی ہے۔

حیدرقریشی نے خان پور سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔خان پور ایک معمولی قصبہ ہے جو حیدرقریشی جیسے آدمی کے لئے بہت چھوٹی جگہ تھی۔گو وہاں رہتے ہوئے بھی اس نے اپنا معروف ادبی رسالہ "جدید ادب" شائع کیا اور اسے صف اول کے رسائل کے معیار تک پہنچا دیا۔تاہم وہ زیادہ دیر اس تنگنائے میں نہیں رہ سکا اور جلد ہی تلوار لے کر اپنے مقدونیہ سے نکل کھڑا ہوا۔

میری نظر میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اپنے عہد کی تنگ دیواری میں محبوس رہے۔یا تو انہوں نے اس حبس زدہ تنگ دیواری میں شکیب جلالی کی طرح گھل گھل کر جان دے دی یا اسے برداشت کر کے سسکتے رہے اور یا پھر احمد داؤد کی طرح اس تنگ دیواری سے ٹکرا ٹکرا کر کرچی کرچی ہو گئے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کی شخصیت، اس پُر ہول ماحول کی تاب نہ لا کر مسخ ہوگئی۔ وہ ایک بگڑے ہوئے ذہن اور بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ مکمل طور پر منفی انسان بن کر برآمد ہوئے اور پھر ان کے ہاتھوں معاشرے کو اچھے دن دیکھنے نصیب نہ ہوئے۔ میں سمجھتا ہوں حیدرقریشی ایک طاقتور شخصیت اور انتہائی صحت مند ذہن کا انسان ہے جو اپنے ثبات مزاج اور صحت فکر کے باعث خانپور کے غیر موزوں ماحول سے خیر و عافیت کے ساتھ نکل آیا۔اس نے بہت شہروں میں قسمت آزمائی کی۔رحیم یار خاں، سرگودھا، گوجرانوالہ، ایبٹ آباد سے ہوتا ہوا، ایک روز وہ جرمنی پہنچ

گیا جہاں اس کے بچے پہلے سے موجود تھے۔ یوں اس نے زندگی کا ایک ایسا بنیادی محاذ فتح کرلیا جومرکزی حیثیت رکھتا ہےاوردوسرے محاذوں کی فتوحات میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔اب وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ جرمنی میں اچھی زندگی بسر کررہا ہےاور یہ اچھی زندگی اس کے صبر وتحمل، ہمت وکوشش،منصوبہ سازی،عقل وفراست اور مثبت طرز فکر کا نتیجہ ہے اور جوصرف اہل ہمت کا مقدر ہوتی ہے۔

حیدرقریشی سے میرا تعلق کچھ ایسا ہے،اور میں سمجھتا ہوں یہ اس کے اخلاص کے باعث ہے کہ جو کچھ وہ اپنے نظریات وعقائد کے باعث ہوتا ہے، مجھے بھی ویسا ہی دیکھنا چاہتا ہے۔گویا وہ مجھے اپنے ہمراہ رکھنا چاہتا ہے۔حالانکہ میں ذاتی طور پر ہمیشہ اپنے ہمراہ رہنے کا قائل ہوں۔اس نے اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے کچھ کوششیں بھی کیں جو بارآور نہ ہوسکیں اورانشاءاللہ تعالیٰ آئندہ بھی بارآور نہیں ہوں گی،مگر بہرحال مجھے اس کی اس خواہش کا بے حد احترام ہے کہ وہ فکری اعتبار سے بھی مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔میں اس کے اور شاید کسی کے بھی ساتھ نہیں رہ سکتا کیونکہ میں نے عرض کیا ہے کہ میں ہمیشہ اپنے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔تاہم میں حیدرقریشی سے دور نہیں ہوں،اس کے آس پاس ضرور ہوں۔اتنا آس پاس کہ

؎ وہ مرے پاس ہوتا ہے گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا!

حیدرقریشی کی شخصیت میں کچھ باتیں بہت غیر معمولی ہیں۔مثلاً دوسروں کے دلوں کو فتح کرنے کی بے پناہ قوت اس میں موجود ہے مگر اس کے ہاتھوں فتح ہونا ہر کسی کی قسمت میں نہیں ہے۔وہ ہر کسی کو اپنی تیغ آبدار کے منہ نہیں لگاتا۔بعضوں کو تو اس نے ایک ہی وار کے بعد ترک کر دیا اور وہ اس کی تیغ کو ہر بار کا منہ دیکھتے رہ گئے مگر پھر کبھی ان کے مقدر نے یاوری نہیں کی۔بعضوں کو اس نے مسلسل زوردار حملوں کے ذریعے فتح کرکے اپنے فتراک میں ڈال لیا۔ میری واردات، ذراسی مختلف تھی، مجھے اس نے ایک بار مسکرا کر دیکھا اور فتح کر ڈالا۔اب ماہیا تحریک کے سلسلے میں اسے بہت سے مفتوحین کی ضرورت تھی چنانچہ پاکستان اور بھارت میں کئی ایک احباب اس کے ہمرکاب اس ''معرکۂ حق وباطل'' میں شریک ہیں۔

بھارت میں مناظر عاشق ہرگانوی،نذیر فتح پوری،ایڈیٹر " گلبن" سیدظفر ہاشمی اور پاکستان میں پنجابی والے امین خیال، عارف فرہاد، احمد حسین مجاہد اور کئی اور دوست ماہیا تحریک میں حیدرقریشی

کے دوش بدوش ہیں۔

حیدرقریشی نے جہاں عملی زندگی میں بہت سے محاذ کھولے اوران محاذوں پر کامیابی حاصل کی وہاں ادب میں بھی کئی اصناف میں کامیابی سے طبع آزمائی کی مگر وہ بکھرا ہوا نہیں۔ پھیلا ہوا ادمی ہے۔اس نے ابتدا غزل سے کی، پھر آزادغزل بھی لکھی۔نظم لکھی تو نثری نظم میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔انشائیہ لکھا تو افسانہ بھی لکھا۔تنقید بھی لکھی اور خطوط کے دریا بھی بہادیئے۔خاکہ نگاری بھی کی ، ادبی رسالہ "جدید ادب" بھی جاری کیا۔ ماہیا لکھنا شروع کیا تو خود ماہیا بن گیا۔ ایک خط میں مجھے لکھا کہ "میں ماہیا کے لئے اب اس طرح دعا کرتا ہوں جیسے لوگ اپنے بچوں کے لئے دعا کرتے ہیں" پھر مجھے لکھا کہ " آپ بھی ماہیا کے لئے دعا کریں"۔

میں نے لکھا کہ " آپ ماہیا کے لئے دعا کریں، میں آپ کے لئے دعا کروں گا۔"

اب وہ بال بچوں والا بلکہ عیال دار آدمی ہے۔ادب اور گھرداری، دو بڑے محاذ اب اسکے سامنے ہیں اور وہ دونوں سے انصاف کر رہا ہے۔ انصاف اس طرح کہ ہر سال وہ اپنی ایک کتاب چھپواتا ہےاور ہر سال اپنے ایک بچے کی شادی کرتا ہے۔حیدرقریشی جن دنوں ایبٹ آباد کے ایک کالج میں لیکچرار تھا،انہی دنوں وہ میرے ہاں اسلام آباد بھی تشریف لاتا۔اسلام آباد میں باہر سے جوادیب وشاعر دوست آتے ہیں ان میں بعض تو اسلام آباد کے دیگر شاعروں، ادیبوں سے ملنے میں زیادہ وقت صرف کرتے ہیں اور بعض یہاں سیر وسیاحت میں وقت گزارتے ہیں۔حیدرقریشی کی یہ نہایت عجیب عادت میں نے دیکھی کہ وہ جب بھی میرے پاس آتا،بس میرے پاس ہی آتا اور ہم تمام وقت۔۔بعض اوقات دو دو دن اپنے گھر میں بیٹھے باتیں کرتے گزار دیتے۔وہ کبھی کسی سے ملنے کے لئے نہیں گیا تھا اور نہ ہی کبھی اس نے کسی سے ملنے کی خواہش کی تھی۔ہم مسلسل شب وروز ایک دوسرے کے پاس بیٹھے باتیں کرتے، چائے پیتے، کھانا کھاتے یا پھر شام کو واک کے لئے نکلتے۔ایک دوسرے کے قرب کو محسوس کرتے۔ایسا لگتا ہے ایک دوسرے کی موجودگی میں ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ باتوں سے کبھی ہمارا جی ہی نہیں بھرا۔ایک دوسرے کے قرب سے کبھی ہم تھکے ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کی کمی محسوس ہونے میں ہمیں کبھی کمی نہیں ہوئی۔دوتین مرتبہ میں بھی اسے ملنے کے لئے ایبٹ آباد گیا۔دوایک روز اس کے ہاں قیام کیا۔وہاں وہ اپنے دونو جوان بیٹوں کے ہمراہ رہائش پذیر تھا۔ان ملاقاتوں میں اتنا لطف تھا کہ

اب ان ملاقاتوں کو یاد کر کے بھی لطف آنے لگتا ہے۔ ماضی ویسے ہی پر لطف ہوتا لیکن پر لطف ماضی یاد آ کر اور بھی پر لطف ہو جاتا ہے۔ ان ملاقاتوں میں ہم لمبی لمبی باتیں کرتے۔ ادبی، غیر ادبی، مذہبی، ذاتی، غیر ذاتی، بے ذاتی اور کبھی کبھی بد ذاتی۔ غرض ہر طرح کی باتیں جن کی بنیاد میں گہرا اعتماد ہوتا۔

حیدر قریشی جتنا اچھا دوست ہے اتنا ہی پائیدار دشمن بھی ہے۔ وہ اگر دوستوں کے گھروں میں جاتا ہے تو دشمنوں کو بھی گھر تک چھوڑ کر آتا ہے۔ پھر ان کی نگرانی بھی کرتا ہے، ان کی حرکات کا جائزہ لیتا رہتا ہے اور حسب ضرورت ان کی سرکوبی کے لئے نکل کھڑا ہوتا ہے۔

حیدر قریشی ہر آدمی کی طرح عاشق مزاج ہے، ہر آدمی کی طرح اس لئے کہ اندر سے ہر کوئی عاشق مزاج ہوتا ہے لیکن کچھ لوگ اپنی نکیل اس کے ہاتھ میں نہیں آنے دیتے اور کچھ لوگوں کی نکیل وہ خود ہی تھام لیتا ہے، خواہ تھوڑے وقت کے لئے تھام سکے۔ حیدر قریشی نے اپنی نکیل کبھی اس جذبے ہاتھ میں تو نہیں آنے دی مگر پھر بھی ادھر کے اشاروں پر توجہ ضرور دی۔۔ تا آنکہ وہ اشارے آہستہ آہستہ ہوا ہوتے گئے۔ حیدر قریشی کی خوبی یہ ہے کہ اس نے اس میں ایک اعتدال بحال رکھا۔ وہ جب جرمنی پہنچا تو اس کے خطوط میں ایک جرمن خاتون کا ذکر تواتر سے آ رہا تھا۔ مجھے اس ذکر سے زیادہ فکر نہیں تھی کہ میں اس کی ہوشمندی کو جانتا ہوں، وہ کبھی بھی شہد کی مکھی نہیں بنا۔ سو اب اس خاتون کا ذکر اس کے خطوط سے کافور ہو چکا ہے اس کی جگہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے لے لی ہے، جن کا ذکر اب اس کے ہر خط میں مسلسل آ رہا ہے۔

جرمنی سے اس کی جو تصویریں اب ہوا کے دوش پر موصول ہو رہی ہیں، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں دو تبدیلیاں آئی ہیں۔ ایک یہ کہ اس نے کلین شیو کروالی ہے، جس کے قریب قریب وہ پہلے ہی رہتا تھا۔ دوسری تبدیلی یہ کہ اس نے اب شلوار قمیص کی بجائے سوٹ بوٹ پہن لیا ہے اور بالکل پاکستانی جرمن نظر آتا ہے۔ حیدر قریشی جب نیا نیا جرمن پہنچا، یہ غالباً ۱۹۹۴ء کا واقعہ ہے۔ جنوری ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر وزیر آغا سویڈن کے دورے سے جب واپس پاکستان پہنچے تو اپنے ۲۷/ جنوری ۱۹۹۵ء کے خط میں مجھے لکھا کہ: "یادش بخیر! حیدر قریشی اب پہلے سے بھی زیادہ نارمل نظر آتے ہیں۔ کلین شیو، سر پروگ، ممکن ہے سگار بھی پیتے ہوں اور جرمن زبان میں گٹ مٹ بھی کرتے ہوں۔ میرا بہت جی چاہتا ہے۔ کہ حیدر قریشی کو اس نئے میدان جنگ میں مصروفِ

پیکار دیکھوں۔ اس شخص میں بے پناہ ہمت ہے۔ اگر اس نے جرمن شہریت اختیار کر لی تو عین ممکن ہے کہ وہ کسی روز جرمنی کا چانسلر بن جائے۔"

جرمنی کا چانسلر تو فی الحال وہ نہیں بنا مگر جرمنی میں "جدید ادب" کے نام سے اس نے جو یونیورسٹی قائم کر لی ہے، اس کا چانسلر وہ یقیناً بن گیا ہے۔

بحیثیت دوست کے حیدر قریشی میں ایک اور خوبی ایسی ہے جو فی زمانہ نایاب اگر نہیں ہو تو کمیاب ضرور ہے۔ خصوصاً اسلام آباد جیسے ڈپلومیٹوں کے شہر میں تو یہ خوبی چراغ لے کر ڈھونڈنی پڑتی ہے اور پھر بھی قسمت سے ملتی ہے۔ یہ خوبی حیدر قریشی کا پورے کا پورا دوست ہونا ہے۔ اس کی دوستی میں ریزرویشن نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ یوں میں سمجھتا ہوں کہ وہ پورا دوست ہونے کے باعث پورا آدمی ہے۔ اور اس کی دوستی پورے آدمی کی دوستی ہے۔ اب جب کہ وہ پاکستان سے جرمنی منتقل ہو چکا ہے، میں اس کی یہاں سے غیر حاضری کو اپنا ذاتی نقصان سمجھتا ہوں۔ اب وہ باتیں میں کس سے کروں جو حیدر قریشی میں تم سے کیا کرتا تھا!____

سن رہے ہو حیدر قریشی____

میرے پیارے حیدر قریشی____

اوئے حیدر قریشی!

"اکبر حمیدی نے غزلیں کہیں۔۔ میں نے بھی غزلیں کہنا شروع کر دیں۔ اکبر حمیدی نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے ئے چند نظمیں کہیں تو میں بھی نظم نگاری کی طرف مائل ہو گیا۔
اکبر حمیدی نے انشائیہ نگاری شروع کی تو میں نے بھی دھیمی رفتار سے سہی، انشائیے لکھنے شروع کر دیئے۔ اکبر حمیدی نے غلطی سے ایک دو افسانے لکھ لئے۔ میں نے جوابی کارروائی کے طور پر افسانوں کا ایک مجموعہ چھپوالیا اور دوسرا مجموعہ ترتیب دے رہا ہوں۔
اکبر حمیدی نے اپنے چند بزرگوں کے خاکے لکھے تو میں نے بھی اپنے بزرگوں کے خاکے لکھنے شروع کر دیئے۔ یہ خاکے کیا تھے قبیلہ قریش اور جاٹوں کے درمیان جنگ کا اعلان تھا۔"

حیدر قریشی کی کتاب ''میری محبتیں'' میں شامل اکبر حمیدی
کے خاکہ ''**بلند قامت ادیب**'' سے اقتباس

جوگندر پال اور حیدر قریشی روبرو

ریڈیائی انٹرویو

جوگندر پال: حیدر قریشی نئی نسل کے نمائندہ، افسانہ نگار، نقاد اور ایڈیٹر ہیں اور نئے ادب کی روپ ریکھا میں جو ہمارے نوجوان شریک ہیں۔۔۔ ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی --- ہم نے سوچا کہ ہم ان سے بات چیت کر کے یہ طے کریں کہ ان کے ہاں کیا ایپریشنز بنتے ہیں، ادب کے تعلق سے، محبتوں کے تعلق سے --- اور اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم بات چیت کر رہے ہیں حیدر قریشی سے جو اردو ادب کے ایک اہم سہ ماہی "جدید ادب" کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں، شعر کہتے ہیں، افسانے بھی لکھتے ہیں---- تو حیدر صاحب! ادھر ہم محسوس کرتے ہیں کہ جہاں ادب کے سلسلے میں اپنے فکشن میں بھی، شاعری میں بھی اور تنقید میں بھی کئی باتیں آگے بڑھی ہیں۔ فکر کا دائرہ وسیع تر ہوا ہے۔ وہاں ظاہر ہے کہ کنفیوژن بھی پیدا ہوئے ہیں۔ آپ نے لوگوں کے یہاں اور نئی نسل کے یہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بھئی ہم نئے لکھنے والے لوگ ہیں۔ تو اب جو نئے لکھنے والے کہتے ہیں اس سے آپ کے ذہن میں کیسی بات بنتی ہے کہ نیا کیا؟ کیا اس لئے کہ آپ نوجوان ہیں، اس لئے نئے ہیں یا آپ کے یہاں تحریروں میں بھی وہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو مختلف ہیں اور جو اوائل میں نہیں تھیں۔ یعنی میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ آپ کی نئی نسل کا جو یہ تناؤ ہے نئے لکھنے والے اور پرانے لکھنے والے تو یہ نیا پن آخر ہے کیا؟

حیدر قریشی: نیا پن کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ تو ہر دور کی حسیت اور اس عہد کا بدلتا ہوا ڈکشن جسے کہہ لیں، تو یہ نیا پن ہر دور کا اپنا نیا پن ہوتا ہے۔۔۔ لیکن جو نئے لکھنے والے کہلانے کی بات ہے تو میں سمجھتا ہوں کے بظاہر ایک نیا لکھنے والا بھی پرانا ہو سکتا ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ آپ اپنے زمانے اور ماحول کے لحاظ سے آگے بڑھ رہے ہیں اور آپ کی شرکتیں بھرپور ہیں یا نہیں---- ورنہ

آپ اس دور میں لکھنے والے ہونے کے باوجود دو سو سال پرانے لکھنے والے بھی ہو سکتے ہیں۔

جوگندر پال: یعنی آپ اس سے اتفاق کریں گے کہ کوئی پرانا لکھنے والا بھی اس اعتبار سے ---- اسے بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ نئی تحریر، نیا پن ہے اس میں؟

حیدر قریشی: جی بالکل بالکل---- مطلب ہے پرانا لکھنے والا اگر تازگی کے ساتھ لکھ رہا ہے اور فکری طور پر اس عہد کے ساتھ چل رہا ہے تو وہ بھی نیا لکھنے والا ہوگا۔ یہ نیا، پرانا ایج کے لحاظ سے تو نہیں ہوتا۔ یہ تو عصری آگاہی اور اس میں شرکتوں کی بات ہے۔

جوگندر پال: البتہ یہ گنجائش ہے کہ آدمی جوں جوں بڑا ہوتا چلا جاتا ہے شاید زندگی سے اس کے کٹنے کی گنجائش زیادہ بنتی ہے اور جب کٹ گیا تو عصریت سے پرے ہٹ کے شاید وہ اس قدر شدت سے نیا نہ رہے بہ نسبت اس کے جو آدمی زندگی میں شریک ہے۔ بہر حال میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ جب تک نئی زندگی میں آپ کی شرکت بنی رہے آپ کے تناؤ کے، اس دور کے تناؤ کے امکانات رہتے ہیں۔ تو آپ کے یہاں جو نئے لکھنے والے ہیں آج کل ان میں آپ کے خیال کے مطابق کون سے اہم کام ہیں اور ان کے تناؤ کے، نئی زندگی کے تناؤ کے کیا اسباب بنتے ہیں؟

حیدر قریشی: جدید افسانے کا جو تجربہ پاکستان میں ہوا وہ تقریباً ۱۹۶۰ء میں انتظار حسین سے شروع ہوا۔ انتظار حسین، خالدہ حسین اور انور سجاد نے اپنے اپنے ڈھنگ سے لکھا۔ لیکن ایک مقام ایسا آیا کہ جہاں کہانی پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگا کہ میرے ساتھ شاید کوئی دھوکہ ہو رہا ہے یا یہ کہ کہانی اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی چلی گئی اور کچھ یہ بھی تھا کہ کہانی پن جدید افسانے سے غائب ہوتا چلا گیا۔ میں سمجھتا ہوں اب ہمارے افسانہ نگار ایک خاص ڈھب سے کہانی کو واپس لا رہے ہیں افسانے میں---- لیکن کوئی پلاننگ کر کے نہیں---- جیسے انتظار کے ہاں ہے کہ وہ ایک طرف دیومالا سے استفادہ کرتے ہیں دوسری طرف کافکا کے اسٹائل کو اپناتے ہیں اور یوں اپنا افسانہ بنا لیتے ہیں---- تو ان لوگوں نے اس طرح کی کوئی پلاننگ نہیں کی بلکہ تخلیقی انداز سے اپنے آپ کو دریافت کرتے ہوئے افسانہ لکھا ہے۔

جوگندر پال: انتظار کی کئی کہانیاں مجھے نجی طور پر بے حد پسند ہیں لیکن انتظار کا ایک ہی لہجے میں اپنے ہر افسانے کو برتنا---- ایک ہی اسلوب لے کے چلنا---- کیا آپ سمجھتے ہیں کہ کہانی کو

لکھنے والا اپنے اوپر یہ حدود طاری کرلے کہ اسے ایک ہی اسلوب نبھانا ہے اور ایک طرح سے اپنے
اوپر خواہ مخواہ کی پابندی عائد کرلے؟

حیدر قریشی: یہ تو کلیشے کا روپ اختیار کر جاتا ہے۔

جوگندر پال: کیا انتظار حسین کی حد تک آپ کو لگتا ہے کہ اگر وہ اپنے آپ کو بہت کھل کر
رکھتے۔اس امر کے باوجود کہ ان کی بعض کہانیاں اس تیکنیک میں بے حد عمدہ ہیں۔لیکن جب یہ
تکیہ کلام بن جاتا ہے کوئی تیکنیک آپ کا۔مینر ازم کی حد تک۔تو اس سے آپ کی گنجائشیں جو ہیں،
تخلیقی گنجائشیں کم تر نہیں ہو جاتیں اور کیا انتظار کے ہاں ایسا ہوا؟

حیدر قریشی: جی بالکل ایسے ہوا۔لیکن ان کے ناول میں میں سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے خول سے
باہر آئے ہیں۔بستی اس لحاظ سے بڑا اہم ناول ہے کہ انتظار حسین جس مخصوص لائن پر چل رہے تھے
اس سے وہ نیچے اترے ہیں۔

جوگندر پال: حیدر صاحب! میں اپنے آپ کو یہ موقع دینا چاہ رہا ہوں۔ ان
Inhabitions کے تعلق سے جو میں سمجھتا ہوں ہمارے بعض نئے لکھنے والوں کے ہاں غلط
طریقے سے آچکی ہیں یعنی تیکنیک کو اس لئے اہمیت دینا جیسے کہ تیکنیک بذات خود اہم ہے----تو
اب میرے نزدیک آپ کا چہرہ بااتفاق اس طرح نہیں جیسا وہ ہے۔جس طرح آپ نے ساری
زندگی کو بھوگا ہے----اپنے جینز سے آپ نکلے ہیں اور ان جینز میں آپ کے والدین کی ایک
دوسرے کے لئے محبت ہے اور اس کے ساتھ آپ نے جیسے زندگی کی ہے وہ ساری کاوشیں آپ
کے چہرے پر یہ یا وہ لکیریں پیدا کرتی رہی ہیں۔جس سے کہ آپ اپنی شناختیں کر پائے۔اگر آپ
کے چہرے کو تیکنیک سمجھ لیں اور آپ، آپ کی روح جو ہے وہ کہانی کے جیسی روح---- مجھے ایک
بڑا بے چین سا احساس ہوتا ہے کہ ہمارے نئے لکھنے والے تیکنیک کے جبر کا شکار ہیں۔یعنی تیکنیک
کو بذات خود اہم سمجھ کے اس میں بات کو جوڑتے ہیں تو میں چاہوں گا کہ آپ ذرا کھل کر بتائیے کہ
یہ کیوں ایسا ہوا ہے؟ یا ہم ہی غلط سوچتے ہیں۔

حیدر قریشی: یہ تیکنیک کی اسیری والی جو بات ہے یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان مین آج
کے لحاظ سے نئے لکھنے والے تیکنیک کی اسیری کا شکار ہیں اور پاکستان میں پرانے لکھنے والے
تیکنیک کے اسیر ہیں۔

جوگندر پال: (زوردار قہقہہ)

حیدر قریشی: ہمارے نئے لکھنے والے جو وہاں پر موجود ہیں یعنی ایج کے لحاظ سے بھی جو
نئے لکھنے والے ہیں وہ تیکنیک کے دباؤ سے باہر نکل آئے ہیں۔انہوں نے انور سجاد کو فالو نہیں
کیا بلکہ انہوں نے محسوس کرلیا کہ یہ کچھ کہانی کے ساتھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔افسانے کے ساتھ گڑبڑ ہو
رہی ہے۔

جوگندر پال: اب یہ انور سجاد کی آپ بات کر رہے ہیں تو ظاہر ہے میں انہیں جینوئن فنکار تو مانتا
ہوں یہ ظلم ہوگا کہنا کہ آپ کسی بات کا اتفاق نہ کریں تو فنکار کو ریجیکٹ کر دیں۔جینوئن تو وہ ہے۔
اب جو انور سجاد کی آپ نے بات کی۔اس نے "گائے" کی کہانی پیش کی۔جس کی علامت ساری
کی ساری اتنی خاموش اور سائیلنٹ ہے کہ گائے کی کہانی بھی معلوم ہوتی ہے ایک سطح پر اور دوسری
سطح پر وہ کئی مظلوموں کی کہانی بھی بن جاتی ہے اور وہ گائے جس کی خاموشی میں جو ہیبت ہے وہ دنیا
بھر کے مظلوموں کی ہیبت بھی ہے۔تو میں یہ چاہتا تھا کہ انور سجاد کا یہ پیرایہ اور آگے جاتا اور گاڑھا
ہوتا۔

حیدر قریشی: لیکن ایسا نہیں ہوا۔انور سجاد اس سے آگے نہیں جا سکے۔

جوگندر پال: یہ ہے۔بعد میں انہیں شاید----دراصل جب آپ ایک چیز لکھتے ہیں تو ایک
راستے پر چلتے ہیں۔وہ راستہ ایک حد تک راست راستہ ہوتا ہے۔پھر آگے جا کر آپ کنفیوژن کا
شکار بھی ہوتے ہیں اور وہ کنفیوژن آپ کے لئے بہتر بھی رہتا ہے۔کیونکہ جب آپ اس کنفیوژن
سے نکلتے ہیں تو ایمرج ہو کر آتے ہیں۔یہ جو درمیان میں آکر ان کی وہ بنیں علامتیں ---اور
علامتوں کے اندر تجرید اور تجرید کے اندر---- جیسے وہ ساری چیزیں وہ اس طرح پیش کی گئی ہیں کہ
اپنی طرف اشارہ زیادہ کرواتی ہیں ---اور ہر سطح پر کہانی کار کے ساتھ پڑھنے والا جڑ
جائے--- کیا ان لوگوں کے ہاں یہ کنفیوژن ہے جو بڑے بن کر بھی نکل سکتے ہیں۔یہ موجودہ
حالت میں آپ کی نسل کو قابل قبول ہے یا نہیں؟

حیدر قریشی: نہیں---اگر تو ایسا ہے تو پھر تو قابل قبول ہے کہ جو خود کنفیوژن میں مبتلا ہے
اور پورے کا پورا جتنا اپنے آپ کو ممکن ہے باہر لا رہا ہے۔سامنے آ رہا ہے۔لیکن اگر وہ خود تو نارمل
ہے لیکن قاری کو کنفیوژن کا شکار کر رہا ہے تو میرا خیال ہے یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

جوگندر پال: قاری بھی تو کنفیوژن کا شکار ہو سکتا ہے۔
حیدر قریشی: نہیں، ایسا نہیں ہے---وہ خود ٹھیک ہے۔ جان بوجھ کر کنفیوژن پیدا کر رہا ہے قاری کے لئے۔خود کسی کنفیوژن کا شکار نہیں ہے۔
جوگندر پال: یعنی تیکنیکی کرتب بازی جو ہے وہ نہ ہو۔
حیدر قریشی: جی بالکل۔ یہ تیکنیکی کرتب بازی والی بات ہے۔ ادب کے ساتھ ڈرامہ بازی والی بات ہے۔
جوگندر پال: ادھر بالکل تازہ دم افسانہ نگار جو ہیں۔ بالکل نئے لکھنے والے۔ان کے ہاں کیا چیزیں رواج پا رہی ہیں؟
حیدر قریشی: پاکستان میں؟
جوگندر پال: جی---پاکستان میں
حیدر قریشی: موضوعات تو مختلف ہیں اور بہت ہیں ان کا احاطہ کرنا بھی ممکن نہیں اور یہاں بیان کرنا بھی شاید مناسب نہیں۔اصل چیز یہ ہے کہ وہ اپنے موضوعات کو کتنی تازہ کاری کے ساتھ برت رہے ہیں۔تو یہ جو برتاؤ ہے۔موضوع کو نبھانا جو ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے نئے لکھنے والے،نوجوان لکھنے والے بہت عمدگی کے ساتھ لکھ رہے ہیں۔
جوگندر پال: اچھا--- کسی جگہ بحث ہو رہی تھی۔کسی صاحب کا کہنا تھا کہ ہم ضرورتاً علامتوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔کہانی کی نجی ضرورتوں کے تحت نہیں بلکہ خارجی ضرورتوں کے تحت۔ وہ سہولتیں میسر آ جاتی ہیں ہمیں۔آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی خارجی سہولتوں سے کہانی بھرپور فن پارہ بن جائے گی؟
حیدر قریشی: دیکھیں جی۔نیا افسانہ ۱۹۶۰ء میں--- تقریباً ۱۹۶۰ء میں شروع کیا تھا انتظار نے۔۱۹۵۸ء کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا تو اس میں خارجی ضرورت کا احساس تو ہوتا ہے اور اس کا جواز بھی بنتا ہے جو صحیح تھا۔لیکن اس میں---جب وہ جواز نہیں رہا تب بھی اسی کو دہراتے چلے جانا۔غلط بات ہے اور اصل گڑبڑ وہاں شروع ہوئی جب کہانی کو خارج کرنا شروع کر دیا گیا افسانے سے۔
جوگندر پال: میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ ہمارے ہاں انشائیہ کی صنف بھارت میں زیادہ نہیں

پنپ پائی جبکہ پاکستان میں بڑے اچھے اچھے انشائیے آنے لگے ہیں۔تو ہمیں انشائیے کے تخلیقی سماں کے بارے میں بتلایئے؟
حیدر قریشی: انشائیے کی ابتداء کے بارے میں تو مختلف آراء ہو سکتی ہیں کہ سو سال پہلے یا ڈیڑھ سو سال پہلے اس کے ابتدائی نقوش ملے اور قدیم یونان کے لٹریچر تک بھی اس کے نشانات ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔
جوگندر پال: ہم صرف اردو کی بات کریں گے۔پاکستان کی حد تک۔
حیدر قریشی: پاکستان میں قیام پاکستان کے بعد اردو کا جو انشائیہ آیا وہ بہر حال ڈاکٹر وزیر آغا ہی کا کریڈٹ ہے اور ان کے زیر اثر جو لکھنے والے ہوئے ان میں ڈاکٹر انور سدید،غلام جیلانی اصغر،مشتاق قمر،جمیل آذر،اکبر حمیدی،سلیم آغا،حامد برگی۔۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ سارے لوگ ایک کارواں کی صورت بن گئے۔ پھر بہت سارے دوسری اصناف کے سینئرز کو بھی شوق دلایا گیا---وہ لوگ بھی انشائیہ لکھنے کی طرف مائل ہوئے ان میں غلام الثقلین نقوی ہیں،شہزاد احمد ہیں خود آپ نے بھی لکھا۔
جوگندر پال: ہاں---میں نے بھی ایک انشائیہ لکھا۔
حیدر قریشی: اور وہ بڑا ابھرپور انشائیہ تھا(اے ہوش مندو!)اس پر بڑا ردعمل سامنے آیا تھا۔قارئین نے اسے بے حد پسند کیا تھا۔
جوگندر پال: میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ جیسے یہ ہمارے طنز نگار ہیں ان کا یہ کہنا ہے کہ ہم بھی تو انشائیے لکھ رہے ہیں۔میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ وہاں کے لوگوں میں جو بحثیں ہو رہی ہیں تو آپ کن اعتبار سے انشائیے کے خدوخال کی وضاحت کرتے ہیں۔
حیدر قریشی: یہ بڑی مزیدار صورتحال ہے۔ بھارت میں انشائیے کے خدوخال کے سلسلے میں کوئی مخالفت نہیں ہو رہی اس لئے یہاں انشائیہ بہت کم لکھا گیا ہے۔جبکہ ہمارے ہاں ہی اس کے خدوخال کا سارا شور ہے اور شاید اسی مخالفت کے نتیجہ میں وہاں انشائیہ زیادہ لکھا گیا۔نوجوان لکھنے والے تمام تر پروپیگنڈے کے باوجود انشائیے کے مزاج کو سمجھ رہے ہیں اور کامیاب انشائیے لکھ رہے ہیں اور جو چند لوگوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی انشائیہ نگری بنانے کی کوشش کی ہے اسے خود نوجوان انشائیہ نگاروں نے مسترد کر دیا ہے۔کوئی ان کی تقلید نہیں کرتا سوائے چند نا کام انشائیہ

نگاروں کے۔

جوگندر پال: اب کچھ اردو غزل کے تعلق سے، جدید اردو غزل کے تعلق سے بتائیے۔ روایتی غزل اور جدید غزل میں آپ کیوں کر فرق کرتے ہیں؟

حیدر قریشی: جدید خلا میں تو معلق ہوتا نہیں اس کی جڑیں اپنی روایت میں ہی جڑی ہوتی ہیں اور غزل تو اپنی تمام تر جدیدیت کے باوجود اپنی روایت سے حتی کہ فارسی اور عربی غزل کی روایت سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ باقی جدید غزل کا مطلب۔ یعنی ہم اپنے عہد کے تجربات اپنے عہد کے لہجے میں غزل کے روپ میں بیان کرتے ہیں۔

جوگندر پال: میں غزل کی ہیئت کی بات جاننا چاہتا ہوں کہ اس میں کوئی تبدیلی ہو رہی ہے یا نہیں؟

حیدر قریشی: جی---غزل اپنی ہیئت کے معاملہ میں خاصی حساس ہے۔

جوگندر پال: لیکن کچھ عرصہ سے آزاد غزل کا چرچا بھی ہو رہا ہے، بہت۔

حیدر قریشی: اوہ---ہاں--- آزاد غزل--- ہیئت میں تبدیلی، تھوڑی سی تبدیلی کا تجربہ ضرور ہے۔ لیکن یہ تجربہ دیکھیں ابھی پورے طور سے مستحکم نہیں ہو پایا۔ اور پھر اس میں بھی آپ دیکھیں غزل کے بنیادی تقاضے قافیہ، ردیف، بحر کی پابندی، یہ سب چیزیں ہیں صرف ارکان میں کمی بیشی ہوئی ہے---بھارت میں مظہر امام اور مناظر عاشق ہرگانوی اسے بڑھاوا دے رہے ہیں۔ دلا رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی اس تجربے کو تھوڑی سی پذیرائی ملی ہے۔

جوگندر پال: اچھا حیدر قریشی صاحب! آپ اپنی کوئی غزل ہمیں سنائیے۔

حیدر قریشی: مسافتوں کی لگن تو فقط بہانہ تھا
مسافروں کو بہر حال آگے جانا تھا

جوگندر پال: واہ---

حیدر قریشی: رہا نہ دھیان کسی کو دیا بجھانا تھا
جب اس کو میں نے مجھے اس نے آزمانا تھا

جوگندر پال: اچھا ہے---

حیدر قریشی: یقین کی یہی دولت ہمارے ہاتھ آئی!!

کہ ہم نے عشق میں پیہم فریب کھانا تھا

جوگندر پال: اچھا ہے---اچھا ہے۔

حیدر قریشی: خود اپنے آپ سے احوال کہہ کے روتے رہے
کہ شہر دل کو جلانا تھا اور بجھانا تھا!

جوگندر پال: آہا---خوب ہے۔

حیدر قریشی: جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے
مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا

جوگندر پال: واہ واہ ---- کیا بات ہے۔ دیکھئے اب یہاں آپ روایت سے منکر ہو گئے--- یہاں آ کے روایت سے منکر ہو گئے۔ اور کیا عمدہ بات کہی ہے۔

حیدر قریشی: (ہنستے ہوئے) نہیں میں روایت سے منکر نہیں ہوا۔

جوگندر پال: نہیں---دیکھیں نا---

حیدر قریشی: دیکھیں جی روایت سے تو جڑا ہوا ہوں میں---یہ تو---

جوگندر پال: موضوعاتی اعتبار سے دیکھئے تو Every Day لائف کو جس طرح آپ نے سمو دیا ہے شعر میں۔ تو بہت پہلے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حیدر قریشی: یہ تو تجربے میں آنے کی بات ہے۔ پہلے یہ تجربہ ہی نہیں تھا۔

جوگندر پال: یہ شعر پھر سنائیے۔ آہا---

حیدر قریشی: جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے
مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا

جوگندر پال: آہاہا---

حیدر قریشی: جب آنکھیں موند گئیں حیدرؔ گھنے اندھیرے میں
تو روشنی کا کوئی خواب ہی جگانا تھا

جوگندر پال: اچھا ہے---یہ شعر بھی اچھا ہے

حیدر قریشی: مسافتوں کی لگن تو فقط بہانہ تھا
مسافروں کو بہر حال آگے جانا تھا

جوگندر پال: وقت گذرا جا رہا ہے۔ایک بات آپ سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔آپ کے یہاں میں نے محسوس کیا کہ جو جدید اپنے آپ کو کہتے ہیں ان کو قدروں کا بھی بہت پاس ہے جبکہ قدروں کا اظہار کرنا ہمارے ہاں عام طور پر ترقی پسندوں کا خاصہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ایک تھیسس ابھر کر آیا ہے جدیدیت کا۔جس سے یہ لگتا ہے کہ Individual کے سوا کوئی بات نہیں ہے۔آپ اپنے اندر ہی اندر گھستے چلے جایئے اور قدروں کا جو پاس ہے اس سے بالکل انکار کر کے ایک تنہائی کا منظر اور یہ آپ کی ٹرمنالوجی جو ہے ویسٹ کی۔اسے لے کے آتے ہیں۔۔۔یہ دو باتیں مجھے اتنی الگ لگیں دونوں ملکوں میں ایک ہی زبان میں۔جدیدیت کا وہاں جو تصور ابھر کر آ رہا ہے اس میں قدوروں کا پورا مفہوم ابھر کر آتا ہے اور پھر فارم کی بات کی جاتی ہے۔جبکہ ہمارے ہاں پروگریسوز جواب ماڈی فائی کر رہے ہیں اپنے آپ کو۔ان کی ترمیم ہو رہی ہے کہ قدوروں کے ساتھ ساتھ فارم کو بھی نبھائیں۔لیکن اب تک یہ چل رہا تھا کہ پروگریسوز بولے تو زندگی کی باتیں اور فارم کا لحاظ نہیں اور جدید بولے تو فارم کی باتیں اور فارم کی سلینڈ اور قدروں کی نفی تو اس تضاد کے تعلق سے آپ جلدی سے کچھ کہنا چاہیں!

حیدر قریشی: پاکستان میں صورتحال یہ ہے کہ جو ہمارے نو ترقی پسند ادباء ہیں انہوں نے جمالیاتی قدوروں کا احساس کیا ہے۔انہوں نے محسوس کیا ہے کہ جمالیات کے بغیر بات نہیں بنے گی۔محض زندگی کے نعروں سے کام نہیں چلے گا۔

جوگندر پال: ایسے لوگ جو ہیں۔ظاہر ہے تنقید بھی بہت لکھی جا رہی ہوگی تو ان میں کون سے نام ہیں؟

حیدر قریشی: رشید امجد ہیں

جوگندر پال: پاکستانی تنقید نگاروں کے بارے میں کچھ بتایئے؟

حیدر قریشی: ڈاکٹر وزیر آغا بہت بڑے نقاد ہیں ہمارے ادب کے۔وہ ادب کو بڑے وسیع تر تناظر میں دیکھتے ہیں۔پھر ڈاکٹر انور سدید ہیں جیلانی کامران ہیں کچھ اور نام بھی ہیں۔

جوگندر پال: یہاں کے تعلق سے جو آپ دیکھتے ہیں تو آپ کو یہ احساس ہوتا ہے آپ ان دو چار روز میں یہاں کے ادیبوں سے بھی ملے ہیں اور یہاں کا ادب بھی آپ تک پہنچا ہے۔یہاں کی جو تنقید ہے یہ جو دو خانے بنے ہوئے ہیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وقت آ گیا ہے کہ اب خانوں کے

لحاظ سے اٹھ کے زندگی کو تلاشا جائے؟

حیدر قریشی: جی نہیں یہ خانے تو رہیں گے۔ ہاں---ہندوستان کی تنقید میں خاصی کمی محسوس ہوتی ہے اس کے لئے یہاں کے اچھے تخلیق کاروں کو تنقید کی طرف بھی آگے آنا چاہیے۔

جوگندر پال: اچھا حیدر قریشی صاحب شکریہ۔ہم نے یہ وقت آپ سے بھاگ دوڑ میں نوچ کے لے لیا۔

حیدر قریشی: جی آپ کا بھی شکریہ۔

جوگندر پال: آپ نے ہمیں بڑی واقفیت پہنچائی۔شکریہ۔

(آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے ۱۹۸۷ء کے وسط کی کسی تاریخ میں نشر ہوا)

''جنسی لذت پسندی کی طرح فیشن زدہ دہریت کا موضوع بھی یورپ کے بعض اردو افسانہ نگاروں کے ہاں موجود ہے۔خدا کے بارے میں ہر شخص کو اپنے عقیدے یا تصور کو اپنائے رکھنے کا حاصل ہے۔اس حق کو عالمانہ مضامین کی صورت میں زیادہ بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے تاہم خدا کے بارے میں کسی افسانہ نگار کا کوئی تصور، کوئی فکری مسئلہ اگر اعلیٰ تخلیقی سطح پر کسی افسانے میں آتا ہے تو ایسے افسانے کی خوبصورتی اور افسانوی سچائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔لیکن اگر صرف اس شوخیِ احساس کے تحت خدا کی ہستی کا انکار کیا جائے اور تمسخر سے کام لیا جائے کہ اس طرح 'دانشوری' میں اضافہ ہوگا تو یہ بے حد احمقانہ یا پھر بچکانہ احساس ہے۔پاکستان میں بھی بعض ادیبوں نے مذہب کے بارے میں، خدا کے بارے میں، خدا کے بارے میں مروّج عقائد کے برعکس اپنے تصورات کو بیان کیا ہے لیکن ایسے سلیقے سے بیان کیا ہے کہ پڑھا لکھا قاری بات کی تہہ تک بھی پہنچ جاتا ہے اور کسی کی دل شکنی بھی نہیں ہوتی۔سو جس طرح ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں، ایسے ہی اپنا مافی الضمیر بے محابا کہنے کے بجائے ادبی تخلیقی سلیقے سے کہنا، ادب کے قرینوں میں پہلا قرینہ ہے''۔-------------(حیدر قریشی کے ایک مضمون ''یورپ میں لکھے جانے والے اردو افسانے کے موضوعات'' سے ایک اقتباس)

بیس سوالوں کے جواب

سوالات:سلطانہ مہر (امریکہ)
جواب:حیدر قریشی (جرمنی)

(یہ تحریری انٹرویو سلطانہ مہر نے اپنی کتاب ”سخنور“ جلد سوم کے لئے ایک سوالنامہ کی صورت میں لیا تھا...مذکورہ کتاب میں ضرورت کے مطابق جواب شامل کئے گئے ہیں....یہاں سوالنامہ کے مکمل جواب درج کئے جا رہے ہیں)

سوال نمبر ۱: آپ کا پورا نام اور تخلص؟

جواب: میرا پورا نام قریشی غلام حیدر ارشد ہے۔میں نے ارشد تخلص کو شاعری میں استعمال کرنے کی بجائے اپنا قلمی نام حیدر قریشی اختیار کر لیا۔

سوال نمبر ۲: سن تاریخ وجائے پیدائش؟

جواب: سرکاری کاغذات کے مطابق یکم ستمبر 1953ء لیکن حقیقتاً 13 جنوری 1952ء ہے۔پیدائش ضلع جھنگ کے ایک چھوٹے سے شہر ربوہ میں ہوئی جہاں میری والدہ اپنے میکے آئی ہوئی تھیں تاہم میرا آبائی علاقہ خانپور اور رحیم یار خاں ہے۔

سوال نمبر ۳: حصول تعلیم اور ملازمت کی تفصیل؟

جواب: 1968ء میں گورنمنٹ ہائی سکول خانپور سے دسویں کا امتحان پاس کیا اسی برس (16 سال کی عمر میں) حئی سنز شوگر ملز خانپور میں مزدوری کر لی۔ایک ہفتہ صبح دس بجے سے شام چھ بجے

تک ڈیوٹی ہوتی۔ایک ہفتہ شام چھ بجے سے رات دو بجے تک ڈیوٹی ہوتی اور ایک ہفتہ رات دو بجے سے صبح دس بجے تک ڈیوٹی ہوتی۔شروع میں 78 روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔سیزنل ملازمت تھی چھ مہینے نوکری، چھ مہینے بیکاری، 1970ء میں میں نے پرائیویٹ طور پر ایف۔اے کا امتحان دیا اور پاس ہو گیا۔1971ء میں میری شادی کر دی گئی۔۔۔1972ء میں بی۔اے کا امتحان دیا اور کامیاب ہوا۔اسی برس ایک بیٹی کا باپ بھی بن گیا۔1974ء کا ایم۔اے کا سالانہ امتحان 1975ء میں منعقد ہوا میں نے اس میں بھی پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے شرکت کی اور کامیاب ہو گیا۔میرا مضمون اردو تھا۔۔۔1974ء میں ایک اور بچے کا باپ بھی بنا۔اس برس میرا پہلا بیٹا پیدا ہوا۔1975ء میں تیسرا بچہ اور دوسرا بیٹا پیدا ہوا۔اسی عرصہ میں مجھے شوگر ملز میں تھوڑی سی ترقی بھی عطا کی گئی اور پرمانٹ بھی کر دیا گیا۔میں نے تقریباً انیس برس اُس شوگر مل کی نوکری کر کے برباد کئے۔شفٹ کیمسٹ تک مجھے ترقی دی گئی لیکن یہ ترقی میرے لیے خوشی کی بجائے شرمندگی کا موجب بنا دی گئی۔کسی دوسری مناسب ملازمت کے لیے متعدد بار کوشش کی لیکن کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔1987ء میں کوئی نئی ملازمت حاصل کیے بغیر شوگر مل کی نوکری چھوڑ دی۔۔۔تین سال بے روزگاری کے مزے لُوٹے اور "تماشائے اہل کرم" دیکھا۔80ہزار روپے کا مقروض ہو گیا تو ایبٹ آباد کے ایک معیاری تعلیمی ادارہ میں اردو پڑھانے کی اچھی نوکری مل گئی۔یہ 1990ء کی بات ہے۔1992ء میں بوجوہ وطنِ عزیز کو خیر باد کہنا پڑا۔

سوال نمبر ۴: آپ کا قیام کہاں کہاں رہا؟

جواب: اس سوال کا جواب اوپر آ گیا ہے۔مختصراً یوں ہے کہ ابتدائی بچپن رحیم یار خان میں بسر ہوا۔پھر دو برس ربوہ میں۔اس کے بعد زندگی کا بیشتر حصہ خانپور میں بسر ہوا۔خانپور کی نوکری کے بعد ایبٹ آباد میں ملازمت کی اور اب جرمنی میں مقیم ہوں۔

سوال نمبر ۵: شاعری کے علاوہ ادب کی اور کون سی صنف سے وابستگی ہے؟

جواب: بنیادی وابستگی تو ادب سے ہے۔شاعری پہلی محبت ہے ویسے میں نے افسانے بھی لکھے ہیں خاکے بھی لکھے ہیں۔انشائیے بھی تھوڑے بہت لکھے ہیں۔باقاعدہ قسم کا نقاد تو نہیں ہوں تاہم اپنی ذاتی رائے کو مختلف مضامین میں بیان کیا ہے تو دو تنقیدی کتابوں جتنے مضامین بھی لکھ ہی چکا ہوں۔

سوال ۶: ادب اور شاعری سے وابستگی کے بنیادی محرکات کیا تھے۔؟

جواب : میں اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ تاہم میری زندگی کے ابتدائی ایام ایک متوسط گھرانے کی متوسط خوشحالی کے ایام تھے۔ اباجی کا کپڑے کا بزنس خراب ہوا تو ہم لوگ بھیانک غربت کی زد میں آ گئے۔۔ سو کم عمری میں پڑھائی چھوڑ کر نوکری کر لی تا کہ اباجی کا بوجھ بٹا سکوں۔ ہر چند خدا کے فضل سے پرائیویٹ طور پر اپنی پڑھائی بھی مکمل کر لی، لیکن معاشرتی ناانصافیوں اور زیادتیوں نے میری روح میں بے شمار گھاؤ پیدا کئے۔ ممکن ہے زندگی کا یہ سارا کھیل تماشہ ادب سے میری وابستگی کا محرک رہا ہو۔ یہاں دو دلچسپ باتیں بتاتا چلوں۔ بچپن میں سنا کرتے تھے کہ میرے چھوٹے ماموں حبیب اللہ صادق صاحب (حال مقیم امریکہ) شاعر ہیں۔ ان کی شاعری تو ہماری جوانی سے پہلے ہی ختم ہوگئی لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں بچپن میں ماموں صادق کو ہمیشہ حیرت اور خوشی کے ساتھ دیکھا کرتا تھا اور اس بات پر خوش ہوتا تھا کہ میرے ایک ماموں شاعر ہیں۔ دوسری بات یہ کہ میری شادی 1971ء میں ہوئی اور اسی برس میری شاعری کا آغاز ہوا۔ اب بنیادی محرکات کو آپ خود ہی ڈھونڈتے رہیے۔

سوال نمبر ۷: شعر گوئی کے لیے کونسی کیفیت یا جذبہ آپ کے لیے سب سے بڑا محرک ہوتا ہے؟

جواب : عام سے دکھ یا نارمل سی خوشی سے بڑھ کر کوئی بھی دکھ یا خوشی کی کیفیت مجھے اس طرف مائل کر دیتی ہے تاہم اس کے لئے مجھے ہمیشہ اپنے اندر کی آواز کا انتظار رہتا ہے۔ مناظر ومظاہر فطرت سے میں بیگانہ نہیں رہ سکتا اسی لئے دیہاتی ماحول کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ آپ مجھے "پینڈو ادیب" کہیں تو مجھے شرمندگی نہیں ہوگی خوشی ہوگی۔ محبت کا جذبہ میرے لیے لکھنے کا سب سے بڑا محرک ہوتا ہے۔ لیکن یہ عام سطحی محبت کی بات نہیں ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے میرے خاکوں کے مجموعہ "میری محبتیں" کو میرے دونوں شعری مجموعوں "سلگتے خواب" اور "عمرِ گریزاں" کے ساتھ ملا کر پڑھیے۔

سوال نمبر ۸: کس مکتبہء فکر سے آپ کی شاعری متاثر ہے، کیا ادب اور شاعری کو نظریاتی ہونا چاہیے؟ آپ کس نظریے کے تحت شعر کہتے ہیں؟

جواب : میں با قاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کسی بھی نظریے کے تحت شعر نہیں

کہتا اور نہ ہی ایسی شاعری کو اچھی شاعری سمجھتا ہوں جو پہلے نظریے کی پابندی کرائے اور پھر اس کے مطابق شاعری کرائے۔ ہر شاعر زندگی کے مختلف نظریات میں سے کسی نہ کسی کا معترف ضرور ہوتا ہے سو اس کا نظریہ اس کی روح کا جُزو بن کر جب اس کے اندر سے آتا ہے تو اعلیٰ فن پارہ بن جاتا ہے لیکن جب محض کسی عقیدے کا اظہار مقصود ہو اور شاعری ثانوی حیثیت اختیار کر جائے تب پراپیگنڈا شاعری تو وجود میں آ جاتی ہے اچھی شاعری نہیں۔ آپ اردو ادب میں ہندو مسلم اور سکھ ادیبوں کے بڑے نام دیکھ لیں مختلف عقائد اور نظریات کے باوجود ان سب نے بڑا ادب تخلیق کیا ہے کوئی ادیب کسی بھی نظریہ کو ماننے والا ہو، لمحہء تخلیق میں وہ اپنے باہر سے آزاد ہو کر اپنے اندر کی آواز پر لکھتا ہے تو اس کے اندر کے نظریے سے اپنے اختلاف کے باوجود میں اسے بڑا ادیب سمجھوں گا۔ میں نے جتنے مختلف قسم کے ادبی نظریات کو پڑھا ہے ان کے کچھ نہ کچھ اثرات تو ضرور مرتسم ہوئے ہیں میں نے ایک مزدور اور محنت کش کی زندگی گزاری ہے اس کے اثرات بھی ہیں ۔ روحانیت سے مجھے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے سو تصوف کے اثرات بھی ہیں لیکن میرے نزدیک بنیادی اہمیت اندر کی آواز کو حاصل ہے۔

سوال نمبر ۹: کن رسائل میں آپ کی تحریریں عموماً شائع ہوتی ہیں؟

جواب: مختلف وقتوں میں مختلف رسائل رہے ہیں۔ ابتداء میں "نگارِ پاکستان" اور "سیپ" میں چھپا، پھر "نئی قدریں" میں عرصہ تک میری تحریریں چھپتی رہیں میرے اپنے رسالہ "جدید ادب" میں بھی میری تحریریں چھپتی رہیں۔ ان دنوں میں "اوراق"، "تخلیق"، "تجدیدِ نو"، "منشور" پاکستانی رسائل میں اور بھارتی رسائل میں "دستک"، "شاعر"، "اسباق"، "گلبن" اور "توازن" کا نام شامل ہیں۔ صریر، ادبِ لطیف، بیسویں صدی، مفاہیم، نیا دور، راشٹریہ سہارا اور متعدد دیگر پاکستانی اور بھارتی رسائل میں بھی میری تحریریں چھپ چکی ہیں۔

سوال نمبر ۱۰: آپ کے کلام کا مجموعہ شائع ہوا؟

جواب: مطبوعہ کتب : سلگتے خواب (غزلیں)، عمرِ گریزاں (غزلیں، نظمیں، ماہیے)، روشنی کی بشارت (افسانے)، میری محبتیں (خاکے)

مرتب کردہ مطبوعہ کتب: شفق رنگ (ضلع رحیم یار خاں کے اہم شعراء)
کرنیں (بہاولپور ڈویژن کے اہم شعراء)

سرائیکی غزل (ایک بحث کے ساتھ سرائیکی غزل کا انتخاب)

پہلا ورق (اوراق کے اداریوں کا مجموعہ)

ادارت: ''جدید ادب'' کی نو سال تک ادارت

سوال نمبر ۱۱: ادب اظہارِ ذات بھی ہے اور اظہارِ کائنات بھی۔ اس کے لیے آسان زبان اور اسلوب اپنایا جائے تو ابلاغ میں دشواری نہیں ہوتی کیا آپ اس سے متفق ہیں کیا ادب و شاعری کے لیے ابلاغ ضروری ہے؟

جواب: بی بی! اگر ادب ذات اور کائنات کا اظہار ہے تو خود ہی سوچئے کیا یہ کائنات ایٹم کے پارٹیکلز سے لے کر عظیم کہکشاؤں تک کوئی آسان اور عام فہم کائنات ہے؟ اسی طرح دوسروں کی ذات کو چھوڑ دیں ہم میں سے ہر شخص اپنی ذات میں اتنا پیچیدہ ہے کہ زندگی بھر بھی اپنے آپ کو شائد ہی سمجھ پائے۔ اس لیے تو حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ "جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا"۔ لہٰذا مشکل اور پیچیدہ ذات و کائنات کے اظہار کے لیے آسان زبان اور اسلوب کا مطالبہ کچھ مناسب نہیں لگتا۔ میں فن کے اظہار کے ساتھ اس کے ابلاغ کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں لیکن اگر کسی تخلیقی لمحے میں فنکار کسی ایسی ارفع سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا اظہار، ابلاغ کی عمومی سطح سے بلند ہو جاتا ہے تو میں اس کی عظمت کو بھی مانتا ہوں البتہ جدیدیت کے نام پر اور پی آر شپ کے زور سے جن لوگوں نے جان بوجھ کر ابلاغ کو مشکل بنایا ہے ان کے مصنوعی اظہار سے جو یبوست پھیلی ہے میں اس کی مذمت کرتا ہوں یہ سارے لوگ سرے سے ادیب ہی نہیں ہیں ذرائع ابلاغ پر قبضہ کے باعث اور پی آر شپ کے زور سے جو جعلی ادیب سامنے آئے ہیں ان کی جعل سازی خود بخود ختم ہو جائے گی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے نام نہاد "جدیدیوں" کا جدید ادبی رجحانات سے اور جدید ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سوال نمبر ۱۲: کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ تنقید ادب اور شاعری کے لیے نئی راہیں متعین کرتی ہے۔ اس سلسلے میں تنقیدی شعری محفلیں کس حد تک معاون ثابت ہوتی ہیں؟

جواب: ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "تنقید اور مجلسی تنقید" اس سوال اور اس سے متعلقہ دیگر متعدد سوالات کا شافی جواب ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اصل تنقید اور سطحی تنقید کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اس سوال سے دلچسپی رکھنے والے سارے دوست مذکورہ کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔

سوال نمبر ۱۳: آج کے دور میں ادبی رسائل کی عدم مقبولیت سے شاعری کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ادبی کتابوں کی بھی پذیرائی نہیں ہوتی نہ ہی اس نوعیت کے ادبی، علمی پروگرام ہوتے ہیں جو پہلے ہوتے تھے۔ آپ اس مسئلے کی کیا حل پیش کرتے ہیں؟

جواب: ادبی رسائل اور کتب کا صرف اردو دنیا میں ہی نہیں ساری دنیا میں ایک جیسا حال ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ مادہ پرستی نے دنیا کو کسی اور راہ پر لگا دیا ہے۔ پھر بھی اردو رسائل کا دم غنیمت ہے۔ ادب کی مقبولیت کے زمانہ میں جب ساقی، ادبی دنیا اور ادب لطیف جیسے ادبی پرچے عوام میں مقبول تھے اگر ان سب کی سالانہ تعداد اشاعت جمع کر لیں اور پھر آج کے ہند و پاک کے ادبی جرائد کی سالانہ تعداد اشاعت جمع کر لیں تو صورتحال بہت زیادہ مایوس کن نہیں ہوگی۔ جہاں تک ادبی اور علمی پروگراموں کا تعلق ہے یہ انجمن سازی سے تعلق رکھتے ہیں اور میں اس معاملے میں بالکل اناڑی ہوں۔

سوال نمبر ۱۴: امریکہ میں آج کی پروان چڑھنے والی نسل زبان اردو سے تقریباً نابلد ہے۔ اس طرح یہاں مستقبل میں اردو زبان ختم ہو جائے گی۔ اردو کے شاعر ہونے کے ناطے آپ اس سلسلے میں کن اقدامات کا مشورہ دیں گے؟

جواب: آپ کی تشویش بجا ہے۔ امریکہ میں ہی نہیں، اِدھر یورپ میں بھی یہی صورت حال ہے۔ لیکن ستم ظریفی دیکھیں کہ بعض پاکستانی اور بھارتی ادبی جرائد مغربی ممالک میں مقیم اردو ادیبوں کے ٹھکانوں کو "اردو کی نئی بستیاں" قرار دے رہے ہیں اور مغربی ممالک میں مقیم بعض ادیب اس پر بغلیں بھی بجا رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح علم ہے کہ ان کی موجودہ نہیں تو اس سے اگلی نسل اردو سے بالکل بیگانہ ہو جائے گی۔ دوسرے مغربی ممالک میں اس مسئلے کو کیسے حل کیا جا سکتا ہے، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ جرمنی کے پاکستانیوں کو درپیش اس مسئلے کا حل موجود ہے۔ اگر حکومت پاکستان۔۔ جرمن حکومت کے ساتھ ثقافت اور تعلیمی معاہدہ کر لے تو جرمن حکام اس کے لئے آمادہ ہیں کہ جرمنی کے جس سکول بھی آٹھ دس پاکستانی طلبہ ہوں وہاں اردو کی کلاسوں کا انتظام ہو سکتا ہے۔ لیکن حکومت پاکستان کو اس کے لئے کون احساس دلائے اور آمادہ کرے؟

سوال نمبر ۱۵: کیا ہم اردو شاعری کے ذریعے ایسا ادب تخلیق کر رہے ہیں جو زندگی سے

بھرپور ہواور جس کی جڑیں ہماری زمین میں دور تک پیوست ہوں؟

جواب : اگرچہ اردو ادب میں ٹریش بھی بہت چھپ رہا ہے۔ تاہم ایسا ادب بھی یقیناً تخلیق ہو رہا ہے جو زندگی سے بھرپور ہے اور جس کی جڑیں ہماری زمین میں دور تک پیوست ہیں۔

سوال نمبر ۱۶: "ادیب اور شاعر کی تحریریں اس کے وجود کا اقرار اور اس کے عہد کی گواہ بن جاتی ہیں"۔۔کیا آج کی شاعری اس قول کی ترجمان ہے۔؟

جواب: یہ قول ایک جزوی سچائی ہے۔ آج کی شاعری بھی اور دوسری اصناف ادب بھی، ساری کی ساری تو نہیں لیکن بڑی حد تک اپنے تخلیق کار کے وجود کا اقرار بھی کرتی ہیں اور اسکے عہد کی گواہی بھی دیتی ہیں۔ اس تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیں:۔ پرانی داستانوں میں اُڑن طشتریاں، اڑن قالین اور پریوں کو اڑانے والے داستان گو اپنے عہد سے آگے نکلے ہوئے تھے۔ انہوں نے صدیوں پہلے ہوائی جہاز اور راکٹ کے زمانے کو اپنے ادبی کشف میں شامل کیا۔ یوں وہ اپنے عہد سے زیادہ انسان کے مستقبل کے گواہ بن گئے۔ ادب کے حوالے سے کوئی نظریہ ہو یا فکری لہر۔۔۔سب اپنی اپنی جگہ جزوی سچائیاں ہیں۔

سوال نمبر ۱۷: تنقید نگار کہتے ہیں کہ آج کا ادب بے معنی ہوتا جا رہا ہے۔ لفظ دل میں اترتا نہیں، لفظ سچ نہیں بول رہا زندگی کسی اور سمت جا رہی ہے اور ادب کسی اور سمت جا رہا ہے۔ ادب کا تعلق ہماری چاروں طرف کی زندگی سے باقی نہیں رہا۔ ادب کا رشتہ زندگی کے دھارے سے ٹوٹتا جا رہا ہے۔ کوئی نیا پن نظر نہیں آتا۔ چبائے ہوئے لقمے اگلے جا رہے ہیں۔۔۔۔آپ کی فکر کیا کہتی ہے؟

جواب: یہ باتیں تمام تنقید نگار نہیں کہتے، بعض تنقید نگار کہتے ہیں۔۔۔جدیدیت کے نام پر جن جعلی ادیبوں نے ادب میں لایعنی تحریروں کے انبار لگائے اور پھر پی آرشپ کے زور سے انھیں عظیم شاہکار قرار دلوایا۔ اگر محض انھیں مدنظر رکھ کہ بعض تنقید نگار پورے اردو ادب سے مایوسی کا اظہار کر رہے ہیں تو یہ مناسب نہیں ہے۔ ایسے ناقدین محض نام نہاد جدیدیوں کو پڑھ کر ادب کے مطالعہ سے ہاتھ اٹھا بیٹھے ہیں وگرنہ سچے لفظ اور دل میں اترنے والے لفظ آج بھی صدائے کن کی طرح اتر رہے ہیں۔ ادب زندگی کا ماتحت نہیں ہے لیکن اس نے زندگی سے اپنا تعلق قائم رکھا ہوا ہے۔ ادب میں نیا پن بھی ہے۔ میرا ایک شعر ہے۔

جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے ☆ مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا

میں اس جیسی بیسیوں مثالیں اپنی شاعری میں سے اور سینکڑوں مثالیں آج کی شاعری میں سے دکھا سکتا ہوں۔ بتایئے اس شعر کا زندگی سے تعلق ہے یا نہیں؟ اس میں نیا پن بھی ہے یا نہیں؟ جہاں تک چبائے ہوئے لقموں کو اگلنے کا الزام ہے یہ تو غالبؔ پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعری میں اور بالخصوص غزل میں قافیہ ردیف کی پابندی اتفاقیہ گل کھلا دیتی ہے۔ اسے اتفاقیہ توارد کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔۔۔ہاں یہ بات درست ہے کہ اچھے شعراء کی تراکیب اور استعاروں کو کمتر درجے کے شعراء اس حد تک دہراتے ہیں کہ ان کا سارا حسن غارت ہو جاتا ہے۔ یہ عمل غالبؔ سے پہلے بھی ہوتا رہا ہے، غالبؔ کے عہد میں بھی ہوا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ البتہ آج یہ تماشہ بھی ہو رہا ہے کہ جو کمتر ادیب کسی اچھے ادیب کی خوشہ چینی کرتا ہے اسی کے خلاف حیلوں بہانوں سے کچھ نہ کچھ لکھتا بھی رہتا ہے۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ادب ارتقاء پذیر ہے اور مایوسی والی کوئی بات نہیں ہے۔

سوال نمبر ۱۸: "ہر اچھا شاعر ذات کے حوالے سے روح عصر کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن بڑی شاعری تب جنم لیتی ہے۔ جب اسکے پس منظر میں شاعر کا نقطۂ نظر، وسیع تجربات اور مثبت فکر و مطالعہ بھی شامل ہو'۔ آپ کے خیال میں آج اس پر عمل ہو رہا ہے؟ آپ چند شعراء کا حوالہ دینا پسند کریں گے؟

جواب: آپ کے سوال کے پہلے جملہ کے بارے میں ایک وضاحت کرنا بے حد ضروری ہے۔۔ اچھی شاعری کے لئے ضروری نہیں کہ وہ روحِ عصر کی عکاسی بھی کرے۔ اگر روح عصر کی عکاسی کرنا ہی اہم ہے تو پھر اخبارات یہ فریضہ ادب سے کہیں بہتر طور پر سرانجام دے رہے ہیں۔ ہوا میں انسان سمیت مختلف جاندار سانس لیتے ہیں۔ فی ذاتہ ہوا کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ وہ ہر جاندار کو اسکی مطلوبہ گیس فراہم کرے تاہم اگر ہوا سے ہم خود اکتساب فیض کر رہے ہیں تو یہ اضافی اور ہمارے فائدہ کی بات ہے۔ اسی طرح اگر اچھے ادب سے روح عصر کی عکاسی بھی ہو رہی ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن یہ اچھے ادب کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ لازماً اس فرض کو ادا کرے۔ باقی اس میں کوئی شک نہیں اگر شاعر سچ مچ شاعر ہو تو اس کا نقطۂ نظر، وسیع تجربات اور مثبت فکر و مطالعہ مل کر اس کی شاعری میں انوکھی چمک پیدا کر دیں گے۔ آج کے زندہ شعراء میں اسکی سب سے تابندہ مثال

وزیر آغاز کی شاعری ہے۔

سوال نمبر ۱۹: (اگر آپ مزاح گو ہیں تو) کیا یہ سچ ہے کہ اپنی تحریر میں اپنا مذاق اڑانے والے ہی طنز کا بہتر ہنر جانتے ہیں؟

جواب : میں مزاح گو تو نہیں ہوں لیکن حسِ مزاح ضرور رکھتا ہوں۔اچھے مزاح اور پھکڑ پن کے فرق کو بھی جانتا ہوں۔آپ کی بات میں مجھے وزن محسوس ہو رہا ہے۔

سوال نمبر ۲۰: رشید احمد صدیقی نے کہا ہے کہ "طنز و ظرافت اس سفلی عمل کی طرح ہے جس میں اگر عمل پورا نہ ہو تو عامل خود ہی اس کا شکار ہو جاتا ہے"۔آپ کسی حوالے سے اس قول کی تصدیق یا نفی کرنا چاہیں گے؟

جواب : رشید احمد صدیقی نے جس تناظر میں یہ بات کہی ہے درست کہی ہے۔اخبارات کے وہ فکاہی کالم نگار جو خود کو ادیب منوانے پر بھی مُصر ہیں چند ایک کو چھوڑ کر اکثر لطیفوں کی بھر مار سے، طنز کو دُشنام کی سطح تک لا کر۔۔۔۔۔اور مزاح کو بھانڈوں کے انداز میں پیش کر کے " طنز و ظرافت" کے ادھورے سفلی عمل میں مبتلا ہیں۔ایسے بیشتر کالم نگار " نظریۂ ضرورت" کے تحت لکھ رہے ہیں اور اپنی اپنی حاجتیں پوری
کر رہے ہیں۔کالم نگاروں کی ہی بات کیوں؟ ادب میں تخلیق ہو یا تنقید جو لوگ بھی کسی نجی " نظریہ ءضرورت" کے تحت لکھ رہے ہیں اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔ادب کو دنیاوی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے آلہ کار بنانا اور پھر اسکے جواز میں "پرویزی حیلے" سے کام لینا اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے۔

(یہ تحریری انٹرویو ۲۰؍ستمبر ۱۹۹۵ء کو مکمل کیا گیا)

’’میرے ایک مرحوم دوست کہا کرتے تھے کہ ترقی پسندوں نے ادبی مارشل لا نافذ کیا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ویسا ہی طرزِ عمل بعض دینی ادب والوں نے بھی اپنا رکھا ہے تو وہ مسکرائے اور بولے بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن ہم اسے مارشل لا کی جگہ ماشاءاللہ کہتے ہیں۔‘‘

(حیدر قریشی کے انشائیہ ’’**یہ خیر و شرّ کے سلسلے**‘‘ سے اقتباس)

حیدر قریشی سے انٹرویو

ثریا شہاب (جرمنی)

حیدر قریشی ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئے خان پور، رحیم یار خان ان کا آبائی علاقہ ہے پاکستان میں انہوں نے ایک مزدور کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تب ان کی عمر پندرہ سال تھی شوگر مل کی نوکری کے ساتھ انہوں نے پرائیویٹ طور پر سلسلہ تعلیم کو جاری رکھا۔ایم اے اردو تک تعلیم حاصل کی، وطن چھوڑنے سے پہلے ایبٹ آباد کی ایک معروف درسگاہ میں اردو کے استاد تھے، دسمبر ۱۹۹۳ء سے جرمنی میں مقیم ہیں۔۱۹۷۱ء میں ان کی شادی ہوئی تھی اور اسی برس انہوں نے اپنی پہلی غزل کہہ کر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔حیدر قریشی کثیر الجہت ادیب ہیں۔شاعری میں غزل، نظم اور ماہیے کہتے ہیں اس کے علاوہ افسانہ نگاری، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری اور تنقید نگاری کے حوالے سے بھی انہوں نے ٹھوس ادبی کام کیا ہے۔ان کا تخلیقی کام معیار اور مقدار دونوں لحاظ سے اہم ہے۔گذشتہ دنوں ان سے ایک ملاقات میں جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل ’’جہان ادب‘‘ کے قارئین کی نذر کی جارہی ہے۔

سوال: وطن سے دور رہتے ہوئے آپ پر کیا اثر پڑا؟ آپ کی تحریر میں کیا تبدیلیاں آئیں؟

جواب: دو اثرات تو ظاہری طور پر مرتب ہوئے ہیں نجی زندگی میں تنگدستی کا طویل سفر ختم ہو گیا ہے لیکن اداسی بڑھ گئی ہے۔کبھی کبھی تو اپنے شہروں کی گلیوں کے پتھر اور روڑے بھی شدت سے یاد آتے ہیں ممکن ہے رزق کی فراخی اور وطن کی یاد کے اثرات میری تحریروں میں آنے لگے ہوں ویسے کسی قابل ذکر تبدیلی نے تحریروں میں اچانک نہیں آنا ہوتا یہ تو بس غیر محسوس طریقہ سے آتی چلی جاتی ہے اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس کا علم ہو پاتا ہے۔

سوال: میں یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں کہ انسان کا جس زمین سے رشتہ ہو جب وہ اس سے دور ہو

جائے تو اس پر اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ خاص طور پر کسی تخلیق کار کی صلاحیتیں کیسے متاثر ہو سکتی ہیں؟

جواب: اپنے گھر، محلے، گلیوں، شہر اور وطن کی یاد آنا فطری امر ہے لیکن یہ بھی ہے کہ ہماری یادوں کا بیشتر تعلق اپنے گزرے زمانے اور اپنے ذاتی حوالوں سے ہوتا ہے۔ ایک عرصہ کے بعد جب ہم ان پرانے مقامات کو دیکھنے جاتے ہیں۔ تو وہاں کا سارا نقشہ تبدیل ہو چکا ہوتا ہے لیکن ہمارے من میں تو وہ سارے مناظر ویسے ہی آباد رہتے ہیں۔ جب میں تقریباً دس برس کا تھا تب ابا جی نے رحیم یار خان والا گھر فروخت کر دیا تھا جرمنی آنے سے دو سال پہلے میں اس محلے اور اپنے پرانے گھر کو دیکھنے گیا تو محلے کا سارا منظر تبدیل ہو چکا تھا مکان بالکل گرنے والا تھا۔ اب تک گر چکا ہوگا لیکن میرے دل میں بچپن کی وہ ساری رونقیں آباد ہیں۔ ماضی کا منظر نامہ میرے پاس ہے اور میں اس کے "نہ ہونے" میں "ہونے" کا نظارا کر رہا ہوں۔ اس کیفیت میں بیک وقت خوشی اور اداسی کی لہریں موجود ہیں یہ لہریں میری تخلیقات میں بھی ضرور ہوں گی۔

سوال: خاص طور پر جرمنی میں جہاں ادبی ماحول موجود نہیں ہے ادبی محافل نہیں ہوتیں۔ ادبی مجلّے بھی دستیاب نہیں ہیں۔ بحیثیت ادیب ذاتی طور پر آپ کے محسوسات کیا ہیں؟

جواب: جرمنی میں ادبی ماحول کی عمومی صورتحال تو یہی ہے جو آپ نے بیان کی ہے لیکن میرا ذاتی معاملہ قدرے مختلف ہے بڑے اور صاحب علم ادیبوں سے شرف نیاز مندی اور دوستوں سے گپ شپ کے باوجود روایتی ادبی محفلوں اور مشاعرہ بازی سے مجھے پاکستان میں بھی کوئی تعلق نہیں تھا اور یہاں بھی نہیں ہے۔ پاکستان اور انڈیا کے اردو کے ادبی رسائل جن میں میری تحریریں بھی چھپتی ہیں میرے پاس باقاعدگی سے آتے ہیں۔ سو یہ رسائل ہی میری ادبی محفل ہیں۔ ایک خاص نوعیت کی تنہائی شروع سے ہی میرا مقدر رہی ہے۔ جو جرمنی میں بھی میرے ساتھ ہے۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں قدیم برصغیر کی قوم کا کوئی دراوڑی کردار ہوں جو اپنی زندگی کی تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف حملہ آوروں کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ ہر حملہ آور نے خود کو برہمن اور مجھے اچھوت قرار دیا ہے۔ ہوسکتا ہے کبھی اندر سے تحریک ہو اور میں اپنی زندگی کی اس ٹریجڈی کو ناول کے روپ میں پیش کردوں۔ اگر یہ ناول لکھا گیا تو اس کا نام ہوگا "درجہ دوم کا شہری" ویسے زندگی بھر کی اس خاص نوعیت کی تنہائی کا ایک فائدہ تو ہوا ہے کہ مجھے اپنے اندر کی آواز سننے اور اپنے باطن

سے ہم کلام ہونے کے مواقع ملے ہیں تخلیق کاری کے لئے ایسا ہونا بڑے نصیب کی بات ہوتی ہے۔

سوال: یورپ میں بالعموم اور جرمنی میں بالخصوص اردو ادب کے معیار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: میں ادب کی چھوٹی چھوٹی علاقائی تقسیم کو مناسب نہیں سمجھتا اگر کسی ملک میں دس ادیب ہوں اور میں خود کو ان دس میں سب سے بڑا سمجھ کر جرمنی کا یا کسی اور ملک کا عظیم شاعر یا افسانہ نگار بن بیٹھوں تو یہ ایک مضحکہ خیز صورت حال ہوگی میں کسی بھی ادیب کو پورے اردو ادب کے تناظر میں دیکھتا ہوں سو اچھے برے لکھنے والے ہر جگہ موجود ہیں جرمنی میں بھی اور باقی یورپ میں بھی بہت سے ادیب اردو ادب میں قابل قدر اضافے کر رہے ہیں اور اردو ادب ارتقا پذیر ہے۔

سوال: یوں تو آپ شاعری، افسانہ، خاکہ، انشائیہ اور تنقید تمام اصناف ادب میں مصروف کار ہیں لیکن ان میں سے کس صنف کو آپ اپنا خاص شعبہ سمجھتے ہیں؟

جواب: میں ادب کو مذہب اور سائنس کی طرح الگ، آزاد اور بامعنی سرگرمی سمجھتا ہوں مختلف طریق کار ہونے کے باوجود مذہب اور سائنس کی جستجو کا رخ کائنات کے عظیم تر اسرار کی جانب ہے اور ادب بھی میرے نزدیک اسی کی جستجو سے عبارت ہے البتہ ادب کی جستجو کی نوعیت مجاز کے وسیلے سے جمالیاتی ہے سو کسی ایک صنف کو اپنا خاص شعبہ سمجھنے کی بجائے میں ادب کو اپنا شعبہ سمجھتا ہوں۔ ہاں شاعری کو میں اپنی پہلی محبت مانتا ہوں۔

سوال: آپ نے اردو میں ماہیا نگاری کا رخ پنجابی ماہیے کے وزن کے مطابق کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اس سلسلے میں اب کیا صورت حال ہے؟

جواب: ۱۹۹۰ء میں میں اکیلا پنجابی ماہیے کے وزن کے مطابق اردو میں ماہیے لکھ رہا تھا اور آج چھ سال کے مختصر سے عرصہ میں درست وزن کو اپنانے والے ماہیا نگاروں کی تعداد (تادم انٹرویو) ۴۸ ہو چکی ہے میرے ماہیوں کا مجموعہ "محبت کے پھول" چھپ چکا ہے بھارت سے گیارہ اہم ماہیا نگاروں کا ایک اہم انتخاب بھی آ گیا ہے صوبہ کرناٹک کا ایک روزنامہ اپنے ادبی صفحہ کا ماہیا نمبر چھاپ رہا ہے۔ اگلے برس دو ماہیا نگاروں کے ماہیوں کے مجموعے آ رہے ہیں، میری تحقیق اور تنقید کی یک موضوعی کتاب "اردو میں ماہیا نگاری" بھی اگلے برس چھپ کر آ رہی

ہے۔ پاکستان اور بھارت کے بعض ادبی رسائل نے ماہیا نمبر چھاپنے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔ بھارت کی ایک یونیورسٹی میں ماہیے کے موضوع پر پی ایچ ڈی لیول کا کام شروع ہونے کی خبر بھی ملی ہے سو یہ خوش کن صورتحال ہے۔

سوال: تخلیقی عمل اور مقصدیت کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تخلیق کار کے لئے لکھتے وقت کسی مقصد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے؟

جواب: جن لوگوں نے ادب کو حصول مقصد کا ذریعہ بنایا وہ بائیں بازو کے تھے یا دائیں بازو کے تھے۔ انہوں نے ادب کی جگہ پمفلٹ پیش کیا۔ ہر فنکار کا کوئی نہ کوئی نظریہ یا تصور ضرور ہوتا ہے سو جب اس کا نظریہ اس کے باطن کی آواز بن کر آتا ہے تو اعلیٰ فن پارہ بن جاتا ہے لیکن جب وہ اپنے باطن کی آواز پر دھیان دیئے بغیر خارجی سطح پر اپنے نظریات کا پرچار شروع کرتا ہے تو صرف پروپیگنڈہ ادب کو وجود میں لاتا ہے۔ اقبال اور فیض دو انتہاؤں کے نظریات رکھنے والے شاعر تھے لیکن دونوں نے زیادہ تر اپنے باطن کی آواز پر لکھا اس لئے وہ اعلیٰ شاعر تھے۔ سو میرے نزدیک تخلیقی عمل کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے۔ البتہ اس سے کسی مقصد کی ترجمانی بھی ہوتی ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسے ایک مثال سے یوں سمجھ لیں کہ ہوا کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ ہر ذی روح کو اس کی مطلوبہ گیس فراہم کرے۔ اگر ہوا سے یہ مقصد بھی حاصل ہو رہا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ یہی معاملہ ادب اور مقصدیت کا ہے۔

سوال: کیا نثری نظم کا تجربہ ارتقائی عمل کے بعد زندہ رہے گا؟

جواب: اگر نثری نظم والوں نے اسے شاعری قرار دلوانے پر سارا زور صرف کرنے کی بجائے خلیل جبران اور ٹیگور کی روایات سے آگے کا سفر کیا ہوتا تو اس نثر لطیف کا ارتقائی عمل ممکن تھا اب تو یہ تحریک صرف پبلک ریلیشننگ کے بل پر چل رہی ہے۔ دراصل نثری نظم جو درحقیقت نثر لطیف ہے اس میں شعری مواد تو ہوتا ہے لیکن یہ شاعری نہیں ہوتی۔ شعری مواد اور شاعری کے فرق کو یوں سمجھ لیں کہ تاج محل میں جتنا میٹریل استعمال ہوا ہے اس سب کا ڈھیر لگا دیا جائے تو وہ (شعری) مواد ہے اور جب اسی مواد کو شاعرانہ تخلیقی سطح پر برتا جائے تو وہ تاج محل ہے۔

سوال: موجودہ زمانہ سائنس اور حقیقت پسندی کا زمانہ ہے ان حالات میں شاعرانہ تصورات اور مبالغہ آرائی کا کیا مقام ہے؟

جواب: قدیم ادوار میں جو جادو کا تصور تھا وہ بھی حقیقتاً سائنس ہی تھی البتہ تب اُس زمانے کے سائنس دانوں نے اسے اپنا راز بنا کر رکھا اور جادو کا غلاف چڑھائے رکھا۔ شاعری اور فکشن کا معاملہ بھی یوں ہے کہ پرانی داستانوں کی مبالغہ آرائی انسان کو سائنسی ترقی کے اس حیرت انگیز دور تک لائی ہے مثلاً قدیم داستانوں میں دیووں، پریوں، اڑن کھٹولوں اور اڑن قالینوں کے تذکروں پر غور کریں تو یہ اڑنے کی انسانی خواہش تھی جسے اُس زمانے کے ادیبوں نے مبالغہ آرائی کی صورت میں بیان کیا اور پھر اس خواہش کو زندہ رکھا میں ایسی داستانوں کو اُس زمانے کے فنکاروں کا تخلیقی کشف سمجھتا ہوں جو آج ہوائی جہاز اور راکٹ کی صورت میں ایک حقیقت بن چکا ہے۔ جام جم کو آپ سیٹلائٹ اور ٹی وی کے تناظر میں دیکھیں تو مبالغہ اور حقیقت میں فاصلے کا تعین کرنا مشکل ہو جائے گا پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر سائنسی انکشاف سائنسی زبان میں بھی پہلے فکشن ہوتا ہے۔ بعد میں وہی فکشن سچ قرار پاتا ہے ادب طبیعات سے زیادہ مابعد الطبیعات میں اور ظاہری حقیقت سے زیادہ اس کے عقب میں چھپی ہوئی سچائی میں دلچسپی لیتا ہے۔۔۔۔۔۔ اسی لئے نامعلوم کی دریافت کا سفر ادب میں زیادہ اہم ہے۔۔۔۔۔۔۔ اب تو ہماری جدید تر سائنس بھی Un Knowns اور Mystry میں دلچسپی لے رہی ہے اور سائنس دان خود اس عمل کے دوران حیرت زدہ ہیں۔

سوال: گروہ بندی کے ادبی فضا پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ آپ احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے گروہوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: ادبی گروہ بندیاں ہر دور میں رہی ہیں ہمارے قدیم شعراء ایک دوسرے کے خلاف ہجویات ہی نہیں لکھتے رہے، فرضی جنازے بھی نکالتے رہے ہیں۔ آج وہ دور ہے جب ہمارے معاشرے میں دکانداروں، موچیوں اور نائیوں تک کی انجمنیں بنی ہوئی ہیں۔ سوٹریڈ یونین کے اس دور میں ادیبوں نے بھی اپنے اپنے گروہ بنا لئے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ گروہ بندی اگر تخلیقی لحاظ سے مسابقت حاصل کرنے کے جذبے کو پروان چڑھائے تو ادب کے لئے بے حد مفید ہے لیکن اگر مادی مقاصد کے حصول کی دوڑ جیتنے کے لئے گروہ بندی ہے تو وہ اچھی چیز نہیں ہے۔ اردو ادب میں اگرچہ تخلیقی مسابقت حاصل کرنے والا جذبہ بھی موجود ہے تاہم مادی مقاصد کے حصول کی افسوسناک مثالیں زیادہ ہیں جہاں تک احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کا تعلق ہے میں دونوں

بزرگوں کا احترام کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر دونوں بزرگ کسی تیسرے فرد کے بغیر مل بیٹھیں تو ان کی صلح ہو جائے گی کیونکہ دونوں کے اندر کہیں نہ کہیں ایک دوسرے کے لئے محبت چھپی ہوئی ہے۔ باقی تخلیقی لحاظ سے دونوں کے میدان الگ الگ ہیں۔ قاسمی صاحب انسانی قدروں کے ادیب ہیں جوان کی انسان سے محبت کا اظہار ہے جبکہ آغا جی کا فکری اور تخلیقی میلان مابعدالطبیعاتی اور کائناتی اسرار و رموز کی طرف ہے۔

سوال: کیا عصر حاضر کا نقاد اپنے تنقیدی رویوں میں غیر جانبدار اور دیانتدار ہے؟

جواب: نقادوں کے رویّے ملے جلے سے ہیں۔بعض ناقدین مادی فوائد دیکھ کر جانبداری کر جاتے ہیں ڈنڈی بھی مار جاتے ہیں۔ گروہ بندی کے زیر اثر بھی چھوٹے موٹے گھپلے ہو جاتے ہیں اگر کسی ادیب کا دوست نقاد اُسے ۲۰ نمبر دے جبکہ وہ ۱۸ نمبروں کا مستحق ہے یا اس کا مخالف نقاد اسے ۱۸ نمبروں کی بجائے ۱۶ نمبر دیتا ہے تو قاری اتنی سی گڑ بڑ کو نظر انداز کر کے خود ہی حقیقت کا اندازہ کر لیتا ہے۔لیکن جب ۱۰ نمبروں والے کو رعایت کر کے ۲۰ نمبر دے دیئے جائیں یا ۲۰ نمبر والے کو ۱۰ نمبر دیئے جائیں تو ایسے ناقدین اپنا بھرم آپ گنوا بیٹھتے ہیں۔ میں نمبروں کی یہ مثال دینے پر معذرت چاہتا ہوں لیکن وضاحت کے لئے ایسا ضروری تھا۔ ہمارے ہاں دونوں طرح کے نقاد ہیں مفاد پرست نقاد بھی ہیں اور ایمانداری سے لکھنے والے بھی ہیں لیکن کسی اچھے اور سچے تخلیق کار کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ نقاد کیا کہہ رہا ہے اس کا مسئلہ تو یہ ہے کہ اسے اپنے اندر سے کیا سنائی دے رہا ہے۔

(یہ انٹرویو ڈیلی جنگ لندن کے شمارہ ۷ رنومبر ۱۹۹۶ء کے ادبی صفحہ میں شائع ہوا)

’’میری بیوی کا خیال ہے کہ میں انتہا پسند ہوں۔ یا تو اتنا میٹھا بن جاؤں گا کہ دوسرا مجھے محبت ہی میں کھا جائے۔ اور یا اتنا کڑوا ہو جاؤں گا کہ کسی کے حلق سے ہی نہیں اتروں گا۔ مجھے اپنی اس کمزوری کا ادراک ہے۔ میں خود کو بدلنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن جو عیب قدرتی طور پر ودیعت کیا گیا ہو وہ ختم نہیں ہوسکتا۔‘‘

(حیدر قریشی کی ’’کھٹی میٹھی یادیں‘‘ کے باب ’’**علّتیں، علالتیں**‘‘ سے اقتباس)

حیدر قریشی کی غزلیں

ڈاکٹر وزیر آغا

سلگتے خواب ۔۔۔حیدر قریشی کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے ان لوگوں کے برعکس جو اخبارات کے ادبی صفحات سے ابھرتے ہی پلک جھپکنے میں اپنا شعری مجموعہ پیش کر دیتے ہیں۔ حیدر قریشی نے ادبی روایات کے احترام میں اپنا اولین شعری مجموعہ پیش کرنے میں عمداً تاخیر کی ہے اور یہ ایک بہت اچھی بات ہے۔ حیدر قریشی نے ۱۹۷۱ء کے لگ بھگ ادب کے میدان میں قدم رکھا اور پچھلی ایک دہائی میں اس نے شاعری کے علاوہ انشائیہ، افسانہ، تنقید اور خاکہ نگاری میں بھی نام پیدا کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس نے نہ صرف رسائل اور کتابیں مرتب کی ہیں بلکہ دوسرے مدیران اور مرتبین میں مشورے اور ہدایات بھی فراوانی کے ساتھ مفت تقسیم کی ہیں۔ حیدر قریشی میں فاضل قوت اتنی زیادہ ہے کہ اس نے ادب کے محیط کو عبور کر کے بعض دیگر شعبوں میں بھی اپنی ذہانت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ مجھے اس کے ہاں ایک انوکھا حصول آزادی کا رجحان نظر آیا ہے۔ وہ آزاد ہونا چاہتا ہے مگر تا حال اسے شاید خود بھی معلوم نہیں کہ وہ کس سے آزاد ہونے کا خواہاں ہے۔ کیا وہ معاشرے کی جکڑ بندیوں سے باہر آنے کا متمنی ہے؟ یا کلیشوں کی گرفت اور عقائد کی سنہری زنجیروں سے؟ یا پھر خود اپنی ذات کے سلاسل سے؟ بات پوری طرح واضح نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ ان سب دائروں سے باہر نکل کر خود کو ایک ناظر کے مقام پر فائز کرنے کا متمنی ہو۔

غالباً یہی بات ہوگی کیونکہ ناظر ہی وہ مرد آزاد ہے جو کھیل میں شریک ہونے کے باوجود اس سے آزاد ہوتا ہے۔ کھیل میں اگر انسان ایک کھلاڑی کی حیثیت میں شامل ہو تو پھر اس کے باہر چلے جانے سے کھیل رک سکتا ہے لیکن ناظر بن جانے کی صورت میں اس کے باہر نکل جانے یا ویسے ہی آنکھیں موند لینے سے کھیل رک نہیں جاتا بلکہ جاری رہتا ہے۔ حیدر قریشی کو اپنا یہی رول

پسند ہے کہ جب جا ہا آنکھیں کھول کر کھیل میں جذب ہو گئے اور جب جی چاہا آنکھیں میچ کر
مراقبے میں چلے گئے یا ایک آنکھ میچ کر رننگ کمنٹری نشر کرنے لگے۔حیدر قریشی کے اس رویے نے
اس کی غزلوں میں ایک ایسا ذائقہ پیدا کیا ہے جو آج کے نئے غزل گو شعراء میں سے شاید ہی کسی
کے ہاں نظر آئے۔یعنی وہ غزل کی مقبول ترین تمثیل میں (جو عورت اور مرد کے رشتے پر مشتمل ہے
)اپنا کردار ادا کرتے ہوئے اس سے لحظہ بھر کے لئے باہر نکل کر اس پر ایک نظر ڈالنے کی کوشش کرتا
ہے، یہ معروضی رویہ شاعر کو بے معنویت یا زیاں کے ایک گہرے احساس کے بھی سپرد کر سکتا تھا مگر
حیدر قریشی کے ہاں اس کے نتیجے میں ایک ایسی موہوم سی مسکراہٹ ابھری ہے جس میں شرارت کا
عنصر واضح طور پر شامل ہے۔خود پر ہنسنے کے لئے بلا کا اعتماد ہی نہیں اپنی ذات سے باہر نکل کر خود کو
دیکھنے کا رویہ بھی درکار ہے۔تاہم اس رویے کو اپنانا شاعری کے معاملے میں خطرناک بھی ہوسکتا
ہے کیونکہ اگر معروضیت کی گرفت کڑی ہو جائے تو ایسی صورت میں طنزیہ مزاحیہ ادب تو پیدا ہو سکے
گا مگر غم میں بھیگی ہوئی وہ مسکراہٹ جنم نہ لے سکے گی جو شاعری کی معراج ہے۔اور جو محسوسات کی
سطح پر بھرپور شرکت ہی سے حاصل ہوتی ہے۔غور کیجئے کہ ہماری غزل کی روایت تین نمایاں عناصر
پر مشتمل ہے۔فکری عنصر، لذت کوشی کا عنصر اور گریہ وزاری کا میلان! گویا اس میں Hedonist,
Thinker اور Lamenter تینوں کی کارکردگی دیکھی جاسکتی ہے اور یہ تینوں اپنے اپنے منطقے
میں بے حد سنجیدہ لوگ ہیں۔مگر وہ چوتھا عنصر جو ان تینوں کے ذائقے سے آشنا ہونے کے باوجود
انہیں ناظر کی حیثیت میں دیکھنے پر قادر ہو، اردو میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔اس کی بہترین مثال
غالب ہے جس کے ہاں شاعرانہ مزاح Humour of Sublimity کے بہترین نمونے
ملتے ہیں یعنی انبساط کی وہ کیفیت جو آپ کو دیر تک ایسی سوچ میں مبتلا رکھے جس میں کسی گہرے
دکھ کا احساس شامل ہو۔

غالب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک غم انگیز بلند فکری سطح سے جب چیزوں پر ایک نظر ڈالتا
ہے تو غیر معمولی اشیاء معمولی اور معمولی چیزیں غیر معمولی بن جاتی ہیں۔تب اس کے ہاں وہ تبسم جا
گتا ہے جو "جان لینے" کا ایک انوکھا زاویہ ہے۔اس سلسلے میں ایک کم تر سطح پر عدم کی مثال بھی
پیش کی جاسکتی ہے۔جو انسانی اعمال، مظاہر، حتیٰ کہ خود پر ہنسنا بھی جانتا تھا۔ویسے غالب اور عدم
میں بُعد القطبین ہے مگر ان کی جہت ایک ہے وہ جہت جو شاعر کو لحظہ بھر کے لئے وقت کے بہاؤ سے

الگ کر کے ناظر کی حیثیت تفویض کر دیتی ہے۔ولیم بٹلر ییٹس نے اپنی مشہور نظم Long
Legged Fly میں اس بھنورے کے کردار کو پیش کیا ہے جو پانی کی سطح پر چلتا ہے مگر اس کے
ساتھ بہہ نہیں جاتا یعنی وقت کی ندی رواں دواں رہتی ہے مگر رواں ندی کے کسی ایک مقام پر "چلنے
"کے عالم میں ٹھہرا ہوتا ہے۔اس کی دوسری مثال بھگوت گیتا کا کنول ہے جو پانی میں رہتے ہوئے
بھی پانی سے تر نہیں ہوتا۔غالب کی شاعری اس خاص قسم کے معروضی رویے کی بہترین مثال
ہے۔

دوسری طرف عدم کے ہاں کمتر سطح پر سہی لیکن یہ رویہ اُبھرا ضرور ہے۔اُردو کے نئے غزل گو شعراء
میں مجھے حیدر قریشی کے ہاں یہی رویہ نظر آیا ہے۔اگر اس کی غزل میں یہ انداز مزید نکھر سنور سکا تو
اس بات کا امکان ہے کہ اس کی غزل دیگر بہت سے غزل گو شعراء سے بالکل الگ نظر آنے لگے
گی۔

دراصل کھیل میں پوری طرح شریک ہو کر اپنا کردار ادا کرنے یا کھیل سے یکسر منقطع ہو
جانے اور بحیثیت ناظر کھیل میں شریک ہونے کے باوجود لحظہ بھر کے لئے اس سے باہر نکل آنے
میں بڑا فرق ہے۔حیدر قریشی نے موخر الذکر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔چنانچہ اس کی غزل میں
محبت کا تجربہ اپنے سارے کرب کے ساتھ سامنے آیا ہے۔مگر پھر اس نے اپنے اس تجربے پر
معروضی نظر بھی ڈالی ہے جہاں تک اس کے ہاں محبت کے تجربے کا تعلق ہے تو اس کا ذائقہ افلاطونی
نہیں بلکہ زمینی اور جسمانی ہے۔گو ایسا جسمانی بھی نہیں کہ اسے معاملہ بندی کی سطح تک محدود سمجھا جا
ئے۔مثلاً اس محبت کا ایک نمایاں پہلو Pangs کی صورت میں نمایاں ہوا ہے۔وہ اپنی محبت کو
ایک گرم اور گداز "یاد" کی صورت میں اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے اس طور کہ بعض اوقات
"یاد" میں محبوبہ کی تجسیم بھی ہو گئی ہے۔مراد یہ کہ "یاد" کے تخیلی پہلو میں بھی بدن کی حرارت بلکہ کہنا
چاہیے کہ تجربے کی حدت صاف محسوس ہوتی ہے۔حیدر قریشی کی غزلوں سے "یاد" کی یہ مخصوص کا
رفرمائی ان چند اشعار میں بخوبی نظر آسکتی ہے۔

لفظ تیری یاد کے سب بے صدا کر آئے ہیں
سارے منظر آئینوں سے خود مٹا کر آئے ہیں

شاخِ دل یوں تیری یادوں سے ہری رہتی ہے
جیسے میووں سے کوئی ڈال بھری رہتی ہے

رقصاں تھی اس طرح تری یادوں کی آبشار
کہسارِ دل کے جھانجروں سے گونجتے رہے

بیتی یادیں پرو رہا تھا وہ
لوگ کہتے ہیں رو رہا تھا وہ

مجھ سے تیری یاد کے سائے بھی کترانے لگے
پھول تیری چاہتوں کے اب تو مرجھانے لگے

بھر کے آنکھوں میں سلگتے خواب اس کی یاد کے
مجھ کو سوتے میں بھی حیدؔر جاگتا رکھا گیا

پلکوں پہ تیری یاد کے منظر بکھر گئے
جیسے ستارے سینۂ شب میں اتر گئے

کچھ ایسے آتے رہے اس کے لمس کے جھونکے
دھنک اترتی گئی دل کے ذرے ذرے میں

اس کی چیخوں کی صدا آج بھی آتی ہے مجھے
میں نے زندہ ہی تری یاد کو دفنایا تھا

ان اشعار میں یادوں نے بار بار محبوبہ کے گرم وگداز جیتے جاگتے بدن کا روپ دھارا ہے۔اس طور

کہ کبھی تو یاد جھانجروں کی آواز میں منقلب ہو کر آئی ہے۔کبھی درپن بن کر ابھری ہے۔کبھی وہ گرم سلگتا خواب ہے، کبھی میووں سے بھری ڈال، کبھی سینۂ شب، موتیوں کا ہار اور لمس کا جھونکا ہے اور آخری شعر میں تو اس نے ایک ایسی انارکلی کا روپ دھار لیا ہے جیسے زندہ دیوار میں چن دیا گیا ہے۔محبت کا یہ پہلو تجربے کی صداقت کا اعلامیہ ہے نہ کہ محض تخیل کی پرواز کا۔ویسے بھی حیدر قریشی کی غزل میں محبت کا تجربہ ارضی سطح پر کسی شے کے گم ہو جانے کے کرب ناک احساس سے عبارت اور جسمانی قرب سے سرشار ہونے کی آرزو پر دال ہے۔مثلاً

وہ سرد رات کی تنہائی اور یخ بستر
سلگ رہے تھے ہزاروں اداسیوں کے بدن

کون جانے اس کی اپنی پیاس کا عالم ہو کیا
وہ جو میری روح کو پیاسا سمندر کر گیا

شب تنہائی میں اک شخص دل پر
اجالے کی طرح بکھرا ہوا تھا

رُت بدل جائے گی اس کے جگمگاتے جسم کی
میری رگ رگ میں مگر اک ذائقہ رہ جائے گا

وہ پتھر دل سہی لیکن ہمارا بھی یہ دعویٰ ہے
ہمارے لب جنہیں چھو لیں وہ پتھر بول اٹھتے ہیں

کنواری رات کے سینے سے کھینچ کر آنچل
افق کی زردیوں میں حسنِ تیرگی بھر دو

میں اپنے ہونے کے احساس سے ہراساں ہوں
مرے شعور میں کچھ کیف بے خودی بھر دو

کیف بے خودی کو آپ حسن طلب ہی سمجھیں کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ حیدر قریشی کے غزلیہ اشعار میں محبت کا کیف وکم شاعر کو مبہوت اور بے خود کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ محبت کا یہ تجربہ ایک سچا اور کھرا جسمانی تجربہ ہے اور اسی لئے اس سے پھوٹنے والا کرب اور زیاں کا احساس بھی سچا ہے۔ اگر حیدر قریشی کی جگہ کوئی اور شاعر ہوتا تو محبت میں ناکامی کے بعد صوفیانہ مسلک کے تحت محبت کے جذبے کو منقلب کر لیتا یا پھر آہ وزاری کو اپنا مسلک بنا کر حدیث دل سناتا چلا جاتا یا اگر ترقی پسند جذبات سے سرشار ہوتا تو محبوبہ کو اپنے آنچل کا پرچم بنا لینے کا مشورہ دیتا۔ مگر حیدر قریشی نے محبت کے کربناک تجربے کو اور ہی زاویے سے دیکھا ہے جس کے نتیجے میں اس کے ہاں زیرلب تبسم کی نمود ہوئی ہے جو جذبے کی بے معنویت کو اُجاگر کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔

ایک ایسے شخص کا تصور کیجیے جس کا ایک ہاتھ تو اپنے سینے میں سلگتے ہوئے درد پر رکھا ہو اور دوسرے ہاتھ سے وہ زندگی کو معنی خیز اشاروں سے چڑا رہا ہو تو آپ کو حیدر قریشی کے اس رویے کا کچھ اندازہ ہوگا جو اس کے بعض غزلیہ اشعار میں ابھرا ہے اور جو وقت کے ساتھ ساتھ اگر پھولتا پھلتا گیا تو اسے غزل گو شعراء کے جم غفیر سے بالکل الگ کر دے گا۔ اس سلسلے میں حیدر قریشی کے یہ چند اشعار درج کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

اس کو پانے کی تمنا پہ یقیں کب ہے مگر
ہاتھ جب اٹھ ہی گئے ہیں تو دعا ہی مانگوں

(ہلکی سی شرارت۔۔۔ کہ دعا تو اس سلسلے میں مستجاب ہونے سے رہی تاہم اگر ہاتھ اٹھ ہی گئے ہیں تو چلو اس بے نتیجہ تجربے سے بھی گزر جائیں)

گھر تو ہے اپنا ایک سو ایسے بچھڑ لئے
تم اپنے گھر کو چل پڑے ہم اپنے گھر گئے

اب اعتبار کرو میرے سبز باغوں کا

کہ یہ بھی سچے ہیں اٹھتی جوانیوں کی طرح

تماشا سا تماشا ہی بنا ڈالا مجھے اس نے
کبھی وہ قید کرتا ہے، کبھی آزاد کرتا ہے

عجب بے کیف سی ہے زندگی پچھلے مہینے سے
نہ کوئی یاد آتا ہے' نہ کوئی یاد کرتا ہے

پاس آکر پڑھ نہ پائے گا کتاب دل کبھی
وہ تو بس شیلفوں سے مجھ کو جھانکتا رہ جائے گا

سوچ لو انجام بھی اس عشق کا
چن دیئے جاؤ گے پھر یادوں کے بیچ

رہا نہ دھیان کسی کو دیا بجھانا تھا
جب اس کو میں نے مجھے اس نے آزمانا تھا

سارے اساتذہ ہیں مجھے محترم مگر
غالب کا معتقد ہوں، محبت ہے میر سے
حیدر نئے ادب میں تو گھائل انہیں کا ہوں
رشتہ بہت ہی گہرا ہے آغا وزیر سے
حیدر قریشی کے شعری مجموعہ ''**دعائے دل**''
کی ایک غزل سے دو اشعار

"عمر گریزاں" کی شاعری

مظہر امام

معاصر شاعری میں تازہ کاری اور تازہ دمی کی ایک نمایاں مثال حیدر قریشی اور ان کا کلام ہے۔ آج کی شاعری پر ایک الزام یہ ہے کہ اس میں یکسانیت اور یک رنگی در آئی ہے۔ ایک ہی طرح کی علامتیں، استعارے، لفظیات، وہی پیش پا افتادہ باتیں جو ایک مخصوص عصر کی پہچان کے لئے بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ یہ الزام صرف موجودہ شاعری پر ہی عائد ہو سکتا ہے یا ہر زمانے میں تقلیدی متشاعروں کی بڑی تعداد ہوتی ہے۔ سر دست میں آج کی شاعری پر فرد جرم عائد کرنے والوں سے حیدر قریشی کے کلام کے مطالعے کی سفارش کروں گا کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ حیدر قریشی کے استعارے، علامتیں، لفظیات اور موضوعات دوسرں سے الگ دکھائی دیتے ہیں یا نہیں۔

حیدر قریشی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل گوئی سے تو ان کی بنیادی دلچسپی ہے ہی (ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ "سلگتے خواب" شائع ہو چکا ہے) لیکن انہوں نے نظمیں بھی بہت اچھی کہی ہیں اور بعض نظموں کو پڑھ کر میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوا کہ وہ غزل کے زیادہ اچھے شاعر ہیں یا نظم کے۔ حیدر قریشی کا نام آزاد غزل سے بھی جڑا ہوا ہے۔ جب وہ ہونہار اور دلنواز شاعرہ فرحت نواز کے اشتراک سے اردو کا ایک نہایت عمدہ رسالہ "جدید ادب" کے نام سے شائع کر رہے تھے تو اس میں انہوں نے کئی فکر انگیز مباحث کی طرح ڈالی تھی۔ اور کئی بار آزاد غزل کے خصوصی گوشے بھی شائع کئے تھے۔ انہوں نے آزاد غزل کی ماہیت کے تعلق سے اپنے رسالے میں ایک ادارتی نوٹ لکھا۔ خود بھی آزاد غزلیں کہیں اور فرحت نواز اور دوسرے دوستوں کو آزاد غزل کہنے کے لئے آمادہ کیا۔ اس صنف کو پاکستان میں متعارف کرانے اور مقبول بنانے میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ ادھر انہوں نے اتنی بڑی تعداد میں ماہیے لکھے ہیں اور ماہیے کی

صنف کی عروضی حیثیت پر مباحث میں اس طرح حصہ لیا ہے کہ اب ان کی شناخت ماہیے کے بغیر نا مکمل ہے اور ماہیے کی شناخت ان کے بغیر۔

حیدر قریشی کی غزلوں کے اشعار پڑھتے ہوئے اکثر مجھے احساس ہوا کہ ان کے پردے سے ایک مربوط تمثیلی منظر نامہ سامنے آ رہا ہے۔

کردار رفقیہاں، مری آزادہ روی بھی
"گم راہی" کے لیکن یہی اسباب نہیں تھے
اس بزم میں ہر جھوٹ پہ بول اٹھتے تھے فوراً
نادان تھے ہم، واقف آداب نہیں تھے
ہر گوہر نایاب کی تذلیل بجا ہے
پر ہم تو کوئی گوہر نایاب نہیں تھے
احباب کے تیروں کے تو ہم عادی تھے حیدرؔ
اس بار مگر بھائی تھے، احباب نہیں تھے

اکثر اشعار میں جبر کے ماحول سے رہائی پانے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے۔ جبر کی نوعیت کیا ہے، سیاسی، معاشرتی یا مذہبی؟ شاید مذہبی تنگ نظری کا پیدا کردہ جبری ماحول۔ حیدر قریشی اپنا موقف اس طرح واضح کرتے ہیں۔

قریش مکہ میں ہو یا مدینہ والوں میں
فقیر نسبت ارض حجاز رکھتا ہے

اور رسول اکرم ﷺ کے ایک بیان سے استفادہ کر کے کیا بلیغ شعر کہتے ہیں۔

کوئی یہ کہہ دے مرے دشمنوں سے اے حیدر!
مرے خدا نے تمہارے خدا کو مار دیا

حیدر قریشی کا ایک سادہ سا شعر ہے۔

صرف یہ عمر گریزاں ہی نہیں کرتی اداس
میرا ہنستا ہوا بچپن بھی رلاتا ہے مجھے

لیکن یہ شعر، شعری کردار کی پوری زخمی شخصیت کو، اس کے اندرون کے کرب کو اور اپنے ماحول اور

معاشرے سے حاصل کی ہوئی اذیتوں کو مکمل طور پر آئینہ کر دیتا ہے۔حیدرقریشی کے ذہن وفکر میں جو پیچیدگی اور گہرائی ہے، وہ ان کے تجربات کو کئی معنیاتی امکانات سے آشنا کراتی ہے۔

اس میں مل جائے گا جا کر مرے اندر کا خلا
اور بڑھ جائے گا باہر کا خلا میرے بعد

حیدرقریشی کے نزدیک چشم ظاہر کی بھی اہمیت ہے۔مشاہدے میں آنے والی سامنے کی باتیں، عموماً ہماری شاعری میں بار نہیں پاتیں، حیدرقریشی ان سے اجتناب نہیں برتتے۔وہ عینک سے آراستہ حسن کو بھی تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

پڑتا ہے یوں تو حسن پہ اس کا اثر، مگر
اچھی لگی ہے آپ کو عینک لگی ہوئی

حیدرقریشی کی نظمیں داخلی تجربات کے شخصی برتاؤ کے حوالے سے ایک الگ ذائقہ رکھتی ہیں۔طول کلامی سے احتراز ان کے اسلوب سخن کا ایک بڑا وصف ہے۔عموماً ان کی نظموں میں ایک خاص نوع کا ارتکاز ملتا ہے۔ان میں تجربہ واحساس ہی نہیں، مشاہدے کی کارفرمائی بھی قابل لحاظ ہے اور ان کی نظموں کو لطافت اور اثر انگیزی عطا کرتی ہے۔ان کی نظمیں، ماورائی، مابعدالطبیعاتی اور تجریدی فضاؤں میں پرواز نہیں کرتیں۔ان کے یہاں ارضی رجحان غالب ہے اور حیات و کائنات کی ٹھوس چیزوں سے ان کا رشتہ گہرا ہے۔

حیدرقریشی کے کلام سے ایک نرم دل جذباتی شخصیت ابھرتی ہے جس کے اندر محبت میں سب کچھ لٹانے اور بہت کچھ پانے کا جذبہ موجزن ہے۔ان کے پہلے مجموعہ "سلگتے خواب" میں ایک عجیب وغریب شعر ملتا ہے۔

اس کو پانے کی تمنا پہ یقیں کب ہے مگر
ہاتھ جب اٹھ ہی گئے ہیں تو دعا ہی مانگو

شاید یہی وہ کیفیت ہے جسے وزیر آغا نے "غم میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ" کا نام دیا ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ حیدرقریشی کی شخصیت محبت کے جذبے کو کسی ایک فرد تک محدود نہیں رکھتی خواہ وہ محبوبہ ہی کیوں نہ ہو! وہ محبت کی ہمہ گیری کے قائل ہیں، جو ماں، بیوی، بہن، بھائی بلکہ ساری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔محبت کی یہی وسعت ان کی

شخصیت کو توانائی عطا کرتی ہے اور کسی مخصوص مسلک یا عقیدے کے حصار میں مقید ہونے نہیں دیتی۔

اپنی بڑی بہن کے لئے ان کے عقیدت اور محبت کن بلندیوں تک پہنچی ہے اس کا اندازہ اس ایک شعر سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے ہونٹوں کی محراب دعاؤں والی
اس کی خاموشی بھی اذاں جیسی لگتی ہے

اپنی چھوٹی بہن زبیدہ کی رخصتی پر، ان کی، دل گداختہ سے براہ راست نکلی ہوئی نظم کی آخری سطریں دیکھئے۔

مرے چاروں سمت اپنی بہنوں کی سچی محبت
کے پھولوں کی خوشبو بسی ہے
میں اب آنسوؤں کا گلا گھونٹنا بھی نہیں چاہتا
کیوں کہ یادوں کی سرسبز وادی میں
بارش کا دل کش نظارہ بھی تو دیکھنا چاہتا ہوں
مگر اب بھی پھر اس گھڑی
جب مری دوسری بہنیں بچھڑیں گی مجھ سے
میں پھر آنسوؤں کا گلا گھونٹ دوں گا!

ہماری شاعری میں بیوی سے محبت کا اظہار کم کم ہی ہوا ہے۔کمار پاشی نے اپنی بیوی کے تعلق سے لکھی ہوئی نظموں کا ایک پورا مجموعہ "اردھانگنی کے نام" سے شائع کیا تھا۔حیدرقریشی نے اپنی ازدواجی زندگی کے ساڑھے بارہ سال مکمل ہونے پر "نصف سلور جوبلی" کے نام سے جو نظم کہی ہے وہ ان کے جذبات کی شیفتگی کی آئینہ داری کرتی ہے۔انہوں نے "اردھانگنی" کے ساتھ اپنے بچوں کو بھی جزوحیات بنادیا ہے۔

سرشاریاں
شاداب اور سیراب جسم وجان سے چھلکیں
تو آنگن میں بہاریں اور چہکاریں

دمک اٹھیں

شرارت، کھیل، جھگڑا اور

صلح وآشتی، پھر آشتی کے ساتھ ہی جھگڑا

کتابیں، کاپیاں، پنسل، قلم اور ہوم ورک

اتنے شرارت سے بھرے چہروں پہ ایسا نور

یہ معصومیت، پاکیزگی

گنگناتے، کھنکناتے، جگمگاتے قہقہے

زندگی ہی زندگی

حیدر قریشی انسانوں سے ہی نہیں، بلکہ فطرت سے بھی اسی طرح ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اس کی ایک نہایت خوبصورت مثال ان کی نظم "ایبٹ آباد" ہے، جہاں ایک کالج کے معلم کی حیثیت سے انہوں نے دوسال گذارے ہیں۔ایبٹ آباد دن کے وقت کیسا نظر آتا ہے۔اور رات کے وقت کیسا اور خود شاعران مناظر سے گذرتے ہوئے کیسا محسوس کرتا ہے۔ یہ ساری کیفیتیں اس نظم میں در آئی ہیں۔ یہ چند سطریں دیکھئے۔ ہر چند پوری نظم اس لائق ہے کہ اسے من وعن پیش کیا جائے۔

پہاڑوں کے دامن سے

لپٹی ہوئی

یہ حسین اور سر سبز وادی کہ جیسے

کوئی خوبصورت سی ننھی سی بچی

محبت کا اظہار کرتے ہوئے

ماں کے سینے سے چمٹی ہوئی

یہ شہر نگاراں ہے یا کوئی

دوشیزہ سلمہ ستارہ کے جوڑے میں

ملبوس شرمیلے پن سے کھڑی ہے

دن اور رات کے وقت ان مناظر کو دیکھ کر خود شاعر کا احساس۔

ایسا لگتا ہے جیسے

فلک کے ستارے، ہی یہ

جگمگاتا ہوآسماں لے کے

اس وادیٔ دل نشیں میں

اتر آئے ہیں

یا میں خود آسماں پر

کروڑوں ستاروں کے جھرمٹ میں

چلتا ہوا جا رہا ہوں!

آزاد غزل کو بعض کرم فرماؤں نے اپنی ناموزونیٔ طبع، غیر شعری مزاج، بے ذوقی بلکہ بد ذوقی کا شکار بنا رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آزاد غزل میں صرف ارکان کم یا زیادہ کرنے کی آزادی ہے۔ باقی پابندی ہی پابندی ہے۔مثلاً ارکان توڑے نہیں جا سکتے۔ایک رکن کا کوئی ٹکڑا دوسرے مصرعے کا حصہ نہیں بنایا جا سکتا۔ پھر ایک اہم بات یہ کہ جس طرح آزاد نظم ہر بحر میں نہیں کہی جا سکتی، اسی طرح آزاد غزل بھی ہر بحر میں نہیں کہی جا سکتی۔

حیدر قریشی کی آزاد غزلوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور اس مجموعے میں انہوں نے ایک ہی آزاد غزل شامل کی ہے۔اس میں اس صنف کے تیکنیکی لوازمات کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے شعری آہنگ کہیں مجروح نہیں ہوتا۔مثلاً یہ مطلع۔

تماشہ بن گئے معتوب ہوتے جا رہے ہو

مگر پھر بھی اسی پتھر سے ہی منسوب ہوتے جا رہے ہو

ماہیے کے وزن کے سلسلے میں بحثیں تو بہت ہو رہی ہیں، لیکن میں حیدر قریشی کے موقف سے اتفاق کرتا ہوں کہ ماہیا بنیادی طور پر گائی جانے والی لوک شاعری ہے اور اس کی مخصوص دھنیں ہیں، اور ان دھنوں کے مطابق ماہیے کے تینوں مصرعے مساوی الوزن نہیں ہوتے۔ پہلا اور تیسرا مصرع ہم وزن بھی ہوتا ہے اور ہم قافیہ بھی۔لیکن دوسرا نسبتاً چھوٹا ہوتا ہے، یعنی اس میں ایک "سبب" کی کمی ہوتی ہے۔

اردو میں تین مصرعوں کی نظمیں کہی جاتی رہی ہیں۔اس طرح کی ایک صورت ثلاثی ہے جس میں تینوں مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں۔ان دنوں اردو میں ہائیکو کا بہت رواج ہے۔اس جاپانی صنف کے اوزان کی پوری طرح پابندی کرنا اردو میں ممکن نہیں ہے۔اس پر اتفاق رائے ہے کہ ہائیکو کے پہلے اور تیسرے مصرعے میں پانچ سالمے(Syllables) ہوں گے اور دوسرے مصرعے میں سات۔اردو عروض میں "سالمے" کا کوئی تصور نہیں ہے۔بہر حال، ماہیے کے برعکس (اس کی دھن سے قطع نظر) ہائیکو کا دوسرا مصرع پہلے اور تیسرے مصرعے سے بڑا ہوتا ہے۔

ماہیا کو حیدر قریشی "کتاب دل" قرار دیتے ہیں۔ان کے ماہیے گویا اسی کتاب دل کی تفسیریں ہیں۔ان کے بہت سے ماہیے بڑے دلکش اور دل پسند ہیں۔البتہ اس سلسلے میں پانچ ماہیے، جن کے عنوانات دیئے گئے ہیں، ان کے ماہیوں کے بارے میں ایک رائے قائم کرنے میں ممد ہوں گے۔

بیٹے: دریا کی روانی ہے
اب مرے بیٹوں میں
مری گذری جوانی ہے

بیٹیاں: مری چڑیوں کی جوڑی ہے
اک پہلوٹھی کی
اک پیٹ کھروڑی ہے

بیوی: اک روح کا قصہ ہے
میرے بدن ہی کا
جو گم شدہ حصہ ہے

؟: سونے کی انگوٹھی ہے
پیار میں سچی ہے
پر قول کی جھوٹی ہے

خود: جمنوں کی اداسی ہے

جسم ہے آسودہ
پر روح تو پیاسی ہے

حیدر قریشی کی غزل ہو یا نظم، آزاد غزل ہو یا ماہیا۔سب گزرتے لمحوں کو گرفت میں لینے کی کوششیں ہیں۔"عمر گریزاں" ان کوششوں کی کامیابی کا اشاریہ ہے!

حیدر قریشی کی ایک نایاب آزاد غزل (جو ان کے دوسرے شعری مجموعہ ''عمرِ گریزاں'' میں شامل تھی مگر اَب ان کی کلیات میں شامل نہیں ہے)

تماشہ بن گئے معتوب ہوتے جا رہے ہو
مگر پھر بھی اُسی پتھر سے ہی منسوب ہوتے جا رہے ہو

تم اُس میں جذب ہی کب ہو سکے ہو
تو پھر کیوں عشق میں مجذوب ہوتے جا رہے ہو

کوئی تو حد ہوا کرتی ہے آخر بے لحاظی کی
نرے غالبؔ کی غزلوں والے ہی محبوب ہوتے جا رہے ہو

ستمگاری و دلداری کی سب حدیں مٹا ڈالیں
بہت ہی خوب ہوتے جا رہے ہو

محبت میں بھی بزنس مائنڈڈ ہے وہ
یہ تم پاگل ہو جو جذبوں سے یوں مغلوب ہوتے جا رہے ہو

تصوف عشق میں لے آئے حیدؔر
محبت کرتے ہو محبوب ہوتے جا رہے ہو

حیدرقریشی کی غزل

اکبرحمیدی

جب کسی شاعر کا پہلا مجموعہ شائع ہوتا ہے تو یہ واقعہ اس کے لئے خطرناک بھی ہوسکتا ہے وجہ یہ ہے کہ پہلا مجموعہ کلام یا تو شاعر کو زندہ کر دیتا ہے یا پھر اسے مار دیتا ہے۔ایسے کئی شاعر ہیں جو اپنا پہلا مجموعہ چھپنے تک اچھے بھلے شاعر تھے مگر جیسے ہی مجموعہ شائع ہوا ان کا جادو ٹوٹ گیا۔کیونکہ دو چار پانچ غزلیں تو اچھی ہوسکتی ہیں مگر کتاب کے لئے بڑی تعداد میں اچھی غزلوں یا کم سے کم اچھے شعروں کا ہونا ضروری ہے۔پھر یہ بھی تو دیکھنا ہوتا ہے کہ کتاب کی شکل میں جب شاعر پورے کا پورا سامنے آتا ہے تو اس کا مسئلہ کیا بنتا ہے؟کس درجے کا بنتا ہے؟یا بنتا بھی ہے یا نہیں؟اگر کوئی مسئلہ نہیں بنتا تو شعر گوئی تفریح طبع کا کام تو نہیں۔یہ تو بقول میؔر صاحب جگر سوزی کا کام ہے۔

حیدرقریشی کا پہلا مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے جس کا نام ہے "سلگتے خواب"۔یہ مجموعہ پڑھ کر مجھے پتہ چلا کہ حیدرقریشی کا مسئلہ تو بہت گھمبیر ہے۔جب میں نے اس کا مجموعہ مکمل طور پر پڑھ لیا تو دفعتاً میری زبان پر مولانا حالی کا یہ شعر آ گیا۔

ٹپکتا ہے اشعار حالؔی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

حیدرقریشی سادہ دل تو نہیں ہے مگر پھر بھی مبتلا ضرور ہو گیا ہے اس بات کا مجھے یقین ہو گیا ہے۔
حیدرقریشی کا شمار ۱۹۷۰ء کے لگ بھگ ابھرنے والے شاعروں میں ہوتا ہے اور اسی زمانے سے وہ میرا دوست ہے۔حیدرقریشی کے ہمعصر شاعر اکثر بڑے شہروں میں رہ کر ابھرے ہیں جہاں انھیں نشرواشاعت کے بڑے ذرائع حاصل ہوئے جبکہ حیدرقریشی کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک بہت

چھوٹے شہر خان پور میں رہ کر محض اپنے شعر کے زور سے سامنے آیا اور پھر بڑے زور آور حملوں سے اس نے اپنا لوہا منوایا۔میں اس کا دوست بھی ہوں اور اس کا قاری بھی۔رسائل کے ذریعے میں ایک طویل عرصے سے اس کی غزلیں پڑھ رہا ہوں۔وہ اپنے ہمعصروں میں بہت نمایاں ہے میں اس کی غزل کی شیرینی، لہجے کی بیباکی اور بے تکلفی کا شروع ہی سے قائل ہوں۔یہی وہ صفات ہیں جن کے باعث اسکی غزل ہجوم میں سر بلند دکھائی دیتی ہے۔اس نے مسلسل محنت کے ذریعے اپنی غزل پر اپنی شخصیت کا رنگ چڑھایا ہے جس کے باعث اس کی غزل قارئین کے وسیع حلقے میں پہچانی گئی ہے۔بے شمار انتخابات میں اس کی غزل منتخب غزلوں میں شامل کی گئی۔یہ سب باتیں اس کی غزل کا اعتبار اور وقار ہیں۔مگر اب تک تو مجموعۂ خیال فرد فرد تھا اور سچی بات یہ ہے کہ اس کی بکھری ہوئی غزلوں کے ذریعے میں نہ جان سکا کہ وہ کہیں مبتلا بھی ہو چکا ہے۔اس کا مجموعہ "سلگتے خواب" پڑھ کر حالؔی کے علاوہ مجھے غالبؔ کا یہ شعر بھی یاد آتا ہے۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

حیدرقریشی کی غزلیں پڑھ کر مجھے بہت کچھ یاد آیا۔غالبؔ کا یہ سانحہ بھی یاد آیا۔میں ہوں اپنی شکست کی آواز۔۔۔۔پھر ایک پنجابی شاعر نے کہا تھا۔

ساڈی لگدی کسے نہ ویکھی
تے ٹٹ دی نوں جگ جان دا

ایک پنجابی شاعر نے تو صاف کہہ دیا "ٹٹ گئی تڑک کر کے"۔حیدرقریشی کی غزلوں میں مجھے "تڑک کر کے" ٹوٹنے کی آواز مسلسل سنائی دیتی رہی ہے۔وہ میرا دوست ہے بیس سال سے، میں تو اسے ایک ہنسوڑ آدمی ہی سمجھتا رہا۔لاابالی سا، آوارہ مزاج، غیر ذمہ دار،۔۔حیرت ہے اس نے عشق اتنی ذمہ داری سے کیسے کر لیا؟وہ تو اس میں گلے گلے تک پھنسا ہوا دکھائی دیتا ہے۔
میں حیدرقریشی کا دوست ہونے کے ناطے اس کے احوال کچھ نہ کچھ ضرور جانتا ہوں مجھے یاد ہے جب وہ خان پور چھوڑ کر نکلا تو اسے اس وقت بھی عشق کا روگ تھا۔مگر عشق کے روگ کے علاوہ کچھ روگ اور بھی تھے اس نے کہا۔

رزق کی تنگی، عشق کا روگ اور لوگ منافق سارے

آؤ ایسے شہر سے حیدرؔ شہر بدر ہو جائیں

پھر کہا اور اپنے آپ ہی سے کہا:

سوچ لو انجام بھی اس عشق کا　　چن دیئے جاؤ گے پھر یادوں کے بیچ

یہ شعر پڑھ کر میں نے سوچا کون سی یادوں کے بیچ؟ پھر خیال آیا کیا حیدر قریشی اپنے آپ کو انارکلی جیسی سماجی حیثیت میں محسوس کر رہا ہے؟ کیا اس کی محبوبہ اس سے اتنے سماجی فاصلے پر ہے؟ کچھ بھی صورت حال ہو مگر میں جانتا ہوں بعد میں اس کا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا تھا اور وہ واقعی یادوں کی دیواروں میں چُن دیا گیا تھا۔

حیدر قریشی کا مجموعہ "سلگتے خواب" ایک ناکام محبت کی شاعری ہے۔ مگر اس عشق نے حیدر قریشی کی شاعری کو اردو غزل کی ایک منفرد داستان بنا دیا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ اس کے سچے تجربوں کا شعری اظہار ہے۔ اس کی غزل میں اتنا رس ہے کہ بعض اوقات وہ ٹپکتا ہوا نہیں بلکہ ہمارے حواس پر برستا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ابتدائے عشق کی واردات پر مشتمل ایک مسلسل غزل دیکھئے، اس میں سرشاری کی کیفیت ملاحظہ کیجئے۔

دو پرندے چہکتے رہے رات بھر　　اور بھرتے چھلکتے رہے رات بھر

رات کی رانی آئی کہ تم آئے تھے　　دونوں عالم مہکتے رہے رات بھر

سیدھے رستے کو پانے کی دھن میں مگن　　کس طرح ہم بہکتے رہے رات بھر

رات بھر وصل کا چاند چمکا کیا　　دل سمندر ہمکتے رہے رات بھر

حاصلِ عمر ٹھہرے ہیں لمحے وہی　　جن میں حیدرؔ بھٹکتے رہے رات بھر

اسی طرح یہ غزل۔

مرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے　　یہ میری آنکھوں میں کس رُت میں کیسے خواب لگے

نہ پورا سوچ سکوں چھو سکوں نہ پڑھ پاؤں　　کبھی وہ چاند کبھی گل کبھی کتاب لگے

یہ میرے جسم پہ کیسا خمار چھایا ہے　　تمھارے جسم میں شامل مجھے شراب لگے

ہمیں تو اچھا ہی لگتا رہے گا وہ حیدرؔ　　بلا سے ہم اسے اچھے لگے خراب لگے

یا پھر ایسے اشعار:　　خود اپنے حسن کے نشے میں چور لگتا ہے

جو سر سے پاؤں تلک رنگ و نور لگتا ہے

حیدرؔ جب اس نے پلکیں اٹھائیں تو یوں لگا

جیسے اتر گیا ہوں شرابوں کی جھیل میں

ایسی عمروں کے پیار تو حیدرؔ　　جسم و جاں سے لگان مانگتے ہیں

تھی کتنے موسموں کی مہک اس کے جسم میں

سانسوں کی تیز آنچ میں ہم بھیگتے رہے

کہتے ہیں محبت کا تجربہ سب سے بڑی خود اعتمادی عطا کرتا ہے حیدر قریشی کے ہاں بھی اظہار کا بیباک لہجہ اسی خود اعتمادی کی دین ہے بلکہ وہ تو یہاں تک کہتا ہے۔

وہ پتھر دل سہی لیکن　　ہمارا بھی یہ دعویٰ ہے

ہمارے لب جنہیں چھو لیں وہ پتھر بول اٹھتے ہیں

بس اس کے بعد ایک کھچاؤ کی سی صورت حال دکھائی دینے لگتی ہے۔

خود اپنے ہونٹوں پہ صدیوں کی پیاس رکھتا ہے

وہ　ایک شخص　　جو مجھ کو اداس رکھتا ہے

حیدر قریشی کی غزل ایک صاحبِ حال شاعر کی غزل ہے۔ اس کے پاس سچے تجربے ہیں۔ زندہ جذبے ہیں اور اپنی بات کہہ دینے کی ہمت ہے، بلکہ ان باتوں سے بڑھ کر یہ کہ اسے فنِ شعر پر گرفت حاصل ہے۔ اس کے جذبے اظہار کی مشقت کے ہاتھوں مارے نہیں جاتے بلکہ پوری تازگی کے ساتھ شعر کا روپ دھارتے ہیں اور کہیں مجروح نہیں ہوتے۔ تخلیقی عمل ان کا رس نچوڑ نہیں دیتا جیسا کہ ہمارے زمانے میں بعض شاعروں کے ساتھ ہو رہا ہے، بلکہ تخلیقی عمل حیدر قریشی کے جذبوں کی آنچ کو تیز کر دیتا ہے، اس کی کیفیت کو دو چند کر دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا برسوں کا فنی ریاض اس کے شعلۂ تخلیق کو ہوا دینے کے کام آ رہا ہے اور یہ ایک بہت بڑی بات ہے، یہ باتیں میں اسلئے یہاں کہہ رہا ہوں کے اب آگے اس مضمون میں آنے والی مثالیں اب تک کی مثالوں سے اپنی کیفیت کے اعتبار سے بہت مختلف ہیں۔ یوں بھی

پھر کیا رہا جو وصل کی حسرت نکل گئی

تاہم پیش آمدہ صورت حال میرے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتی ہے سوال تو یہ ہے کہ شاعر نے کس کس طرح سے اسے اپنی غزل میں سجایا ہے۔

حیدرقریشی کی غزلوں میں ۔۔۔اور ساری غزلوں میں تعلق کی ایک نئی صورت دکھائی دیتی ہے جو نہ تو ترک تعلق کہلا سکتی ہے نہ ہی بے تعلقی اور نہ ہی اسے تعلق کا کوئی نام دیا جا سکتا ہے عجیب گومگو کی سی حالت ہے جو حقیقی زندگی کے بہت قریب لگتی ہے۔

عجیب طور طریقے ہیں اس کے بھی حیدرؔ
وہ مجھ سے پیار تو کرتا ہے پر نہیں کرتا

خواہش وصال یار کی زندہ ہے آج بھی   لیکن یہ پہلے جیسی جواں بھی نہیں رہی
اس کے لبوں پہ میری محبت کے واسطے   انکار بھی نہیں تھا تو ہاں بھی نہیں رہی
رسم وفا تو اگلے زمانوں کی بات ہے   اب اپنے بیچ رسم جہاں بھی نہیں رہی

وصال و ہجر یک جا کر دیئے ہیں   عجیب اب کے ستم ڈھانے لگے ہو

تمہارے عشق میں کس کس طرح خراب ہوئے
رہا نہ عالمِ ہجراں   نہ وصل یاب ہوئے

حیدرقریشی کی غزل میں عشق ایک مسئلے کی شکل میں دکھائی دیتا ہے جو حل نہیں ہوتا بلکہ مسلسل الجھتا چلا جاتا ہے۔یہ حقیقی زندگی سے بہت قریب لگتا ہے۔یہ برائے بیت نہیں جیسا کہ اکثر شاعروں کے ہاں ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ بلکہ میں یہاں بار بار اس کے لہجے کی سچائی کو بطور گواہ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ لفظ جھوٹ بول سکتے ہیں مگر لہجہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔حیدر قریشی کے لہجے میں ایک نا قابل تردید سچائی ہے۔ایک حقیقی دکھ،ایک سچا کرب،جو کسی المناک تجربے کے نتیجے ہی میں ملتا ہے۔حیدر قریشی کی غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے تجربے کے ذریعے جو کچھ بھی حاصل کیا ہے اسے بڑی کامیابی سے غزل کی زبان میں کہہ دیا ہے!!

اس بدلتی ہوئی واقعاتی صورتوں کی کتنی عمدہ تصویریں اس کے ان اشعار میں ملتی ہیں۔وہ ایک جذباتی آدمی ہے اس لئے عشق میں پگھلنے کی حالت کو نہیں پہنچا۔ بلکہ وہی جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں۔"ٹٹ گئی تڑک کر کے" کی آواز سنائی دینے لگتی ہے۔

سخت پتھر سہی تمہارا دل
لیکن اس پر لکیر بھی ہم ہیں

جو منہ سے بنتا ہے منکر مرا   اسے کہہ دو
کہ حوصلہ ہے تو دل سے بھی منحرف ہو جائے

جو اس کے وصل کے حقدار ٹھہرے اور تھے حیدرؔ   ہمیں تو صرف اس کے عشق میں بدنام ہونا تھا

پھر ایک ایسی صورت جب جہاز کنارے کی چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتا ہے اور مسافر تیر کر کنارے لگنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اب حمد و نعت لکھ کے کماؤں گا کچھ ثواب
وہ کھو گیا جو میری غزل کا غزال ہے

یہ عشق وشق یہ ساری محبتیں حیدرؔ
مجھے تو سب ترے دل کا فتور لگتا ہے

چھوڑ گئے سب تجھ کو تیری غزلوں والے لوگ
میرے شاعر سب کے دکھ اب تنہا بیٹھا بھوگ

بس اب تو خاک اور راکھ باقی بچی ہوئی ہے
کہ اب نہ رسی، نہ کوئی رسی کا بل رہا ہے

"سلگتے خواب" کی شاعری حیدر قریشی کے مزاج کی آئینہ دار ہے۔اس شاعری کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ حیدر قریشی کا مسئلہ کیا ہے؟ اور وہ غزلیں کیوں کہہ رہا ہے؟ ان سوالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو حیدر قریشی ایک ایسا شاعر ہے جس کی شاعری سچ بولتی ہے اور اپنے جذباتی مسائل کے حوالے سے اپنی پہچان کرواتی ہے۔۔اس کے مسائل اس کے حقیقی مسائل ہیں اور ان مسائل کو شعری لباس پہنا کر اس نے جدید غزل میں اضافہ کیا ہے۔یوں اس کا شمار آج کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔وہ بے حد اوریجنل ہے۔اس لئے اردو کی جدید غزل کو حیدر قریشی جیسے شاعروں کی بہت ضرورت ہے جو اپنے منفرد تجربوں اور نفسی وارداتوں کے ذریعے اس کے دامن پر جذبوں کے نئے نئے چاند سورج سجاتے جائیں!!

حیدرقریشی پسِ غزل

ڈاکٹرانورسدید

حیدرقریشی اوراس کی شاعری کا تذکرہ کرنے سے پہلے دو باتوں کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے۔اولاً یہ کہ حیدرقریشی کا شمار نسبتاً نئے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ثانیاً یہ کہ حیدرقریشی کا مشاہدہ اور تخلیقی انداز ادب کے مستند مراکز سے اکتساب نہیں ہوا بلکہ وہ اپنی ادبی تربیت بڑے بڑے شہروں سے دور رہ کر مکمل کر رہا ہے اور اب کچھ عرصے سے اپنے نزول اور ہرے تجربے کو غزل کے پیکر میں ڈھالنے کی مقدور بھر کوشش کر رہا ہے۔متذکرہ بالا دونوں باتوں کو میں حیدر قریشی کی خوبیوں میں شمار کرتا ہوں اوراسے سمجھنے کے لیے ان سے معاونت حاصل کرتا ہوں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہر پرانا لکھنے والا کسی نہ کسی دور میں نئے لکھنے والوں کی صف میں ہی کھڑا ہوتا ہے۔پھر جیسے جیسے پرانے خطوط مٹتے ہیں نئے خطوط نمایاں ہو کر اپنی شخصیت کا نقش ابھارنے لگتے ہیں۔مولانا الطاف حسین حالی نے اپنے دیوان میں ایک نظم اسی اصول کو سمجھانے کے لیے شامل کی اور تا حال اس کی صداقت کو کسی نے چیلنج نہیں کیا۔حیدر قریشی کے ہاں یہ حقیقت متذکرہ اصول کے مطابق عمل میں نہیں آئی۔بلا شبہ اس نے پرانے خطوط کے مٹنے کا انتظار نہیں کیا تاہم اس نے نمایاں ہونے کے لیے کوئی غیر فطری طریقہ اختیار نہیں کیا اور بڑے خطوں کو ریگمار سے کھر چنے اور انہیں معدوم کرنے کی حرکت بھی نہیں کی۔اس کے برعکس حیدرقریشی نے اپنے تجربے کو لفظوں کی نئی بنت میں کچھ اس انداز میں ڈھالا کہ پرانے لکھنے والے حیدرقریشی کی جوانی میں ہی اس کی طرف دیکھنے لگے اور اب تو کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ حیدر قریشی کی شعری شخصیت کے خدوخال عین عالم شباب میں نکھرتے جا رہے ہیں اور پرانے لکھنے والے اس کی انگلی پکڑ کر اپنی صفوں میں بٹھانے کی خواہش کر رہے ہیں۔

حیدرقریشی چونکہ خانپور اور رحیم یار خان کے دور افتادہ مقامات سے تعلق رکھتا ہے اس

لئے بظاہر اسے ادب کے مرکزی دھارے سے کٹ جانے کا نقصان پہنچنا چاہیے تھا۔لیکن شاعر تو تلمیذ الرحمان ہوتا ہے اور وہ صرف اشخاص اور کتب سے ہی اکتساب نہیں کرتا بلکہ فطرت سے بھی رہنمائی حاصل کرتا ہے۔اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خانپور کا کھلا آسمان، ستاروں کی جھلملاتی روشنیاں، اڑتے ہوئے بادلوں کے پیکر، سورج کی نرم اور گرم شعاعیں حیدرقریشی سے کسی کتابی واسطے کے بغیر متعارف ہوئیں اوراس نے ان سے جی کھول کر فیض حاصل کرنے کی سعی کی۔حیدر قریشی کو اس دور افتادگی کا بالواسطہ اور بلا واسطہ فائدہ یہ پہنچا کہ اس کے تجربے اور مشاہدے نے براہ راست فطرت کی آغوش میں آنکھ کھولی اوراس کی صداقت شہر کی غلاظت سے آلودہ نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس کے ہاں زمانے کی ضرورت اہم نظر نہیں آتی بلکہ جذبے کی لطافت اہمیت رکھتی ہے۔وہ ان کیفیتوں کو اجاگر کرنے کا آرزومند ہے جن کا کوئی نام اور کوئی عنوان نہیں۔یوں حیدرقریشی اپنے ذاتی نام سے غزل کا جو پیکر مرتب کر رہا ہے اس میں قدیم کو جدید کے ساتھ ملانے کی کاوش تو نظر آتی ہے تاہم یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ وہ رائج الوقت غزل سے الگ بھی اپنی پہچان کروانے کی سعی کر رہا ہے۔بلا شبہ حیدرقریشی فی الحال فن کے منجدھار میں مسلسل ہچکولے کھا رہا ہے لیکن اس کا جذبہ چونکہ صادق ہے اور وہ فن کی قربان گاہ پر مسلسل بلیدان پیش کر رہا ہے اس لیے مجھے اس کے مستقبل سے مایوسی نہیں۔

اک ایک لفظ ہو گیا ہو بانجھ جس طرح سوکھے ہیں یوں معانی کتابوں کی جھیل میں

شب بھر اتارتے رہے پلکوں پہ چاندنی تم بوند بوند روشنی میں ڈوبتے رہے

اب وہ بھی مجھے شعبدے لفظوں کے دکھائے وہ جو مری خاموش محبت کی صدا تھا

ذہن پر جب تری یادوں کی گھٹائیں اتریں گنگناتے ہوئے ساون کی صدائیں اتریں

وہ خود فریبی کے لمحے گزر چکے ہوں گے کہ خواب سوکھ کے اب تک بکھر چکے ہوں گے

برہنہ رنگ لئے خوشبوؤں کے ہاتھوں پر بدن ہواؤں کے برسات میں نہائیں گے

نجانے کب سے مجھے جھانکتا ہی رہتا ہے۔۔۔کسی کا چہرہ مری سوچ کے دریچے میں

ہر شعر درختوں کی گھنی چھاؤں کا پیکر۔۔۔اب کے ہیں گھنے کتنے خیالات کے جنگل

کترائے وہ کبھی تو کبھی میں جھجک گیا۔۔۔اک بھی کنول کھلا نہ حجابوں کی جھیل میں

تھی کتنے موسموں کی مہک اس کے جسم میں۔۔۔سانسوں کی تیز آنچ میں ہم بھیگتے رہے

حیدرقریشی کی غزل نے بیسویں صدی کے ربع آخر میں آنکھ کھولی۔اس لیے آوازوں کے جنگل میں کھو جانے کی بجائے اس نے جنگل کے درختوں کی گھنی چھاؤں سے آسودگی حاصل کرنے کی آرزو کی ہے۔اس نے ایسے لفظ لکھنے کی کوشش نہیں کی جو سب کے دل میں موجود تھے بلکہ جب اس نے غزل کی پرخارواری میں قدم رکھا تو وہ آبلہ پا آگے بڑھا،اپنی انفرادیت کوتحفظ دیا اور اپنی غزل میں صرف ان لفظوں کو سمویا جو اس کے بطون میں جذباتی کہرام بپا کر رہے تھے اور باہر آنے کے لیے بے تاب تھے۔یہ الگ بات ہے کہ حیدرقریشی اپنے عصر کی حسیت سے بھی واقف تھا۔ چنانچہ جب یہ لاوا تخلیقی عمل کی پرپیچ راہ سے گزر کر شعر کی صورت میں برآمد ہوا تو اس میں نہ صرف غم جاناں اور غم دوراں کی جھلک نظر آئی بلکہ اس میں موجودہ دور کے انسان کی جھلک بھی دکھائی دینے لگی۔

ہر چہرے پہ تھی ثبت شناسائی کی تحریر۔۔۔میں اجنبی لوگوں کے قبیلے میں گھرا تھا

وہ اپنی سوچ پہ گہری اداسیاں لکھ کر۔۔۔کچھ اپنے آپ سے سمجھوتہ کر چکے ہوں گے

عجیب لوگ ہیں بے چہرہ شہر کے حیدرؔ۔۔۔یہ تیری بات کے تیور سمجھ نہ پائیں گے

وہ جب خلوص کی قیمت چکانے آیا ہے۔۔۔تو میرے ذہن میں بھی رنگِ تاجری بھر دو

آپ نے دیکھا کہ حیدرقریشی کے لہجے میں سوز ہے لیکن اس میں زہرناکی بھی نمایاں ہے۔اس کے ہاں صداقتوں نے نسبتاً واضح انداز میں جھلک دکھائی ہے اور ان پر ماضی اور حال کے علاوہ مستقبل کی مہر بھی لگی ہوئی نظر آتی ہے۔ان صداقتوں کی حیثیت دوامی ہے۔ان کا زہر سقراط نے بھی پیا تھا اور اسی زہر کو حیدرقریشی بھی قطرہ قطرہ اپنے دل میں اتار رہا ہے۔ایک اور بات یہ کہ حیدرقریشی چونکہ ذاتی جذبے کو اہمیت دیتا ہے اس لئے اس کے ہاں ایک مخصوص قسم کی مانوس اداسی بھی جنم لیتی ہے۔ایک ایسی اداسی جو سرما کی چاندنی راتوں میں شبنم بن کر اترتی ہے اور پھر بے اختیار آنسو بن کر پلکوں پر آویزاں ہو جاتی ہے۔خودفریبی کی شکست کا یہی وہ لمحہ ہے جب حیدرقریشی کے خواب بکھر جاتے ہیں۔جسم کا رنگ دھنک کے رنگوں میں تحلیل ہو جاتا ہے اور زمانے کی روشنیاں اندھے شہر کی تاریکیوں میں گم ہو جاتی ہیں۔تاہم حیدرقریشی کا قول ہے کہ ؎

سمندروں کی طرح جو ازل سے پیاسے تھے۔۔۔خود اپنی پیاس میں جل کر نکھر چکے ہوں گے

برستے رنگ نگاہوں میں بھر کے لایا ہوں۔۔۔سلگتے خواب بجھانے بھی خود ہی آیا ہوں

اس لئے اس کے ہاں بے چارگی اور مایوسی کی نہایت پیدا نہیں ہوتی اور وہ خود میں اعتماد اور یقین کی دولت بے دریغ تقسیم کرنے لگتا ہے۔

حیدرقریشی ریاض فن کی اوّلین منزل پر ہے۔اس کے باوجود اس کے ہاں شعر کی مخصوص سہل ممتنع کیفیت فطری انداز میں ابھرتی ہے۔چنانچہ وہ کیفیت جو خواب اور حقیقت کے سنگم پر پیدا ہوتی ہے،جب بے ساختہ اور اچانک سامنے آجاتی ہے تو اندھیرے کے دبیز پردے سے روشنی کا دھارا بہہ نکلتا ہے اور قاری نہ صرف اس میں بھیگ جانے کی آرزو کرتا ہے بلکہ عرصے تک اس میں شرابور رہنا چاہتا ہے۔

جو اپنی ذات میں سمٹا ہوا تھا　　　سمندر کی طرح پھیلا ہوا تھا

چند لمحے وہ ان سے ملاقات کے　　　میری سانسوں میں برسوں مہکتے رہے

اپنی آنکھوں کی چاندنی لے کر　　　میرے خوابوں میں سو رہا تھا وہ

ہم تشنگی میں ڈوبے ہوئے دیکھتے رہے۔۔۔ٹھنڈی ہوا سے کھیلتے بادل گزر گئے

میں سمجھتا ہوں کہ یہاں بھی حیدرقریشی کو اس کی دورافتادگی نے ہی سہارا دیا ہے۔وہ مزاجاً اور طبعاً دیہات کا شاعر ہے اور شہر کے آداب معاشرت سے کچھ زیادہ واقف نہیں۔شہر کو ایک مخصوص رنگ میں دیکھنے اور اسے کردار بنا کر پیش کرنے کے باوجود حیدرقریشی نے اسکی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہیں دیکھا۔ بلا شبہ وہ مسرت اور غم ،طمانیت قلب اور بے اطمینانی،تسکین اور تشویش اور اضطراب غرضیکہ ہر مثبت اور منفی جذبے کو محسوس کرتا ہے لیکن انہیں تہذیب کی درانتی سے کاٹنے اور اس پر شہریت کا غازہ ملنے کی کوشش نہیں کرتا۔حیدرقریشی تو آرائشی نقش ونگار پیدا کئے بغیر شعر کا داخلی اور خارجی حسن ابھارتا ہے۔شاید اس کی سادگی ہی اس کا حسن ہے۔شاید اس کی خود روئیدگی ہی اس کا وقار ہے۔چنانچہ دیکھئے کہ اس کی پراعتماد آواز قاری کا تعاقب کرتی ہے اور اسے دعوت دیتی ہے کہ وہ مڑ کر دیکھے اور اس آواز پر لپک کر پتھر ہو جائے۔

حیدرقریشی ایک نیا شاعر ہے۔اس کی ادبی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں۔وہ ادب کے ثقہ مراکز سے دور اپنی قندیل غزل روشن کر رہا ہے۔پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہاں اتنی تاب ضرور ہے کہ وہ آپ کو اپنی طرف متوجہ کرا سکے۔نئی اردو غزل میں اس سادہ مزاج اور سادہ دل شاعر کا خیر مقدم میرا فرض ہے۔اور مجھے یقین ہے کہ فن کے مسلسل ریاض سے حیدرقریشی اردو

شاعری کو چند ایسی غزلیں ضرور عطا کرے گا جن سے ادب کی تاریخ میں حیدر قریشی کا نام بھی محفوظ ہو جائے گا۔ میں اس روز سعید کو دیکھنے کا آرزو مند ہوں جب حیدر قریشی کے تمام ممکنات کھل کر سامنے آجائیں گے۔☆☆☆☆

نوٹ: یہ مضمون ۱۰رجون ۱۹۷۹ء کو لکھا گیا تھا اور پہلے روزنامہ امروز ملتان کے ادبی ایڈیشن میں اور پھر ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور کے ۱۹۸۰ء کے کسی شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کی ایک افادیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے حیدر قریشی کے بعض ایسے اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں جو اب ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں۔**نذر خلیق**)

حیدرقریشی کی ایک نظم: سرسوں کا کھیت

یہ بے اَنت میدان
میدان میں کیاریاں
ہر کیاری میں ہریالیوں کی قطاریں
یہ پودوں کی ہریالیاں اپنی ساری نمو
پیلے پھولوں کو دے کر
انہیں اپنے سر پر سجائے ہوئے جھومتی ہیں
یہ ہریالیاں، یہ خوشی اور مسرت کے پیکر
مگر پیلے پھول ان پہ دکھ کا نشاں ہیں
خوشی اور دُکھ کے مِلن کا
انوکھا سماں ہے
یہ بے انت میدان
سرسوں کے سرسبز پودوں سے
پودوں پہ پھولوں سے
غم اور خوشی سے اَٹا ہے
مرے دل کے نزدیک آؤ تو دیکھو یہ میدان کیا ہے!

حیدر قریشی کی شاعری

پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد

غالباً ۱۹۸۰ء کی بات ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید بہاول پور تشریف لائے تھے۔ وہ اپنے اس دورے میں اسلامیہ یونیورسٹی کے ریلوے کیمپس کے سٹاف روم بھی آئے اور طلبا و طالبات کے ساتھ ساتھ اساتذہ کرام سے بھی ملاقات اور گفتگو کی۔ اس نشست میں حیدر قریشی بھی شامل تھے اور یہ اُن سے میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اسی زمانے میں پتا چلا کہ حیدر قریشی نے ایک ادبی جریدہ جاری کر رکھا ہے نیز انہوں نے بہاولپور میں ایک ادبی تنظیم بھی قائم کی ہے جس کے فعال ارکان میں فرحت نواز پیش پیش تھیں میں ان دنوں اپنے پی ایچ ڈی کی سطح کے تحقیقی کام میں مصروف تھا لہٰذا ان مجالس اور نشستوں میں شرکت نہیں کرتا تھا۔ پھر اچانک حیدر قریشی اور فرحت نواز ادبی منظر سے غائب ہو گئے معلوم ہوا کہ فرحت نواز نے شادی اور لیکچرر شپ کے حصول کے بعد ادبی دنیا کو یکسر تج دیا ہے۔ جبکہ حیدر قریشی جرمنی چلے گئے ہیں۔ بعض ستم ظریف دوستوں کا خیال ہے کہ جس طرح حیدر قریشی کی وجہ سے ایک زمانے میں خان پور اور بہاولپور کا ادبی جمود ٹوٹا تھا بالکل اسی طرح حیدر قریشی کی متحرک شخصیت کے سبب دیوارِ برلن ٹوٹی ہے۔

ممکن ہے کہ میرا حافظہ ساتھ نہ دے رہا ہو لیکن میرا خیال یہی ہے کہ جس حیدر قریشی کو میں نے بیس، اکیس سال پہلے دیکھا تھا، وہ دُبلا نہیں تو فربہ بھی نہیں تھا۔ نیز وہ صرف ایک ادبی رسالے کا مدیر اور ایک غزل گو شاعر تھا جبکہ ۱۹۹۸ء میں اُس کی چھپی ہوئی تصویر دیکھی ہے تو اندازہ ہوا کہ حیدر قریشی نہ صرف جسامت کے اعتبار سے فربہی کی طرف مائل ہے بلکہ شعر اور نثر کے

میدان میں بھی کئی اہم کارنامے انجام دے چکا ہے۔مثلاً تنقید وتحقیق کے حوالے سے اُس کے چار مجموعے آچکے ہیں۔تین کتابوں کا موضوع اردو میں ابھرنے والی نئی صنفِ شعر "ماہیا" سے ہے۔ ایک کا عنوان "عہد ساز شخصیت" ہے اور آخری کتاب کا عنوان "حاصل مطالعہ" ہے (یہ ابھی زیرِ اشاعت ہے)۔ایک کتاب "صنفِ سفر نامہ" سے تعلق رکھتی ہے اور اس کا عنوان "سوئے حجاز" ہے۔یادنگاری کے حوالے سے ایک کتاب کا عنوان "کھٹی میٹھی یادیں" ہے۔نثر ہی میں حیدر قریشی نے افسانے، خاکے اور انشایئے بھی لکھے ہیں۔حیدر قریشی کے افسانوں کے دو مجموعے چھپے ہیں یعنی "روشنی کی بشارت" اور "قصے کہانیاں"۔جبکہ ایک مجموعہ انشائیوں کا ہے اور اس کا عنوان "فاصلے قربتیں" ہے۔خاکوں کے مجموعے کا نام "میری محبتیں" ہے اور عنوان ہی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان خاکوں میں کسی کی پگڑی اچھالی گئی ہے اور نہ ہی کسی پر خاک اُڑائی گئی ہے۔ان چار کتب کو ایک کلیات کی شکل بھی دے دی گئی ہے اور اس مجموعے کا نام "افسانے، خاکے، انشایئے" رکھا گیا ہے۔

حیدر قریشی کے شاعری کے بھی چار مجموعے آچکے ہیں۔پہلا "سلگتے خواب" دوسرا "عمر گریزاں" تیسرا "محبت کے پھول" اور چوتھے کا نام "دعائے دل" ہے پہلے مجموعے میں صرف غزلیں ہیں۔تیسرے میں صرف "ماہیے" ہیں۔چوتھے میں غزلیں اور نظمیں ہیں جبکہ "عمر گریزاں" میں یہ تینوں اصناف یعنی غزلیں، نظمیں اور ماہیے ہیں۔اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حیدر قریشی نے غزل آزاد نظم اور ماہیے کے علاوہ کسی دوسری صنف میں شعر نہیں کہا۔اس کے علاوہ ان چاروں مجموعوں پر مشتمل شاعری کو یکجا کر کے کلیات کی شکل دے دی گئی ہے جس کا نام "غزلیں نظمیں ماہیے" رکھا گیا ہے۔یہ کتاب ۱۹۹۸ء میں پانچ سو کی تعداد میں سرور ادبی اکادمی جرمنی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، کتاب میں شعری اصناف بھی کتاب کے نام کی ترتیب سے رکھی گئی ہیں یعنی سب سے پہلے ۱۴۰ غزلیں پھر ۷۲ نظمیں اور آخر میں ۲۰۰ ماہیے۔لیکن مشکل یہ ہے کہ ان غزلوں کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں کیا جاسکتا کہ کون سی غزل اُن کے کس مجموعے میں شامل تھی اور کون سی نئی ہے۔یہی کیفیت آزاد نظموں اور ماہیوں کی بھی ہے۔اگر آئندہ اشاعت میں یہ اہتمام بھی کر دیا جائے تو عام قاری اور مستقبل کے نقاد اور محقق کے لئے آسانی ہو جائے گی۔بصورت دیگر حیدر قریشی کے مختصر سے دیباچے بعنوان

"عرضِ حال" کی یہ تحریر مہمل اور بے معنی سی لگتی ہے جس میں حیدر قریشی نے اپنی شاعری کے ادوار بناتے ہوئے لکھا ہے۔

> "میری دانست میں میری غزل گوئی کے چار ادوار ہیں ابتدائی دور جب میں نے روائتی غزل کے انداز میں غزلیں کہیں۔۔۔۔۔۔۔۔دوسرا دور انتہا پسند جدیدیت کے زیر اثر تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تیسرا دور انتہا پسند جدیدیت کے اثر سے نکلنے کا دور تھا۔۔۔۔۔۔۔۔میری غزل گوئی کا چوتھا دور دراصل سابقہ تینوں ادوار کے مثبت اثرات سے مل کر بنا ہے۔" (حیدر قریشی، "غزلیں نظمیں ماہیے"، عرضِ حال، ص ۷-۸، سرور اکادمی جرمنی ۱۹۹۸ء)

"غزلیں نظمیں ماہیے" میں نہ تو کوئی ادوار بنائے گئے ہیں اور نہ ہی کوئی ایسا نشان دیا گیا ہے جس سے اندازہ ہو سکے کہ یہ غزل، نظم، یا ماہیا کس دور اور کس مجموعے سے تعلق رکھتا ہے بصورت دیگر حیدر قریشی کی شاعری کے ساتھ ساتھ اُن کی فکر اور فن کے ارتقاء کی کہانی بھی سامنے آجاتی اور خود حیدر قریشی کی سوانح عمری بھی مکمل کی جاسکتی تھی۔

اُردو شاعری کے بہت سے شعراء کے شعروں سے اُن کی زندگی کے اہم واقعات کا سراغ مل سکتا ہے لیکن میری دانست میں حیدر قریشی اردو کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے اپنے بارے میں اپنی شاعری ہی میں بہت کچھ بتا دیا ہے اتنا کچھ کہ اگر کوشش کی جائے تو اُن کی ایک مکمل سوانح عمری مرتب کی جاسکتی ہے۔مثلاً اپنے شعری اسلوب کے حوالے سے حیدر قریشی بتا دیتے ہیں کہ اگرچہ انہوں نے اردو شعر ونثر کو اپنایا ہوا ہے لیکن اُن کا تعلق سرائیکی علاقے اور سرائیکی خاندان سے ہے ورنہ یہ الفاظ اُن کی شاعری کا حصہ نہیں بن سکتے تھے۔شعر اور الفاظ دیکھئے۔

ع اک خواب ہے جندڑی کا (غزلیں، نظمیں، ماہیے ص ۳۴۵)

ع ہم نے بھوگا ہے صرف اسے حیدر (ص۲۴۳)

ع اب ڈبوتا ہے چاہے تارتا ہے (ص۲۰۸)

ع جو فقیروں کو طعنے مارتا ہے (ص۲۰۸)

ع ریت سے گھر کون اُسارتا ہے (ص۲۰۹)

میں اقبالیات کے ایک معمولی طالب علم کے طور پر اس تنازعے کی جزئیات سے بڑی حد تک واقف ہوں جو اقبال کی تاریخ و سال پیدائش کے حوالے سے اہل علم میں رہا ہے۔ اسی طرح مجھے معلوم ہے کہ مولانا غلام رسول مہر پر پی ایچ ڈی کی سطح کا تحقیقی کام کرتے ہوئے خود مجھے کس قدر مشقت کرنا پڑی تھی لیکن حیدر قریشی اپنی شاعری میں ایسے اشارے دے جاتے ہیں کہ حیدر قریشی کا تفصیلی کوائف نامہ دیکھے بغیر بہت سی باتیں سامنے آجاتی ہیں مثلاً وہ بتا دیتے ہیں کہ امکانی طور پر اُن کا ماہِ پیدائش کیا ہوسکتا ہے؟ اس حوالے سے اُن کی نظم "عجیب دشمن" کا ایک بند دیکھیے۔

"ہمارے برُج
جدی اور جوزا ابھی پھر اُن کے دائرے میں آ گئے
جدی کی جوزا سے جوازلی کشمکش ہے" (ص۲۹۳)

گویا حیدر قریشی کا برج یا جدی ہے یا جوزا۔ اس طرح بہت آسانی سے حیدر قریشی کے ماہِ پیدائش تک پہنچا جاسکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی غزلوں، نظموں اور ماہیوں میں اپنے افرادِ خانہ کے بارے میں اہم معلومات فراہم کر دی ہیں مثلاً یہاں تک معلوم ہو جاتا ہے کہ حیدر قریشی کے اپنے بھائیوں کے ساتھ تعلقات کس نوعیت کے تھے؟
حیدر قریشی اپنے شعروں میں کہتے ہیں۔

ے یہ کیسی وقت کی آندھی بدن پہ آئی ہے
کہ پھول پتے تو کیا میری ڈالیاں بھی گئیں (ص۱۵۹)

ے میں نے اپنی دیانت کی سب دولتیں اپنی اولاد کو دیں فقط
اور باقی عزیزوں کو صرف اور صرف اپنے حصے کا گھر لکھ دیا (ص۱۷۲)

پہلے دو اشعار میں قرینے تو ہیں اس کے باوجود بھائیوں کے وجود تک پہنچنے میں ذرا مشکل پیش آتی ہے لیکن درج ذیل شعر میں مولانا حالی اور حفیظ جالندھری کے اثرات کے حوالے سے بات بالکل واضح ہوجاتی ہے۔

ے احباب کے تیروں کے تو ہم عادی تھے حیدر
اس بار مگر بھائی تھے احباب نہیں تھے (ص۱۴۷)

معلوم ہے کہ ۱۹۷۳ء میں ملک بھر میں شدید سیلاب آیا تھا۔ دوسرے شہروں کے ساتھ ساتھ حیدر قریشی کا شہر خان پور کٹورہ بھی سیلاب سے بے حد متاثر ہوا۔ کہتے ہیں کہ سیلاب کا پانی گھروں کے روشن دانوں سے بھی اوپر پہنچ گیا تھا۔ یہ تجربہ بھی حیدر قریشی کی ایک غزل میں بہت خوبصورتی سے آیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ے سامنے ہے گھر مگر مفقود گھر کے راستے
کھو گئے آخر کہاں معبود گھر کے راستے

ے دشتِ حیرت میں کھڑا ہوں، چشمِ حیرت وا کیے
ہیں ابھی غائب، ابھی موجود گھر کے راستے

ے ابرِ رحمت اب کے حیدر بن گیا جیسے عذاب
کر دیئے برسات نے مسدود گھر کے راستے (ص۶۳۔۶۲)

حیدر قریشی عربی النسل ہیں۔ یہ چیز اُن کی غزلوں اور نظموں میں بڑی وضاحت سے سامنے آتی ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں۔

ے قریشِ مکہ میں ہو یا مدینہ والوں میں
فقیر نسبتِ ارضِ حجاز رکھتا ہے (ص۱۷۶)

"الٰہی

کعبۂ دل کی طرف نظرِ کرم فرما
کہ اس پر ابرہہ اک لشکرِ جرار لے کر چڑھتا آتا ہے
یہ ہاتھی والے اپنی نوکلیسیائی عظمت کے لیے
اس کعبۂ دل کو بڑا خطرہ سمجھتے ہیں

سواس کوایک ہی ریلے میں
اب پامال کرنے پر تلے
چڑھتے ہی آتے ہیں
ادھر میں ابنِ عبدالمطلب بھی، اپنے بابا کی طرح
اس لشکرِ جرار سے لڑنے کی طاقت ہی نہیں پاتا"
(نظم دعا کا پہلا بند،ص ۳۱۸)

اگر اس سلسلے میں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو حیدر قریشی اپنے خاندان کے بارے میں اس کے مختلف مقامات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہمارا سلسلہ بغداد سے، عرب سے ہے
اوراُس کا سلسلہ چنگیز کے نسب سے ہے (ص ۲۵۰)

جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ حیدر قریشی کا آبائی گھر خان پور ضلع رحیم یار خان میں ہے۔خان پور سے لیاقت پور کی طرف جاتے ہوئے چند میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ جیٹھہ بھٹہ واقع ہے جہاں جئ سنز والوں کی شوگر ملز تھی۔ جسے اب شہباز شریف گروپ نے خرید لیا ہے اور اس کا نام "حمزہ شوگر ملز" ہو گیا ہے۔حیدر قریشی اس کارخانے میں ملازم تھے۔اس حوالے سے دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

عشق اور نوکری مل کے دونوں چوس گئے ہیں تجھ کو
تو تو بس اب ایسے ہے جیسے گنے کا پھوگ (ص ۱۲۳)

جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے
میرے نصیب میں چینی کا رخانہ تھا (ص ۱۴۳)

اس نوکری نے واقعتاً حیدر قریشی کی زندگی میں زہر گھول رکھا تھا اور کیوں نہ ہوتا کہ ایک طرف حیدر قریشی کا ادبی رجحان اور مزاج جبکہ دوسری طرف یہ غیر شاعرانہ ملازمت۔یہ زہر نا کی بھی اُن کے بہت سے اشعار میں کھل کر بولتی ہے۔

رزق کی تنگی، عشق کا روگ اور لوگ منافق سارے

آؤ ایسے شہر سے حیدر شہر بدر ہو جائیں (ص ۵۹)

اپنا نہیں تو بچوں کا احساس کر ذرا
حیدر ادب کو چھوڑ کہ فکرِ معاش کر (ص ۱۱۲)

یہ دل تو محبت ہی محبت تھا سدا سے
لہجے میں یہ تلخی میرے حالات سے آئی (ص ۱۷۹)

چینی کے کارخانے میں نامناسب حالاتِ کار ہوں تو انسان کئی طرح کے عوارض کا شکار ہو جاتا ہے سب سے زیادہ خطرہ ذیابیطس کا ہوتا ہے اور آخر کو یہ مرض حیدر قریشی کو لاحق ہو گیا۔حیدر قریشی کہتے ہیں۔

روکھے پھیکے پن کی اب عادت بنانی ہے ہمیں
اتنے میٹھے ہو گئے تھے ہم کہ شوگر ہو گئی (ص ۲۱۸)

اسی زمانے میں حیدر قریشی کے لئے ملکی حالات ناموافق ہو گئے اور انہیں ملک سے باہر جانے کا موقع مل گیا۔وہ چلے گئے لیکن کہاں؟۔۔اس کا اندازہ بھی اُن کی شاعری ہی سے ہو جاتا ہے۔وہ دھرتی ماں کے فیضان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جرمن احسانات سبھی برحق حیدر
فیض مگر کچھ اور ہی دھرتی ماں کے تھے (ص ۲۰۳)

جرمن اور جرمنی کا ذکر آئے تو بہت سے لوگوں کی توجہ ہٹلر اور جنگِ عظیم اول و دوّم کی طرف مبذول ہو جاتی ہے لیکن اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے ذہن میں اردو کے عظیم شاعر مجید امجد اور اُن کی شاعری میں آنے والی ایک جرمن نژاد سیاح لڑکی "شالاط" کی تصویر بھی گھومنے لگتی ہے جس کی وجہ سے مجید امجد نے ساہیوال سے کوئٹہ تک کا سفر اختیار کیا تھا۔معلوم ہوتا ہے کہ حیدر قریشی کو بھی جرمنی میں ایک "شالاط" مل گئی تھی۔اس حوالے سے حیدر قریشی کی نظم "نئی شالاط" دیکھیے۔

"وہ شہد اور زہر میں گوندھے ہوئے

سوئے ہوئے سارے زمانے جاگ اُٹھے ہیں
ہماری داستاں تو داستاں در داستاں کا سلسلہ سا ہے
مگر اس بار لگتا ہے کہانی ہی نرالی ہے
نہ اب وہ آریاؤں کے ہلاکت خیز حملے ہیں
نہ دشتِ قیس ہے، نئے خسرو پرویز کے حیلے
نہ اب تھل کا سفر درپیش، نئے تختِ ہزارہ ہے
نہ اب گجرات کی جانب رواں جانِ بخارا ہے
فقط میں ہوں
فقط میں ہوں اکیلا، تنہا اپنے آپ سے بچھڑا ہوا
پھر بھی تمہاری سادگی کے حسن میں یکجا ہوئے جاتے ہیں
لیلیٰ، شیریں، سسی، ہیر اور سوہنی کے سب جلوے
تمہاری آریائی روح جیسے سرزمینِ دل پہ پیہم حملہ آور ہے
مگر یہ کیسے حملے ہیں
مسیحائی کی بھی تاثیر رکھتے ہیں
یہیں تک ہوتا گر قصہ تو پھر بھی دل کے بچنے کی کوئی تدبیر
ممکن تھی
مگر اب کے ستم یہ ہے
کہ میں اردو کا اک ٹوٹا ہوا شاعر بھی ہوں جاناں
جو المانی زمیں تک جانے کیسے آن پہنچا ہوں
جو تم تک آن پہنچا ہوں" (ص۳۱۶-۱۷)

حیدر قریشی کی شاعری کے ذریعے اُن کی سیاسی وابستگیوں کا واضح اظہار بھی ہو جاتا ہے۔ گزشتہ تیس بتیس برسوں سے ہمارا ملک اور معاشرہ بھٹو اور اینٹی بھٹو سیاسی قوتوں میں منقسم رہا ہے یہ تقسیم ۱۹۶۷ء میں اُس وقت ہوئی تھی جب ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خاں سے سیاسی وابستگی ختم کر کے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی تھی اور "ہماری معیشت سوشلزم" کا نعرہ لگایا تھا۔ مغربی

پاکستان میں بھٹو نے اسی بنیاد پر الیکشن لڑا اور جیتا۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد بھٹو نے باقی ماندہ ملک کی حکومت سنبھالی۔ ۱۹۷۷ء کا الیکشن بھی اسی نعرے کی بنیاد پر لڑا اور کامیابی حاصل کی۔ لیکن الیکشن میں دھاندلی کے الزام کی وجہ سے اُن کے خلاف تحریک چلی جس کے نتیجہ میں ملک تیسرے مارشل لاء کا شکار ہوا۔ مارشل لاء حکومت نے ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف پہلے سے درج ایک ایف آئی آر کے سبب سے قتل کا مقدمہ چلایا اور بھٹو کو پھانسی دے دی۔ حیدر قریشی سارے عمل میں فوج کے خلاف اور بھٹو کے حامی نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے اُن کے چند ایسے شعر دیکھیے جو نظام کی جبریت اور اُس کے خلاف آواز اُٹھانے کے لیے کہے گئے ہیں۔

؎ شریک تھی یہ چمن کی ہوا بھی سازش میں
اس لیے تو یہاں نفرتوں کے خار اُگے
؎ کوئی مسیح یقیناً پھر آ گیا حیدر
قدم قدم پہ جو پھر سے صلیب و دار اُگے (ص۸۲)

؎ انمول رتن بننے سے بے مول ہی اچھے
سر جبر کی سرکار کے در پر نہیں رکھا (ص۲۱۵)

؎ جبر کے کرب و بلا کی خاک میں رُلتی ہوئی
زندگی بھی حضرتِ زینبؓ کی چادر ہو گئی

؎ جب یزیدِ عصر کے لشکر سے باہر آ گئے
حر سے نسبت اپنی بھی تھوڑی حیدر ہو گئی (ص۲۱۹)

بھٹو کے حوالے سے غزل کے شعروں پر رمز و ایما کے پردے پڑے ہوئے ہیں جبکہ ''۵ جولائی ۱۹۷۷ء'' کے عنوان کے تحت لکھے گئے "ماہیے" اس کی بہترین اور واضح مثال پیش کرتے ہیں۔ چند ماہیے ملاحظہ فرمائیے۔

تھوڑی سی پرانی ہے

انساں کی، طوطا
چشمی کی کہانی ہے (ص ۳۵۱)

گلشن پہ عذاب ہوا
توپ کی طاقت سے
اک گدھ سرخاب ہوا (ص ۳۵۱)

اک باز کو قید کیا
اور پھر قید ہی میں
اس باز کو صید کیا (ص ۳۵۲)

لیکن پھر ۱۷ راگست ۱۹۸۸ء کو جنرل محمد ضیاء الحق ایک ہوائی حادثے میں شہید ہو گئے تو حیدر قریشی نے اپنی شدید نفرت کے اظہار کے لیے درج ذیل "ماہیا" لکھا۔

پھر قصہ ہی پاک ہوا
اک اُڑان میں جب
وہ گدھ بھی ہلاک ہوا (ص ۳۵۳)

یہ تو تھی حیدر قریشی کی ملکی اور عصری سیاست اور اُن کے سیاسی نظریات کی بات جبکہ ہمارے ہاں ایک بڑی اہم چیز ادبی سیاست بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک عرصے سے ہمارے ملک میں دو ادبی گروہ بنے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ احمد ندیم قاسمی کا گروہ ہے اور اسے قاسمی گروپ بھی کہا جاتا ہے۔ جبکہ دوسرے گروپ کے سرخیل ڈاکٹر وزیر آغا رہے ہیں میں نے مضمون کی ابتداء ہی میں بتایا تھا کہ جب ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر وزیر آغا اسلامیہ یونیورسٹی تشریف لائے تھے تو حیدر قریشی بھی اُن کے ساتھ تھے۔ پھر اپنی کتاب "غزلیں، نظمیں، ماہیے" کے "عرضِ حال" میں حیدر قریشی لکھتے ہیں کہ میری غزل کے معروضی رویے کے حوالے سے ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے وغیرہ وغیرہ اس حوالے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ حیدر قریشی کا تعلق پاکستان کے کون سے ادبی گروپ سے ہے۔ اگرچہ حیدر قریشی کی شاعری پر میر تقی میر، غالب، غلام مصطفٰے خاں شیفتہ، حالی،

اقبال، فیض اور حفیظ جالندھری کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں مگر انہوں نے جو بات ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں کہی ہے وہ کسی دوسرے شاعر وادیب کے حوالے سے نہیں کہی حیدر قریشی کہتے ہیں۔

؎ سارے اساتذہ ہیں مجھے محترم مگر
غالبؔ کا معتقد ہوں محبت ہے میرؔ سے

؎ حیدرؔ نئے ادب میں تو گھائل انہیں کا ہوں
رشتہ بہت ہی گہرا ہے آغا وزیر سے (ص ۲۳۱)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حیدر قریشی کی شاعری میں اُن کی زندگی کے اہم واقعات اور اُن کے سیاسی وادبی نظریات گویا سبھی کچھ آ جاتا ہے۔ یہی حیدر قریشی کی انفرادیت ہے ورنہ ہمارے شعرا اپنی شاعری میں اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا پاتے۔

جہاں تک حیدر قریشی کی غزل کا تعلق ہے تو اُس کے بارے میں کئی باتیں بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہیں۔ مثلاً حیدر قریشی کی غزل میں تغزل کا بھرپور رچاؤ ہے۔ یوں تو اب تک مختلف حوالوں سے جو مثالیں پیش کی جا چکی ہیں وہ بھی کافی ہیں لیکن چند شعر اور بھی دیکھیے۔

؎ عجیب کرب وبلا کی ہے رات آنکھوں میں
سسکتی پیاس لبوں پر، فرات آنکھوں میں (ص ۱۹)

؎ بکھر گئے ہیں ملن کے تمام دن حیدرؔ
ٹھہر گئی ہے جدائی کی رات آنکھوں میں (ص ۲۰)

؎ نہ پورا سوچ سکوں، چھو سکوں، نہ پڑھ پاؤں
کبھی وہ چاند، کبھی گل، کبھی کتاب لگے

؎ ہمیں تو اچھا ہی لگتا رہے گا وہ حیدرؔ
بلا سے ہم اُسے اچھے لگے خراب لگے (ص ۲۳)

- تو جس کے لیے خود کو بھلا بیٹھا تھا حیدر
کیا اُس نے بھی بھولے سے تجھے یاد کیا تھا (ص۹۵)

- تماشا سا تماشا ہی بنا ڈالا مجھے اُس نے
کبھی وہ قید کرتا ہے کبھی آزاد کرتا ہے (ص۹۸)

- عجب بے کیف سی ہے زندگی پچھلے مہینے سے
نہ کوئی یاد آتا ہے نہ کوئی یاد کرتا ہے (ص۹۹)

- میں تو اُس کو دیکھ کر رہ جاؤں گا حیرت زدہ
وہ بھی مجھ کو دیکھ کر کچھ سوچتا رہ جائے گا (ص۱۰۱)

- حق اُسی کا ہو گا جو بھی بچ رہا
فیصلہ ہونا ہے شہزادوں کے بیچ

- کھیل کا پانسہ پلٹ جانے کو ہے
شاہ مارا جائے گا پیادوں کے بیچ

- زندگی حیدر بسر ہوتی رہی
جیسے کوئی گیت فریادوں کے بیچ (ص۱۱۵-۱۱۴)

- وہ حساب تو لے گا پر حساب کیا دیں گے
ہم گناہ گاروں کو کب حساب آتا ہے

- لب مُکر گئے لیکن دل نہیں مُکر پایا

جب بھی خواب آتا ہے تیرا خواب آتا ہے (ص۱۲۷-۱۲۶)

- چند لمحے وہ اُن سے ملاقات کے
میری سانسوں میں برسوں مہکتے رہے (ص۱۶۰)

- نظروں سے گر گئے ہو
دل سے اُٹھا رہا ہوں (ص۱۹۰)

اس طرح کے شعروں سے حیدر قریشی کا مجموعہ "غزلیں، نظمیں، ماہیے" جگمگا رہا ہے لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ اس مجموعے میں جہاں کہیں مختصر بحر کی غزلیں نظر آتی ہیں وہ سہل ممتنع کے مرتبے پر فائز نظر آتی ہیں جبکہ طویل بحر میں کہی ہوئی غزلوں کو غالباً حیدر قریشی سنبھال نہیں پاتے کہ بھرتی کے الفاظ کی کثرت اُن کی طویل بحر کی غزلوں اور اشعار کے حسن کو گہنا دیتی ہے۔ ویسے تو حیدر قریشی کی شاعری میں تقریباً تمام صنائع شعری ملتے ہیں لیکن تلمیحات کثرت سے ہیں۔ اس حوالے سے یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ غالب کے ہاں تلمیحات زیادہ تر ایرانی ادبیات سے ماخوذ ہیں اور اقبال کی تلمیحات کا دائرہ اسلام اور اسلامی تاریخ پر محیط ہے لیکن حیدر قریشی ہندی تلمیحات کو بھی کام میں لاتے ہیں چند شعر دیکھیے۔

- تمھارے نام کے ساتھ اپنے نام کا مطلب
وہی جو ہوتا ہے رادھا سے شام کا مطلب (ص۲۱۰)

- پریوں کے جمگھٹے میں جو اِندر بنا رہا
عمرِ عزیز! وہ ترا حیدر کدھر گیا (ص۲۲۱)

"اپنی محبت کے وسیلے سے مجھے
اب آریاؤں کے دلوں پر راج کرنا ہے
سنو اب آریاؤ!" (ص۳۱۰)

"تمھاری آریائی روح جیسے سرزمینِ دل پہ پیہم حملہ آور ہے" (ص۳۱۷)

حیدر قریشی کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محبوب کے لیے صیغہ تانیث استعمال کرتا ہے نیز اپنے لیے جگہ جگہ قلندر اور فقیر کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ دونوں طرح کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے۔

ے — ہم بھی چالاک تھے اور تم بھی جہاں دیدہ تھیں
نیتیں دونوں کی کب دونوں سے پوشیدہ تھیں (ص ۲۴۸)

ے — وہ حیدرؔ بہت بھولی بھالی سی ہے
اُسے تھوڑی تھوڑی سیانی کرو (ص ۲۰۷)

"خلوصِ دل سے جب مجھ کو
بلانے کا ارادہ ہی کرو گی
اپنی شہ رگ سے بھی تم نزدیک پاؤ گی مجھے" (ص ۲۸۶)

ے — فقیر بن گئے تیری محبتوں کے اسیر
مگر مزاج کی وہ بادشاہیاں نہ گئیں (ص ۴۸)

ے — شہرِ غم کے امیر بھی ہم ہیں
اور تیرے فقیر بھی ہم ہیں (ص ۶۸)

ے — ذرا دل کے پتھر کو پانی کرو
فقیروں پہ بھی مہربانی کرو (ص ۲۰۶)

کہیں کہیں قافیے کے ناروا استعمال کے علاوہ حیدر قریشی زبردست غزل کہتے ہیں جو اُن کی منفرد آواز کی وجہ سے انہیں زندہ رکھے گی لیکن غزل کے مقابلے میں حیدر قریشی کی نظم کم بھی ہے اور کمزور بھی البتہ اُن کے ماہیے قابلِ توجہ ہیں۔ خاص طور پر وہ حصہ جس کا عنوان "ایک باغ

میں ملنے والی لڑکی" ہے۔ مشکل صرف وہاں پیش آتی ہے جہاں سہ مصرعی اس صنف میں حیدر قریشی ایک محاورے کو ایک ہی مصرعے میں لانے کی بجائے دو الگ الگ مصرعوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ اس کے باوصف حیدر قریشی کا "ماہیا" ایک الگ مطالعہ کا متقاضی ہے۔

''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' کے بعد کی
حیدر قریشی کی ایک غزل

اک خواب کہ جو آنکھ بھگونے کے لئے ہے
اک یاد کہ سینے میں چبھونے کے لئے ہے
اک زخم کہ سب زخم بھلا ڈالے ہیں جس نے
اک غم کہ جو، تا عمر بلونے کے لئے ہے
اک روح کہ سونا ہے مگر مَیل بھری بھی
اک آگ اسی مَیل کو دھونے کے لئے ہے
آنکھوں میں ابھی دھول سی لمحوں کی جمی ہے
دل میں کوئی سیلاب سا رونے کے لئے ہے
دل کو تو بہت پہلے ہی دھڑکا سا لگا تھا
پانا ترا شاید تجھے کھونے کے لئے ہے
کشتی کا یہ ہچکولہ، یہ ملّاح کا چکّر
کشتی کو نہیں، مجھ کو ڈبونے کے لئے ہے
تقدیر سے لڑ سکتا ہے کوئی کہاں حیدرؔ
وہ حادثہ ہونا ہے جو ہونے کے لئے ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

خواب بُننے والا شاعر

پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی

کسی شاعر کا کلام کئی برسوں کے متغیر افکار و جذبات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ گردش روز وشب اور ظہور ماہ وسال نت نئے حالات کو جنم دیتے ہیں انسانی طباع پر اوضاع واحوال کا اثر نا قابلِ انکار ہے۔ نت نئے ظہور پذیر لمحات میں شاعر کے دل ودماغ پر جو فکر واحساس کی برق متجلی ہوتی ہے، شعر گویا اسی کا ایک تجسیم ہے وہ اپنے لیے کوئی ہدایت نامہ یا منشور مرتب نہیں کرتا اور نہ ہی وہ اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ افکار کی مرتب شدہ فہرست کی پابندی کرے اور ہمیشہ اس کا تکرار کرتا رہے اسی لیے میں کسی سخنور کے کلام میں کسی خاص فکر یا پیغام کی دریافت کو سعئِ رائیگاں سمجھتا ہوں یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جو غالباً یہ سمجھتے ہیں کہ شاعر ایک ہی نشست میں سارا دیوان کہہ ڈالتا ہے یا وہ ایسا پتھر ہوتا ہے جس پر موسموں کی تبدیلی مطلق اثر انداز نہیں ہوتی یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ شاعر سَالہا سال کی پرمحن زندگی میں کتنے دردوغم جمع کرتا ہے تب دیوان بنتا ہے۔

بقول میر: ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ ہم نے صاحب

دردوغم کتنے کیئے جمع تو دیوان کیا

تاہم سوچ میں تبدیلی کے باوجود رویہ عام طور پر بہت زیادہ تبدیل نہیں ہوتا اور شاعر ایک خاص طرح کی ذہنی فضا میں سانس لیتا ہے اس ذہنی فضا اور افتادِ طبع کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم کسی شاعر کے کلام میں فکری وحدت کا سراغ لگا سکتے ہیں۔

حیدر قریشی کو پڑھنے کے بعد یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ خواب دیکھنے والا شاعر ہے۔ وہ خواب تو بے شک دیکھتا ہے مگر اس کا یہ خواب غفلت، نینداور کاہلی سے نہیں بلکہ وژن سے عبارت ہے زندگی میں وژن کی فکری اہمیت مسلّم ہے۔ نپولین نے کہا تھا۔ "تصور ہی دنیا پر حکمرانی کرتا ہے" اگر یہ تصور وخیال نہ ہو آدمی آدمی نہ رہے، میرے نزدیک انسان کی تعریف حیوانِ ناطق نہیں

بلکہ حیوانِ مفکر ہونی چاہیے۔

حیدر قریشی کا خواب خود فراموشی کا نہیں بلکہ آگاہی اور ہوشیاری کا خواب ہے اسی لیے وہ ناآسودہ نظر آتا ہے۔ فارسی کا ایک شاعر کہتا ہے۔

چہ گونہ مردمِ آگاہ شادماں باشد   کہ شادمانی ہرکس بقدرِ غفلت اوست

حیدر قریشی خود بھی اس بات سے آگاہ ہے کہ اس کی شکل یہی آشوب آگاہی ہے اسی لیے وہ کہتا ہے۔

میں اپنے ہونے کے احساس سے ہراساں ہوں

مرے شعور میں کچھ کیفِ بےخودی بھر دو

ایک شاعر ایک فنکار اور ایک فلسفی کی زندگی اسی سے ہے کہ وہ خواب دیکھتا ہے۔ مستقبل کے خواب، خوشحال سماج کے خواب، انسانی قدروں کے احیاء کے خواب، رشتوں کی برقراری واستواری کے خواب، تحسینِ حیات اور تسخیرِ کائنات کے خواب، خواب دیکھنا انسان کا مابہ الامتیاز ہے۔ تاریخ کے تمام اچھے برے واقعات خوابوں ہی کا عکس تھے مستقبل کی تمام تر رعنائیاں اور توانائیاں ان خوابوں کی تعبیر ہوں گی جو ہم اور آپ دیکھتے ہیں۔

حیدر قریشی کے کلام میں ایسے علائم مل جائیں گے جو اداس اور کرب انگیز شب کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ "سلگتے خواب" میں یہ الفاظ اکثر نظر آتے ہیں۔ خواب، رات، آنکھ، جدائی، اشک، عذاب، یاد، دکھ، دعا، آس، رستہ، سفر، منزل، آسمان، زمین، پیاس، چہرہ، روشنی، جادو، اندھیرا، چاند، ستارہ، عشق، خواہش، آندھی، خاموشی، مقدر، آرزو، کھنڈر، سچائی، آئینہ، فاصلے، گھر، زخم، آسیب وغیرہ خواب وخیال سے متعلق حیدر قریشی کے یہ اشعار دیکھئے۔

بھر کے آنکھوں میں سلگتے خواب اس کی یاد کے

مجھ کو سوتے میں بھی حیدرؔ جاگتا رکھا گیا

جاگے ہیں میرے ذہن میں جب بھی ترے خیال خوابوں کے شہر بنتے رہے، ٹوٹتے رہے

کون ہے جو روح میں میری سرایت کر گیا

رات دن کس کے خیالوں میں پڑا رہتا ہوں میں

خوابوں کے جزیرے سے بلاتا ہی رہا وہ
میں اپنے کنارے سے اتر بھی نہ سکا تھا

وہ نام لکھوں تو لفظوں سے خوشبوئیں اٹھیں
وہ دے گیا جو مہکتے ہوئے خیال مجھے

ہمارا خواب تو بے شک ادھورہ گیا حیدؔر
مگر تعبیر کی تو لازماً تکمیل ہونا ہے
جب آنکھیں مند گئیں حیدؔر گھنے اندھیرے میں
تو روشنی کا کوئی خواب ہی جگاتا تھا

سپین کا فلسفی اونا مونو کہتا ہے:

"سچائی دراصل اس وقت سچائی ہوتی ہے جب اسے آرائش اور لفاظی سے آزاد کر دیا گیا ہو"۔ "سلگتے خواب" کی شاعری ایسی ہے جو آرائش اور لفاظی سے آزاد ہے اور اسی لئے وہ سچائی کا جادو جگاتی ہے۔ حیدر قریشی اپنے جذبات کو سچے اور کھرے لفظوں میں بیان کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ حیدر قریشی نے اپنے دکھوں کو سورنگ سے باندھا ہے لیکن خلوص اور چابکدستی کے ساتھ۔

پہلے سے بھی بڑھتے ہیں صرف مسئلے حیدؔر
جھوٹ بولنے سے کب انقلاب آتا ہے

خواب میں پناہ لینے کی وجہ ظاہر ہے کہ ہر حساس اور سیماب پا آدمی کی طرح حیدر قریشی کے دکھ بھی متعدد اور عذاب لاتعداد ہیں۔ اس کی نااطمینانی کی تین وجوہ معلوم ہوتی ہیں۔ فکرِ معاش، عشقِ بتاں، اور یادرفتگاں، بدقسمتی سے اوائل عمری میں اسے نوکری ایک شوگر مل میں ملی جہاں زندگی کا غم اس کے رگ وپے میں سرایت کرتا رہا۔

جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے
مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا

یادرفتگاں میں دوست احباب، عزیز واقارب اور والدین شامل ہیں جو اسے خواب کے کوہ قاف

کی سیر کراتے پھرتے ہیں۔

مرجھا چکے ہیں پھول تری یاد کے مگر
محسوس ہو رہی ہے عجب تازگی مجھے

بچے بڑے ہو جاویں تو والدین کا وجود یورشِ ایام سے ان کو محفوظ رکھنے میں حصار کا کام دیتا ہے۔ حیدر قریشی اس وقت اپنے کو بے سہارا محسوس کرنے لگا جب پہلے اس کے والد اور پھر والدہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

حیدؔر اب اپنی عادتیں، اطوار ٹھیک کر
ابا بھی چل بسے تری ماں بھی نہیں رہی

وہ انسانی رشتوں کی استواری اور اخلاقی قدروں کی پائیداری کو تہذیب کی نشوونما کے لئے ضروری سمجھتا ہے اس ضمن میں حیدر قریشی کے وہ خاکے قابلِ ذکر ہیں۔ جو اس نے اپنے بعض قریبی رشتہ داروں کے بارے میں قلمبند کئے ہیں ماں کو مولانا رومی نے مخلوق کے بجائے "خالق" قرار دیا ہے۔ "خالق است آں گوئیا مخلوق نیست"

حیدر قریشی کہتا ہے۔

یہ ساری روشنی حیدؔر ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس وقمر میں جو نور خاک میں ہے

یہ شعر دیکھ کر ہمیں ابوالعلاء معرّیٰ، اقبال اور گورکی کی یاد آجاتی ہے۔

حیدر قریشی کے یہ اشعار آرائش اور لفاظی کے برعکس سادگی اور سچائی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

عجب بے کیف سی ہے زندگی پچھلے مہینے سے
نہ کوئی یاد آتا ہے نہ کوئی یاد کرتا ہے

شاخِ دل یوں تری یادوں سے ہری رہتی ہے
جیسے میووں سے کوئی ڈال بھری رہتی ہے

بیتی یادیں پرو رہا تھا وہ
لوگ کہتے ہیں رو رہا تھا وہ

کبھی تم چاند سے بڑھ کر تھے حیدؔر
مگر اب خاک ہوتے جا رہے ہو

اس کو آنا ہی نہیں تھا اس محلے کی طرف
ہم سجاتے ہی رہے بے سود گھر کے راستے

فاصلہ سا کچھ ہمارے درمیاں ہونے کو ہے
یعنی تھوڑا فائدہ تھوڑا زیاں ہونے کو ہے

اک سال اس کو بھولنے میں لگ ہی جائے گا
پر یہ بھی سوچ لو کہ ابھی پورا سال ہے

کاربارِ عشق سے مل جائیں گی پھر فرصتیں
چند برسوں تک مرا بیٹا جواں ہونے کو ہے

عشقِ بتاں کے بیان میں حیدر قریشی، غالبؔ کے اس نظریے کا ہم نوا نظر آتا ہے۔ جہاں وہ کہتا ہے۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

حیدر قریشی کا کہنا ہے۔

یہ عشق وِشق یہ ساری محبتیں حیدؔر
مجھے تو سب ترے دل کا فتور لگتا ہے

غالبؔ فکر کا شاعر تھا اس لئے اسے عشق دماغ کا خلل نظر آیا حیدر قریشی جذبہ واحساس کا شاعر ہے اس لئے اسے عشق دل کا فتور لگتا ہے۔

تمہارے عشق میں کس کس طرح خراب ہوئے
رہا نہ عالم ہجراں نہ وصل یاب ہوئے

سوچ لو انجام بھی اس عشق کا   چن دے جاؤ گے پھر یادوں کے بیچ

یہ محبتیں بھی ہیں روگ تو یہ انا بھی جیسے عذاب ہو
اسے پوچھنے بھی نہ جا سکے جو کئی دنوں سے علیل ہے

رزق کی تنگی، عشق کا روگ اور لوگ منافق سارے
آؤ ایسے شہر سے حیدؔر شہر بدر ہو جائیں

حوصلہ دیکھ ایک اسیرِ خاک
آسماں کی زمین ڈھونڈتا ہے

نارسائی کی اذیت ہی رہی اپنا نصیب
مل گئیں روحیں تو جسموں کو جدا رکھا گیا
اس کی محبتوں کا بھرم کب کا کھل چکا
لیکن یہ دل کہ پھر بھی بڑا خوش خیال ہے

ایک مرحلہ وہ آتا ہے جب شاعر خواب دیکھتے دیکھتے اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔
حیدر قریشی کہتا ہے۔

میں منزلوں کی کھوج میں خود سے بچھڑ گیا
پھر عمر بھر تلاش ہی اپنی رہی مجھے

غم تمہارا نہیں جاناں ہمیں دکھ اپنا ہے
تم بچھڑتے ہو تو ہم خود سے بچھڑ جاتے ہیں

سوچ کے پھیلے ہوئے صحرا میں تنہا دیکھ کر
پھر سرابوں کے حقائق مجھ کو بہکانے لگے

حیدر قریشی کی شاعری کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی تشکیک اور زندگی کی بے معنویت کا شکار ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ چند اشعار:

تیرا انکار بھی ہمیں کو ہے
اور تیرے اسیر بھی ہم ہیں

یہ شہر ہے یا کوئی اوہامِ نگر حیدؔر
ہر چہرہ یہاں پر ہے تشکیک زدہ چہرہ

نہ پورا سوچ سکوں، چھو سکوں، نہ پڑھ پاؤں
کبھی وہ چاند، کبھی گل، کبھی کتاب لگے

تمہارے ملنے کا مل کر بھی کب یقیں آیا
یہ سلسلہ ہی محبت کا اک سراب لگے

عجب سزا ہے کہ میرے دعاؤں والے حروف
نہ مسترد ہوئے اب تک نہ مستجاب ہوئے

یہ تشکیک زدہ فضا دیر تک قائم نہیں رہتی شاعر جلد ہی اپنے آپ کو دوبارہ دریافت کر لیتا ہے اور آدرش اس کی گرفت میں آجاتے ہیں اور اس کا فن خواب و خیال کی راہوں سے گذر کر امید و یقین کی رفعتوں تک پہنچ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھئے۔

صوفی، سادھو بن کر تیری کھوج میں ایسے نکلیں
خود ہی اپنا رستہ، منزل اور سفر ہو جائیں

خزاں رسیدہ سہی، پھر بھی میں اگر چاہوں
جہاں نگاہ کروں ایک نئی بہار اگے

کعبہ میں جا کے یا کہیں پتھر تراش کر — ممکن ہو جس طرح بھی خدا کی تلاش کر

ہم نے شروع میں کہا تھا کہ حیدر قریشی خواب دیکھنے والا شاعر ہے لیکن وہ مایوسی اور ناامیدی کا شاعر نہیں، بلکہ زندگی کے نئے آفاق دکھانے والا پرامید فنکار ہے۔ پرامن اور تابناک عالمی تمدن کے ظہور پر اسے مکمل یقین ہے وہ کہتا ہے۔

طلوعِ صبح سے پہلے شگافِ نیل ہوتا ہے
یہ منظر سامنے کا جلد ہی تبدیل ہوتا ہے

اس کی شاعری نئے ذائقے اور نئے آدرشوں کی شاعری ہے معروف نقاد اور شاعر و ادیب جناب ڈاکٹر وزیر آغا، حیدر قریشی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "حیدر قریشی کے اس رویے نے اس کی غزلوں میں ایک ایسا ذائقہ پیدا کیا ہے جو آج کے نئے غزل گو شعراء میں شاید ہی کسی کے ہاں نظر آئے۔"

حیدر قریشی زمین پر چلتا ہے اور زمین ہی کے بارے میں سوچتا ہے اس کے یہ شعر دیکھئے:

اگرچہ ان کا تعلق ہے عرش سے لیکن
اساسِ کعبہ و بنیادِ طور خاک میں ہے
عطا زمیں کی ہیں رسمیں، روایتیں ساری
کسے خبر ہے کہ کتنا شعور خاک میں ہے

اس کی خوبصورت شاعری سہانے خوابوں، سنہرے آدرشوں اور لطیف و نفیس جذبوں کی پائیدار شبنم ہے جو آنکھوں کو ٹھنڈک عطا کرتی رہے گی۔ کیٹس نے شاید ایسی ہی شاعری کے بارے میں کہا تھا: "زمین کی شاعری کبھی نہیں مرتی"

حیدر قریشی کے ماہیے

اکبر حمیدی

حیدر قریشی کی یلغار سے اب تک بہت کم اصناف ادب محفوظ رہ سکی ہیں۔نظم‘غزل‘نعت‘ماہیا‘افسانہ‘خاکہ‘انشائیہ‘تنقید۔۔۔ایسا لگتا ہے کہ اصناف ادب اس کی راہ میں سر جھکائے کھڑی ہیں کہ وہ آئے اور انہیں شکار کر کے ان کی عزت وتوقیر میں اضافہ کرے۔

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف۔۔۔۔بہ امید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

ابھی تک جو اصناف اس کی دستبرد سے بچی ہوئی ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے مگر انہیں بھی وہ دیکھ لے گا۔ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔فی الحال تو وہ نئی نئی زمینیں فتح کر رہا ہے اور ہم جو بڑھتے ہیں تو بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔میں حیدر قریشی کو اس زمانے کا سکندرِ اعظم کہوں گا جو دنیا کو فتح کرنے کے ارادے سے برسوں پہلے اپنے ’’مقدونیہ‘‘یعنی خانپور سے تیر تلوار لے کر نکلا تھا۔۔۔۔۔۔بہت سی اصناف ادب کو فتح کر کے اب وہ ماہیا۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔اردو ماہیا پر یلغار کر رہا ہے۔اس سرزمین پر اس نے فوجی اہمیت کی بہت سی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔جو لوگ ثلاثی کے رنگ میں ماہیا لکھ رہے تھے‘یا تینوں مصرعوں کو ہم وزن بنا کر ماہیا لکھ رہے تھے‘حیدر قریشی نے سب سے پہلے خطوط اور مضامین رسائل میں پے در پے چھپوا کر ان عناصر کی سرکوبی کی ہے۔جب اس نے دیکھا کہ غنیم اب نیم جان ہو چکا ہے تو اس نے میدان پر مکمل قبضہ کرنے کی غرض سے اردو ماہیا کا مجموعہ ’’محبت کے پھول‘‘ کے نام سے چھپوادیا ہے۔اس پر صاف صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ یہ ’’اردو ماہیوں کا سب سے پہلا مجموعہ ہے‘‘۔بے شک ایسا ہی ہے۔اس سے پہلے نثار ترابی کے ماہیوں کا جو مجموعہ شائع ہوا تھا وہ پنجابی ماہیوں کے وزن پر شاید نہیں ہے۔چونکہ وہ مجموعہ اس وقت میرے پیش نظر نہیں اس لئے شاید کا لفظ لکھا ہے۔لیکن میرا خیال ہے کہ پنجابی ماہیا کے وزن پر اردو ماہیا لکھنے کا دعویٰ صرف حیدر قریشی نے ہی کیا ہے‘اس لئے ان کے

مجموعے ’’محبت کے پھول‘‘ کو اردو ماہیا کا اصلی اور وڈا مجموعہ قرار دینے اور تسلیم کر لینے میں کوئی عذر مانع نہیں ہے۔اس مجموعے میں کئی طرح کے اہتمام کئے گئے ہیں۔سب سے پہلے چند ایک ماہیے جو پنجابی اوزان پر لکھے گئے ہیں اور فلموں میں گائے گئے ہیں‘مثال کے طور پر درج ہوئے ہیں۔پھر اپنے تمام تر ماہیے مختلف عنوانات کے تحت شائع کئے گئے ہیں۔یوں حیدر قریشی نے اپنا تعاقب کرنے والوں کے لئے بہت سی مشکلیں بلکہ رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔صنفِ ماہیا پر چھوٹے چھوٹے حملے تو وہ بڑی مدت سے کر رہا تھا اور اس کے ماہیے رسائل میں نظر بھی آتے رہتے تھے۔مگر اب کے جو اس نے حملۂ عام کیا ہے تو پورا میدان صاف کر دیا ہے۔

اس مجموعے میں ذاتی‘صفاتی بلکہ حیاتیاتی موضوعات کے ماہیے بھی ہیں اور ملکی‘غیر ملکی۔قومی اور بین الاقوامی موضوعات بھی ہیں جنہیں عام الفاظ میں میٹھے اور رسیلے جذبوں کا نام دیا جاتا ہے۔فلموں میں گائے گئے جو ماہیے درج ہیں ان کی ادبی حیثیت نہ ہونے کے برابر ہے۔وہ صرف ساز اور آواز کے جادو سے ہمارے سر چڑھ کر بول رہے ہیں ورنہ حیدر قریشی کے ماہیے اپنے موضوع‘اسلوب‘تاثیر کے اعتبار سے کہیں بہتر ہیں۔حیدر قریشی کو جہاں اپنی ماں سے بے پناہ محبت ہے اور جس کا ذکر اس نے جا بجا اپنی غزلوں‘خاکوں‘اور انشائیوں میں بھی کیا ہے اور اب ماہیوں میں بھی کیا ہے وہاں اسے مادرِ وطن سے بھی بیحد گہرا دلی لگاؤ ہے۔مثلاً یہ ماہیا دیکھیں:

کیا رُوپ نکالا ہے
گردن میں اس کی
دریاؤں کی مالا ہے

کتاب کا انتساب ہے ’’امی جی کے نام‘‘ اور ماہیا ہے:

پھولوں کی ہے نرمی بھی
اس کی محبت میں
صحراؤں کی گرمی بھی

بھائی شاید برادرانِ یوسف ہیں۔اس لئے ان سے اظہارِ محبت میں شکایت کا رنگ بھی ہے:

یاد آ ہی گئے آخر
کچھ بھی سہی لیکن

بھائی ہیں مرے آخر

ماہیا کی فضا دراصل پنجاب کے گاؤں کی فضا ہے۔اس کا ایک منظر دیکھئے کیسا سچا ہے اور شعریت سے معمور بھی:

منظر ترے گاؤں کے
گرم دوپہروں میں
ہنستی ہوئی چھاؤں کے

جوانی دیوانی نہ ہو اور اس میں اگر رنگِ آوارگی نہ ہو تو وہ جوانی نہیں کہلا سکتی۔دیکھئے حیدر قریشی نے کس خوبصورتی سے اسے تصویر کیا ہے:

چنبیلی کی کلیاں تھیں
اپنی جوانی تھی
اور شہر کی گلیاں تھیں

ایک دو اور رسیلے ماہیے دیکھئے۔تعلق، شکوہ، کسک، کئی باتیں نظر آئیں گی:

سونے کی انگوٹھی ہے
پیار میں سچی ہے
پر قول کی جھوٹی ہے

☆

وہ میٹھی کھجور بھی ہے
اونچی مگر اتنی
میری پہنچ سے دور بھی ہے

سیاسی تناظر میں خصوصاً ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کو یہاں کے سبھی اہلِ قلم نے بہت بُری طرح محسوس کیا۔حیدر قریشی کے ماہیے میں اس پر شدید ردّعمل کا اظہار ملتا ہے، مگر شاعرانہ اور زوردار انداز میں:

گلشن پہ عذاب ہوا
توپ کی طاقت سے

اک گِدھ سُرخاب ہوا

☆

پرواز پہ پابندی
سارے پرندوں کی
آواز پہ پابندی

حیدر قریشی نے یوں تو ہر موضوع کو ماہیا کا موضوع بنا دیا ہے لیکن مزاج کے اعتبار سے اس کا اصل موضوع انسانی تعلقات کا وہ میدان ہے جسے ہم عشق و محبت کہتے ہیں۔حیدر قریشی میرا دیرینہ دوست ہے، اس لئے میں جانتا ہوں وہ عاشق مزاج ہے بلکہ ''دل پھینک'' قسم کا عاشق ہے۔مگر نابالغ عاشق نہیں جو ہر وقت رُومانوی فضاؤں میں گُم رہے بلکہ بالغ عاشق ہے جو رومانوی فضاؤں سے آگے نکل کر محبوب سے حال و وصال کا طلب گار بھی ہے۔اسی ضمن میں محبوب کے سراپا کی تصویر کشی اور متعلقات کو بیان کرنا حیدر قریشی کے اصل موضوعات ہیں، جو اس کی غزلوں کو رنگدار کر رہے ہیں اور اب ماہیا کو بھی مہکا رہے ہیں:

مُونجی کی چھڑائی تھی
پہلے پہل بَکیے
جب آنکھ لڑائی تھی

یہ تو خیر آغاز ہے اور آغاز میں تو آنکھ ہی لڑتی ہے۔مگر آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔اگلی حالتوں کے کچھ ماہیے ملاحظہ ہوں:

وہ ہاتھ دعا والے
جسم عطا والا
اور ہونٹ شفا والے

☆

اک خواب ہے جندڑی کا
رَس بھری لڑکی ہے
یا آم ہے سندھڑی ہے

"سندھڑی آم" کی تشبیہ اپنے اندر جو غضب رکھتی ہے وہ ناقابلِ بیان ہے "اور پھر بیان اپنا" اس پر اضافہ۔ ایسا ہی ایک ماہیا اور دیکھئے:

ان آنکھوں کی مغروری
ہوش اڑا ڈالے
وہ شربتِ انگوری

"شربتِ انگوری" کی تشبیہ نادر بھی ہے اور پُر معنی بھی۔ مگر حیدر قریشی کا اصل موضوع ابھی آگے ہے۔ ان باتوں کو آپ "خوبصورت شاعرانہ خوشامد" کہہ سکتے ہیں۔ اصل موضوع پر میں صرف دو ماہیے پیش کروں گا۔ حیدر قریشی کے تیز رنگوں والی تصویریں اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتیں۔ یہاں میں یہ بھی عرض کروں کہ یہ موضوعات جتنے دلپذیر ہیں انہیں ان کے رنگوں اور ڈھنگوں سمیت پیش کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ حیدر قریشی نے یہ تصویریں کمال مہارت، جرات اور شوق سے بنائی ہیں۔ دیکھئے:

نیّت تھی مری کھوٹی
تم بھی تھے آمادہ
اور کھلتی گئی چوٹی

☆

دونوں ابھی بچے تھے
رَل مِل کھا بیٹھے
امرود جو کچے تھے

حیدر قریشی کے اردو ماہیے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اس صنف کے مزاج کو پہچانا ہے، جانا ہے۔ اپنے اندر اس صنف کو اتارا ہے۔ اس کے بعض ماہیے تو ایسے ہیں جن کی مثال اردو ماہیا تو کیا پنجابی ماہیا میں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ انہیں پڑھ کر انسان اداس ہو جاتا ہے اور اس کے دل و دماغ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ دو ماہیے دیکھئے جن کی مثال شاید ہی کہیں ملے۔ اردو ماہیے میں تو نہیں ملے گی:

کچھ رشتے ٹوٹ گئے

برتن مٹی کے
ہاتھوں سے چھوٹ گئے

☆

جاں وار گئے پیارے
جگ تمہیں جیت گیا
ہم ہار گئے پیارے

ماہیا دراصل دیہاتی زندگی کو دیہاتی تہذیب وتمدن اور دیہاتی مزاج کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ حیدر قریشی کے ماہیوں میں بھی ہمیں دیہاتی منظر، دیہاتی لوگ اپنے سادہ، رسیلے جذبوں اور روایتوں کے ساتھ ملتے ہیں۔ دیہات میں ایک روایت اور عادت چلی آ رہی ہے کہ واقعات کو فصلوں کے اوقات سے منسوب کر کے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سے دیہاتی زندگی میں فصلوں کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور دیہات کے لوگوں کے اندازِ فکر کا بھی۔ بہت سی شادیاں گندم کی کٹائی سے پہلے یا بعد میں ہوتی ہیں۔ گندم کی کٹائی سے پہلے سگائی کی اور جب گندم گھر آ گئی تو اسے فروخت کر کے شادی کر دی۔ گندم کی کٹائی کے لئے بہت تیاریاں کی جاتی ہیں۔ اب تو خیر کٹائی کے لئے مشینیں اور گہائی کے لئے تھریشر آ گئے ہیں مگر ابھی یہ چیزیں دیہات کے کلچر کا حصہ نہیں بنیں۔ ایسا ہی ایک جذباتی سانحہ ہمارے شاعر کو پیش آتا ہے، دیہاتی لوگوں کی ایک جذباتی واردات کو حیدر قریشی نے کس خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ یہ واردات اندر ہی اندر بہت خاموشی سے واقعہ ہوتی ہے۔ ایک عاشق گندم کی کٹائی پر خاموشی کے ساتھ گاؤں کو خیر باد کہہ کر چلا جاتا ہے کہ اس کی محبوبہ کی سگائی کہیں اور ہو گئی ہے۔ بقول شاعر، شیوہء عشق نہیں حسن کو رُسوا کرنا۔ اب ماہیا دیکھئے، یہ زندہ رہنے والا ماہیا ہے:

گندم کی کٹائی پر
چھوڑ دیا گاؤں
گوری کی سگائی پر

شاید ایسے ہی موسم میں حیدر قریشی پاکستان سے نکلا تھا!

حیدر قریشی۔۔۔کثیر الجہات شاعر

پروفیسر آفاق صدیقی

حیدر قریشی کی جستہ جستہ شعری تخلیقات اور کچھ نثری تحریریں برسوں سے نظر نواز ہوتی رہی ہیں ۔کثیر الجہات صاحبِ قلم ہیں اور ہمارے ایک لائق و فائق شاگردِ عزیز نذر خلیق کے پر خلوص دوست ۔

دوستی کا ذکر یوں آیا کہ عزیزم نذر خلیق ہی نے مجھے یہ ضخیم اور دیدہ زیب شعری مجموعہ بطور خاص بھیجا جس کا نام ہے " غزلیں ،نظمیں ، ماہیے " ۔۔کتاب کے ساتھ ایک خط بھی تھا جو یہ خوشخبری لایا کہ حیدر قریشی کی شاعری اور شخصیت پر ایک تالیف زیر ترتیب ہے جس میں فن اور شخصیت کے حوالے سے مضامین شامل اشاعت ہوں گے ۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ ایسے اہل کمال کے کمال فن کی قدر افزائی کی جائے ۔

حیدر قریشی کی یہ شعری کلیات سروَر ادبی اکادمی جرمنی نے شائع کی ہے ۔مجھے معلوم نہیں کہ موصوف وہاں کب سے مقیم ہیں تاہم لائق تحسین ہے ان کا ادبی سفر کہ وہ دیار مغرب میں ہماری تہذیب وثقافت اور زبان وادب کی سفارت کاری میں پیش پیش ہیں ۔

حیدر قریشی اب تک 5 شعری مجموعے اور قریب قریب ایک درجن نثری تصانیف قارئین ادب کی نذر کر چکے ہیں ۔ان نثری تصانیف میں افسانے ،خاکے ،اور تحقیق وتنقیدی مضامین شامل ہیں اور اس لحاظ سے بجا طور پر انہیں جامع الکمالات ادبی شخصیت کہا جاتا ہے ۔

اچھا ہوتا اگر اس ضخیم شعری مجموعے میں تصانیف کی تفصیل کے ساتھ روداد حیات کی جھلکیاں بھی ہوتیں پھر بھی غنیمت ہے ۔پچھلے چار شعری مجموعے یعنی سلگتے خواب ،عمر گریزاں ، محبت کے پھول ،اور دعائے دل کے عکس ابتدائی صفحات میں کچھ کوائف موجود ہیں ۔ ہر کتاب کا انتساب شعریت

کے پیکر میں اپنی شریک حیات ،اپنے بیٹوں اور والدین کے نام ہے ۔

یہ کلیات نما شعری مجموعہ ان کے پچھلے چار شعری مجموعوں کا مجموعہ ہے ۔مجموعی طور پر غزلوں کا حصہ زیادہ ہے اور غزل گوئی کے بارے میں شاعر کا اپنا موقف یہ ہے کہ "میری غزل گوئی کے چار ادوار ہیں" ۔ابتدائی دور جب روایتی غزل کے انداز میں غزلیں کہیں ۔دوسرا دور انتہا پسند جدیدیت کے زیر اثر تھا ۔تیسرا دور جدیدیت کے اثر سے نکلنے کا اور چوتھا دور دراصل سابقہ تینوں ادوار کے مثبت اثرات سے مل کر بنا ہے ۔

یہ تو رہی حیدر قریشی کی غزل کے ادوار کی باتیں لیکن ان کا یہ کہنا کہ "اب شاید میں نے تھوڑا بہت غزل کہنا سیکھ لیا ہے اور مزید سیکھنے کی طرف گامزن ہوں" ہمیں اس تجزیے پر اکستا تا کہ پہلے دور سے چوتھے دور تک جو غزلیں کہی گئیں ان میں فکر واحساس اور فنی رموز ونکات کی نوعیت کیا رہی ۔

حیدر قریشی نے ابتدائی دور کو روایتی انداز بیان پر محمول کیا ہے ۔اورعرض حال میں نمونے کے طور پر تین اشعار بھی پیش کئے ہیں جن کو دیکھ کر میں نے محسوس کیا اور سوچا بھی کہ روایت پسندی کے بغیر تو کوئی شاعر غزل کہہ نہیں سکتا کیونکہ اس کی ہیئت (Form) میں روایت ہے ۔وہی قافیہ اور ردیف کی پابندی ،بحر ووزن کے لوازمات ،اور معنوی اشارے کنایے ۔ہاں یہ ضرور ہے کہ راہ مضمون تازہ بند نہیں اور مضمون تازہ نہ ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں لفظیات کو نیا پن دیا جاسکتا ہے ۔لفظ جو فکر وخیال اور جذبہ واحساس کا پیراہن ہوتے ہیں ۔

حیدر قریشی نے اولیں دور سخن میں ہی شعوری طور پر روایت پسندی کے ساتھ ساتھ جدت طرازی بھی روا رکھی ۔مثلاً

دھند یادوں میں جیسے بھٹکتے رہے　　وہ بھی تکتے رہے ،ہم بھی تکتے رہے

اس شعر میں دھند یادوں کی لفظی ترکیب روایتی ہرگز نہیں ہے ہاں محبوب اور محبوبوں کا یاد آنا ہماری زندگی اور شاعری دونوں کی آفاقی روایت ہے ۔

آیئے اب دوسرے دور کی انتہا پسند جدیدیت کو دیکھتے ہیں ۔

رستے چلے گئے ہیں خرابوں کی جھیل میں
ہم تشنہ لب ہی رہ گئے خوابوں کی جھیل میں

بیشک طرزِ اظہار اور طرزِ احساس میں جدیدیت کا رچاؤ ہے۔ خرابوں کی جھیل، اور خوابوں کی جھیل کا سراغ ہمارے کلاسیکی اور پھر ممتاز معتبر غزل گو شعراء کی غزل گوئی میں مجھے تو کہیں نہ ملا البتہ تشنہ لبی کی روایت قدیم و جدید کی تفریق کے بغیر موجود ہے۔

میرا خیال ہے کہ حیدر قریشی نے اپنے طور پر جسے انتہا پسند جدیدیت کا نام دیا وہ جدیدیت تو ہے مگر انتہا پسند نہیں۔ کوئی معقول غزل گو اپنی غزل گوئی کے ظرف تنگنائے غزل کو انتہا پسندی کا شکار کر ہی نہیں سکتا اگر کرے گا تو مارا جائیگا۔ رہا جدیدیت کے اثر سے نکلنے کا مسئلہ تو ممکن ہے شاعر کی مشق سخن اور مطالعہ سخن نے اپنے لب و لہجے کو بدلنے کی شعوری کوشش کی ہو معروضی رویے کی تبدیلی جدیدیت کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی ہوسکتی ہے جو تیسرے دور کی غزلوں میں ہے۔

اب چوتھے دور کی غزلوں میں جو مہارت پیدا ہوتی ہے وہ ایک منجھے ہوئے غزل گو کی مشاقی کا اظہار ہے۔ بہر کیف ادوار کی تخصیص و تقسیم سے قطع نظر حیدر قریشی کی غزلوں سے جو اشعار پیش کر رہا ہوں وہ آداب غزل گوئی کے اعتبار سے عصر حاضر کی غزل کو پُر کشش بنانے والے خوبصورت اشعار ہیں مثلاً

مرجھا چکے ہیں پھول تری یاد کے مگر
محسوس ہو رہی ہے عجب تازگی مجھے

بنا ہوا ہے بظاہر وہ بے تعلق بھی
جو مجھ کو سوچے بنا دن بسر نہیں کرتا

یہ اور بات کہ اقرار کر نہیں پاتا
مگر وہ دل تو محبت شناس رکھتا ہے

وہ پتھر دل سہی لیکن ہمارا بھی یہ دعویٰ ہے
ہمارے لب جنہیں چھو لیں وہ پتھر بول اٹھتے ہیں

لبوں کی قید سے کیا فرق آیا دل کی باتوں میں
کہ سارے لفظ آنکھوں سے ابھر کر بول اٹھتے ہیں

صوفی سادھو بن کہ تیری کھوج میں ایسے نکلیں
خود ہی اپنا رستہ منزل اور سفر ہو جائیں

نارسائی کی اذیت ہی رہی اپنا نصیب
مل گئیں روحیں تو جسموں کی جدا رکھا گیا

غم تمہارا نہیں جاناں! ہمیں دکھ اپنا ہے
تم بچھڑتے ہو تو ہم خود سے بچھڑ جاتے ہیں

کشادہ رکھتا تھا بانہیں وہ میرا دریا دل
پر اس کے دل میں لیکن اک بھنور بھی رہتا تھا

حیدر قریشی کی اس کتاب میں 140 منتخبہ غزلیں شامل اشاعت ہوئی ہیں۔ نظموں کی تعداد 27 ہے اور ماہیوں کی موضوعات کے لحاظ سے 19۔ گویا غزلوں کا حصہ نسبتاً زیادہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ موصوف کی اصل شاعرانہ پہچان بھی غزل ہے ویسے ان کی تخلیقی صلاحیت ہر صنف شعری میں اپنا جادو جگانے کا وصف رکھتی ہے اور مجھے ان کا شعر بر بنائے حقیقت محسوس ہوتا

اک فرشتہ ہے عشق کا حیدرؔ
مجھ پہ جو شاعری اتارتا ہے

یہ شاعری جو فرشتہ عشق نے ان کے وجدان کو عطا کی ہے اور جس میں غزلوں کے اتنے روپ بروپ ہیں کہ اگر ان کی خصوصیات کا ذکر چھیڑ دوں تو اس کا سمیٹنا دشوار ہو جائے اس لئے اب متعدد زمینوں اور بحروں کے وہ مصرعے لکھے دیتا ہوں جو ندرت بیاں اور جدت نہاں کے آئینہ

دار ہیں:

مرے بدن پہ تیرے وصل کے گلاب لگے/ پیاسے سمندروں کی طرح تیرتے رہتے ہیں/

اس طرح شہرانا پر میں تباہی مانگوں/ جب تیر چل گیا تو کماں بھی نہیں رہی/

اب کے جدائیوں میں بھی رنگ وصال ہے/ وہ جو خوشبوؤں کا خرام ہے جو دھنک کا عکس جمیل ہے

/سامنے ہے گھر مگر مفقود گھر کے راستے/ نیکی کی راہ میں کوئی بدنام مر گیا/

لفظ اندھے ہو گئے سوچوں کو پتھر کر گیا/اب تو جذبے زبان مانگتے ہیں/

مری نیندیں بھی مہکانے لگے ہو/ اک یاد کا منظر سا خلاؤں پہ لکھا تھا/

حدیث درد کی پہلے کوئی کتاب لکھو/ دو پرندے چہکتے رہے رات بھر/

مسافتوں کی لگن تو فقط بہانہ تھا/میری دھرتی سے پرے کوئی بلاتا ہے مجھے/

سمندروں کی جگہ دشت بے کنار دیا/ آگ اپنے خون سے آخر بجھانی پڑ گئی/

اسی خموشی کو تیرا جواب ہونا ہے/ دکھوں کو جھیل جانا آ گیا ہے/

یوں حسن ضیار بار کی خیرات عطا کر/اور۔۔۔۔۔روشنی کا استعارہ کر لیا/

اگر آپ ان غزلوں کو پڑھیں۔۔۔ان کے علاوہ بھی حیدر قریشی کی بہت سی غزلیں اس مجموعے کے حوالے سے زیر مطالعہ آئیں تو محسوس ہو گا کہ جن ادوار کا شاعر نے عرض حال میں ذکر کیا ہے ان کی متنوع جھلکیاں غزل کے روایتی اسالیب میں ہیئت اور معنوی اظہار و ابلاغ کی بوقلمونی کا مظہر ہیں اور جدید حسیت کی رعنائیاں بھی اپنے رنگ و آھنگ میں بڑی جاذبیت رکھتی ہیں۔ان میں رمزیت، ایمائیت، ایجاز و اعجاز اور قلبی واردات کے اظہار کا سلیقہ موجود ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بحثیت مجموعی حیدر قریشی نے صنف غزل کے محاسن کو کافی حد تک اپنے اسلوب بیان میں برقرار رکھا ہے مثال کے طور پر ایک غزل کے چند اشعار دیکھئے

لفظ اندھے ہو گئے سوچوں کو پتھر کر گیا
ایک ہریالی کا پیکر دل کو بنجر کر گیا
کون جانے اس کی اپنی پیاس کا عالم ہو کیا
وہ جو میری روح کو پیاسا سمندر کر گیا
یوں تو پہلے بھی وہ کرتا تھا اداس آ کر مگر

اب کے دل کی اور ہی حالت ستمگر کر گیا
خوشبوئیں اور دودھیا سی روشنی ہے چار سو
کچھ کہو حیدرؔ یہ جادو کون تم پر کر گیا

لفظوں کا اندھا ہونا اور سوچوں کا پتھر بن جانا جیسی لفظی و معنوی ندرتیں انداز بیاں کی تازہ کاری کا ثبوت دیتی ہیں۔تمام تر غزلوں میں انکشاف ذات وصفات کی چمک موجود ہے اور فنی پختگی کے لحاظ سے اب حیدر قریشی کا شمار عصر حاضر کے ان باکمال غزل گو شعراء میں ہونا چاہیے جو صف اول کے سخنور کہے جاتے ہیں یقیناً ان کی غزل گوئی ابھی اگلی منزلیں بھی سر کرے گی پھر یہ کام ناقدین فن کا ہو گا کہ وہ اپنے تجزیوں اور تنقیدی رویوں میں کیا فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔

حیدر قریشی نے نظموں کے لیے آزاد نظم (Free Verse) کی ہیئت (Form) کو اپنایا ہے حالانکہ صنف غزل کے کامیاب تخلیقی تجربوں کی روشنی میں اپنی نظموں کو مقفیٰ شکلوں میں بھی پیش کر سکتے تھے بہر کیف یہ ان کے شعری وجدان کا مسئلہ ہے اور اس وجدان نے خلا، درد، ایک اداس کہانی، فاصلوں میں ملاپ، محبت کا خدا، بہار کے پہلے دن، عجیب دشمن، یہ دل اور بے فیض موسم کا دکھ جیسی نظموں میں رومانیت کے عنصر کو غالب رکھا ہے مثال کے طور پر کچھ نظموں کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں

کبھی تم دل میں بستے تھے
تو آنکھوں میں کہیں اندر
بہاریں مسکراتی
کہکشائیں رقص کرتی ہیں

(خلا)

چوڑیوں کی چھنک
ٹوٹتی چوڑیوں کی چھنک
زخم خوردہ مگر مسکراتے ہوئے
گیت گاتی چھنک

(دور)

مرا دل میری جاں کی
اور مری جاں، میرے دل کی جستجو میں ہے
مگر دونوں میں کوئی رابطہ ہو پایا نہیں جیسے
عجیب سی دھند پھیلی ہے

تمہیں پانے کی خواہش صرف خواہش ہی نہیں
جاناں!
تمہارے ان لب ورخسار کی سرخی پہ
میری شاعری کے سب دمکتے رنگ بکھرے ہیں

سبھی منظر صدا کے روپ میں ہی مجھ سے ملتے ہیں　　　طلسم حرف کے جو اسم بھی ہیں
یہ دلکش دھند　　　سب تمہاری آنکھ کے جادو میں بستے ہیں
دو قطروں کی صورت　　　مرے مفہوم اور معنی تمہاری روح میں پنہاں
جب سے ان پلکوں پہ ٹھہری ہے　　　تمہیں پانے کی خواہش صرف خواہش ہی نہیں جاناں
(ایک اداس کہانی)　　　مجھے اپنے ادھورے پن کی بھی تکمیل کرنی ہے

(تمہارے لیے ایک نظم)

شاعر، موسیقار، مصور اور کسی فن سے گہری وابستگی رکھنے والے فرد کا یہ احساس ناصبوری بڑی بات ہے کہ وہ تکمیل کی جانب مائل رہے۔ حیدر قریشی کی شاعری چاہے کسی ہیئت میں ہو ان کا یہ جذبہ میرے نزدیک لائق تحسین ہے کہ اپنی غزل گوئی کے چوتھے دور میں بھی وہ خود کو استادی کے زعم میں مبتلا نہیں کرتے بلکہ بڑے مثبت انداز میں خوب سے خوب تر کی جانب بڑھ رہے ہیں ۔ان کی نظموں میں بنیادی وصف جمالیاتی رکھ رکھاؤ کا ہے

حسن و عشق کے بغیر نہ زندگی میں نکھار آتا ہے اور نہ فن کا سنگھار ہوتا ہے بقول شاعر واحدی

زندگی قریب ہے، کس قدر جمال سے　　　جب کوئی سنور گیا زندگی سنور گئی

نظموں کی محدود سی تعداد میں بھی حیات و کائنات کے ظاہری و باطنی رموز پر شاعر کی وجدانی و شعوری توجہ رہی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ "چاند کی تسخیر کے بعد" جیسی نظموں کی بنت ہو یا دیگر موضوعاتی نظموں کا لفظی و معنوی احساس جمال حیدر قریشی اپنے من میں ڈوب کر پاتال سے فکر و فن کے موتی نکالنے کو ترجیح دیتے ہیں ۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ باطنی بصیرت کا ارتکاز و انجذاب غزلوں کی طرح ان کی نظموں میں بھی نمایاں رہتا ہے۔

نظموں کے موضوعاتی پیکر میں شاعر نے اپنے وطن عزیز کی تہذیبی و ثقافتی رعنائی اور مقامی رنگ آمیزی کی برنائی سے بھی بڑا کام لیا ہے مثلاً کالے انجن کی سیٹی کی آواز، تانگے کے گھوڑے کی ٹاپوں اور تانگے کے پہیوں کی آواز، بانسری کی دکھی اور سریلی آواز، چوڑیوں کی چھنک، پھاگن کی ہوا اور سرسوں کے کھیت وغیرہ کا ذکر عہد رفتہ کی ان زمانی یادوں سے گہری وابستگی کا آئینہ دار ہے جو یادیں بچپن اور نوجوانی کا انمول سرمایہ ہوتی ہیں۔ انہی یادوں سے وہ رشتے بھی جڑے ہوئے ہیں ۔جو ماں باپ، بھائی بہن اور چاہے جانے والی شخصیات کو آئینہ خانہ تصور میں بار بار اجاگر کرتے

رہتے ہیں۔ دعا گزیدہ، جیسی کرب انگیز نظموں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے حیدر قریشی نے

کاغذ پہ رکھ دیا ہو کلیجہ نکال کر

کئی نظمیں ایسی بھی ہیں جو شاعر کی سیاسی بصیرت اور عالمی مناظر کو ابھارتی ہیں۔ نئی شالاط، دعا اور تیامت (سمیری دیو مالا کی ایک سمندری بلا) جیسی نظموں کا خالق "ایک دراوڑ کا پیغام آریاؤں کے نام" پہنچاتا ہے تو صدیوں کے تہذیبی سفر کا اشارہ اس کی سیاسی و معاشرتی شعوری رو کا استعادہ بن جاتا ہے۔ اس طرح شاعری کا وہ پہلو قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لیتا ہے جو حسیات میں پیوست ہونے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ سوچنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔

حیدر قریشی کی نظموں کو پڑھ کر مجھے یہ اندازہ بھی ہوا ہے کہ کثیر المطالعہ قلمکار ہیں اور کئی علوم مفیدہ پر گہری نظر رکھتے ہیں جن کا مجموعی اثر ان کی تخلیقی صلاحیت پر ایک فلسفی جیسے ہوش مند و باشعور شاعر کی صورت میں جاں گزیں ہے۔ ان کی ایک نظم عجیب دشمن کے عنوان پر ہے۔ اس نظم میں بڑی بے تکلفی اور بڑی بے ساختگی سے انہوں نے انگریزی الفاظ کو بھی اپنے ماضی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔

میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ حیدر قریشی کی نظمیں سطحی جذبہ احساس اور ہلکے پھلکے تفکر کی پروردہ نہیں بلکہ ان کی تفہیم کے لیے قاری کا بھی خاصا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ یہ بڑے امکانات کی شاعری ہے اور میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ حیدر صاحب کو ایسی اعلیٰ ادب آموز و خیال افروز نظموں کی تخلیق پر مزید توجہ دینی چاہیے۔ بڑی بے تکلفی اور بڑی بے ساختگی سے انہوں نے انگریزی الفاظ کو بھی اپنے ماضی الضمیر کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔

غزلوں اور نظموں کے بعد اس مجموعے میں شامل ماہیے بھی بہت پرکشش ہیں۔ تین تین سطروں پر مشتمل یہ منظومات جو جاپانی ہائیکو اور ہماری شاعری میں رواج پانے والی ثلاثی سے ملتی جلتی ہیں اپنے اصطلاحی معنوں میں "ماہیہ" کہلاتی ہیں۔

پچپن برسوں میں کئی شاعروں نے اس مختصر و جامع صنف شعری کے رنگا رنگ تخلیقی تجربے اردو شعر و سخن کو دیے ہیں ان شاعروں میں حیدر قریشی کا نام بھی اچھے ماہیے تخلیق کرنے والے شاعر کی حیثیت سے ایک وقیع نام ہے۔

حمد و نعت کے ماہیوں سے جو سلسلہ چلا وہ رنگ برنگ پر ختم ہوا اور اس طرح اچھی خاصی

تعداد ایسی تخلیقات کی ہے۔جن کا مطالعہ یہ باور کرانے کے لیے کافی سمجھنا چاہیے کہ ایک منجھے ہوئے شاعر کو کسی بھی صنف شاعری کے آئینے میں پرکھا جائے وہ اپنا رنگ جمانے میں ہیٹا ثابت نہیں ہوتا۔حیدر قریشی کے ماہیوں سے میں نے اپنے طور پر کچھ کا انتخاب کیا ہے جو پیش کر رہا ہوں ۔

جھک آئے فلک سائیں
دیکھی تھی ہم نے
بس ایک جھلک سائیں

تو خود میں اکیلا ہے
تیرے دم سے مگر
سنسار کا میلہ ہے

تاریک تھی کالی تھی
تیرے مدثرؐ نے
جب دنیا اجالی تھی

یہ ماہیے تو حمد و نعت جیسی مقدس اصناف کے زمرے میں آتے ہیں۔پھر ان کے بعد اپنی سرزمین وطن سے والہانہ محبت کا اظہار سوہنی دھرتی کے زیرِ عنوان ماہیوں میں ہوا ہے مثلاً

کیا روپ نکالا ہے
گردن میں اس کی
دریاؤں کی مالا ہے

رت پیار کے میلوں کی
گجرے کلیوں کے
جھانجری ہے بیلوں کی

پھولوں کی ہے نرمی بھی
اس کی محبت میں
صحراؤں کی گرمی بھی

حیدر قریشی کی شاعری میں انسانی رشتوں کے جو پیار بھرے جذبے ابھرتے ہیں وہ ماہیوں کی شکل میں بھی بڑے اثر آفریں ہیں مثلاً

برگد کی جٹائیں ہیں
ساتھ مرے اب بھی
ابو کی دعائیں ہیں

تب آنکھ برستی ہے
دل میں کہیں چھپ کر
ماں جب مری ہنستی ہے

ماضی کے حسیں سائے
چار مری بہنیں
اور چار ہیں ماں جائے

ایسے ہی خوبصورت ماہیے بیوی اور بچوں کے پیار کا مظہر ہیں پھر پھول رت اور چند دوسرے عنوانات پر دلنشین ماہیے اس شعری مجموعے کی زینت بنے ہیں۔خدا کرے حیدر قریشی کی شاعری کا پر خلوص سفر اسی طرح جاری وساری رہے اور وہ نئی منزلیں سر کرنے میں کامیاب وکامران رہیں

منزلوں نے تو مجھے ڈھونڈ لیا تھا حیدرؔ
پھر مرا شوقِ سفر مجھ کو چرا لایا تھا
(''سلگتے خواب'' کی ایک غزل سے)

حیدر قریشی کی ماہیا نگاری

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

پنجابی لوک گیت ماہیا کی جو روایت اردو میں ہمت رائے شرما،قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی کے اردو ماہیوں سے آئی تھی گزشتہ چند برسوں سے باقاعدہ تحریک بنتی جا رہی ہے۔ شعرائے کرام مسلسل اس طرف متوجہ ہو رہے۔پنجاب کا یہ عوامی گیت اردو ادب کی ایک نوخیز مگر معتبر شعری صنف بن گیا ہے۔دیگر شعری اصناف کے مقابلے میں اسے جو پذیرائی اور قبولیت حاصل ہو رہی ہے اس کا بنیادی سبب اس لوک گیت کی منی اور اس کا رس ہے جو سننے والوں کو ہی نہیں پڑھنے والوں کو بھی متاثر کر رہا ہے۔

اردو ماہیے کو پنجابی ماہیے کے وزن اور مزاج سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلہ میں حیدر قریشی کی تحقیقی اور تنقیدی خدمات جتنی اہم ہیں ان سے زیادہ اہم تخلیقی میدان میں ان کی پیش رفت ہے ان کے ماہیوں کا مجموعہ "محبت کے پھول" ۱۹۹۶ء میں شائع ہو چکا ہے یہ اردو میں ماہیوں کے صحیح وزن کا سب سے پہلا مجموعہ ہے لیکن صرف اوّلیت کا اعزاز ہی اس مجموعہ کی شناخت نہیں ہے بلکہ اس کتاب کے ماہیے حیدر قریشی کو صفِ اوّل کا پہلا ماہیا نگار ثابت کرتے ہیں۔ان کے ماہیے پنجاب کی خوشبو سے بسے ہوئے ہیں پنجابی ماہیا کی روایت سے پوری طرح منسلک ہیں اور اس سے آگے کا سفر بھی دکھاتے ہیں۔"محبت کے پھول" کے مضمون کو حیدر قریشی نے پنجابی ماہیے کی طرح والہانہ انداز میں اپنے ماہیوں میں پیش کیا ہے لیکن پنجابی ماہیوں کے مضامین سے استفادہ ہرگز نہیں کیا ہے۔ان کی "محبت کے پھول" کے رنگ ان کے اپنے ہیں۔

سوہنی ہے نہ ہیر ہے وہ
اس کی مثال کہاں

آپ اپنی نظیر ہے وہ

کشکول نظر بھر دے
نظرِ کرم اپنی
اے میرے سخی کر دے

مونجی کی چھڑائی تھی
پہلے پہل بلیئے
جب آنکھ لڑائی تھی

یہ دل بھی لگا کھلنے
لہنگا ہرا پہنے
آیا ہے کوئی ملنے

جوگی کے نہیں پھیرے
دل جہاں آ جائے
وہیں ڈال دے ڈیرے

کیا رنگِ بہار آیا
میک اپ اس نے کیا
اور دل پہ نکھار آیا

پنجابی ماہیا جسمانی سطح پر وصل سے سرشار ہوتا ہے۔حیدر قریشی کے ہاں اس رنگ کے ماہیوں کی اپنی شان ہے۔

گل عشق کی شان تھی

لت پت ہونا تھا
یہ فصل ہی دھان کی تھی

چڑھتے ہوئے جامن پر
داغ لگا بیٹھے
ترے پیار یا دامن پر

وہ ہاتھ دعا والے
جسم عطا والا
اور ہونٹ شفا والے

محبت میں جدائی کا ذکر دنیا کی ہر زبان کی شاعری میں ملتا ہے۔حیدر قریشی کے ماہیوں میں فراق اور دکھ کی کیفیت یوں نظر آتی ہے۔

گندم کی کٹائی پر
چھوڑ دیا گاؤں
گوری کی سگائی پر

دکھ حق تھا غریبوں کا
تم سے گلہ کوئی
نہ ہی شکوہ نصیبوں کا

تو کسی کا سوالی تھا
دامن دل جس کا
خود اپنا ہی خالی تھا

اور سچ تو یہ ہے کہ محبت کا دکھ حیدر قریشی کو گیان کی روشنی عطا کرتا ہے۔

کچھ رشتے ٹوٹ گئے
برتن مٹی کے
ہاتھوں سے چھوٹ گئے

مرجھائے درختوں کو
دیں گی بہاریں کیا
ہم سوختہ بختوں کو

سب دکھ کے فسانے تھے
آنکھ کے آنسو تھے
یا اوس کے دانے تھے

بے نام اداسی کو
کون سمجھ پاتا
تیرے بن باسی کو

سب ہو گئے سودائی
عشق کی پا نہ سکے
وسعت اور گہرائی

جھک آئے فلک سائیں
دیکھی تھی ہم نے
بس ایک جھلک سائیں

محبت کے مضمون کے بعد پنجابی ماہیے کا اہم موضوع دھرتی اور اس کے مظاہر ہیں۔ حیدر قریشی کے

ماہیوں میں یہ موضوع کم از کم دو نمایاں سطحوں پر سامنے آیا ہے ایک سطح پر وہ پورے کرہ ارض پر اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں اس ضمن میں ان کے "سوہنی دھرتی" کے زیر عنوان ماہیے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

پھولوں کی ہے نرمی بھی
اس کی محبت میں
صحراؤں کی گرمی بھی

چشمے کہساروں کے
فیض یہ دھرتی ماں
کے دودھ کی دھاروں کے

چاند اور ستارے ہیں
ہم سب اس دھرتی
کے راج دلارے ہیں

اور دوسری سطح پر دھرتی کا دیہاتی ماحول حیدر قریشی کے ماہیوں میں نمایاں ہوا ہے۔ شہری ماحول کے مقابلے میں دیہاتی ماحول کی عکاسی شاید اس لیے بھی ہے کہ دیہات کے مناظر ابھی بھی فطرت سے زیادہ قریب ہیں حالانکہ جدید ٹیکنالوجی نے شہروں کی طرح دیہاتوں پر دھاوا بول دیا ہے اس کرب کا اظہار حیدر قریشی کے ماہیوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مستی ہے ہواؤں میں
رات کی رانی کی
خوشبو ہے فضاؤں میں

ریوڑ کئی بھیڑوں کے
نہر کنارے پر

وہ سلسلے پیڑوں کے

پگڈنڈیوں کے دل دھڑکیں
بستی میں پکی
جب بچھنے لگی سڑکیں

بور آ گیا آموں میں
رونقیں جاگ اٹھیں
دیہات کی شاموں میں

بجلی کے لگے کھمبے
کٹ گئے رستے میں
جو پیڑ بھی تھے لمبے

"محبت کے پھول" کے پیش لفظ میں حیدر قریشی نے اعتراف کیا ہے "یوں تو ہر ماہیا اپنی جگہ مکمل نظم ہوتا ہے تاہم میرے بعض ماہیے ایک ہی موضوع کے تحت ایک ہی لڑی میں ہوتے گئے ۔اپنے مولا کے حضور، سوہنی دھرتی، مکالمے کی صورت میں، ایک باغ میں ملنے والی ایک لڑکی، ۵ جولائی ۱۹۷۷ء، شادی بیاہ، پھر وہی داستاں اور اکتساب کے عنوان سے جو ماہیے اس کتاب میں شامل ہیں سب اپنی اپنی موضوعاتی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں اور یہ ماہیے اسی تسلسل میں ہوئے تھے۔"

ان موضوعاتی ماہیوں میں سے اپنے مولا کے حضور، سوہنی دھرتی، مکالمے کی صورت میں، ایک باغ میں ملنے والی ایک لڑکی، اور شادی بیاہ کے زیر عنوان جو ماہیے پیش کئے گئے ہیں وہ پنجابی ماہیے کی روایت سے منسلک رہ کر آگے کے سفر کا منظر پیش کرتے ہیں جبکہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء میں پاکستان کے طویل مارشل لاء کی داستان بیان کی گئی۔ "پھر وہی داستاں" میں پرانی داستانوں سے بات آگے بڑھا کر چاہت کے خزانوں تک پہنچنے کی خواہش ملتی ہے اور اکتساب میں حضرت علیؓ

کے بعض فرمودات کو ماہیے کے روپ میں منظوم کیا گیا ہے۔ یہ تینوں تجربے نئے ہیں۔ ماہیا ایسے تجربوں کو اپنے اندر جذب کرتا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ بڑی بات یہ ہے کہ اردو ماہیے میں موضوعاتی تجربات کا آغاز ہو چکا ہے اور اس کی پہل حیدر قریشی نے کی ہے۔

آوازیں بھی آئیں گی
رو کے کبھی ہنس کے
پیچھے سے بلائیں گی

گھبرا کے یا پھر ڈر کے
مڑ کے اگر دیکھا
ہو جاؤ گے پتھر کے

ان دیکھے جہانوں تک
دل نے پہنچنا ہے
چاہت کے خزانوں تک

(پھر وہی داستان سے)

اللہ کو جان لیا
جس نے بھی اپنے
من کو پہچان لیا

اب سمجھ میں آیا ہے
علم کے نقطے کو
جہلاء نے بڑھایا ہے

دنیا میں خراب ہوا
محبوب اور محبت

میں عشق حجاب ہوا

(حضرت علیؓ کے بعض فرمودات سے اکتساب)

حیدر قریشی ماہیے کی نغماتی ہیئت کو واضح اور اس کے ثقافتی رنگ کو نمایاں کر کے محبت کے پھول ہر دل میں مہکنے کی دعا کرتے ہیں۔

جب ماہیے کی بات آئی
ساتھ ہی سکھیوں کے
پیتل کی پرات آئی

جھجھری بھی بجاتے ہیں
تال پہ تالی کے
جب ماہیے گاتے ہیں

کلیاں سی چٹک جائیں
پھول محبت کے
ہر دل میں مہک جائیں

ہر ماہیا بنیادی طور پر ایک مکمل نظم اور پورا گیت ہوتا ہے۔ حیدر قریشی کے ماہیے کسی خاص عنوان یا کسی خاص موضوع کے ساتھ ساتھ بغیر کسی حوالے کے بھی ملتے ہیں جن کا مطالعہ اپنی جگہ دلچسپی پیدا کرتا ہے۔

بچپن کا زمانہ تھا
تتلی کے رنگوں
سے لکھا فسانہ تھا

چمیلی کی کلیاں تھیں
اپنی جوانی تھی

اور شہر کی گلیاں تھیں

رُت آگئی پھولوں کی
جان کے ہوتی ہوئی
معصوم سی بھولوں کی

اس حال فقیری میں
عمریں بیت گئیں
زلفوں کی اسیری میں

زلفوں سے رہا ہو جا
رب تری خیر کرے
جا ہم سے جدا ہو جا

کیا لطف رہائی کا
دل جب سہہ نہ سکے
دکھ تیری جدائی کا

خوشیوں کی گھڑی آئی
آنکھ کے صحرا میں
یادوں کی جھڑی آئی

اٹھتی ہے کسک پھر بھی
گر چہ ابھی تک ہے

جوبن کی مہک پھر بھی

ہر دکھ ہم بھول آئے
موم ہوئے جب تم
کیکر پہ بھی پھول آئے

کچھ ہم نے ہی پی لی تھی
یا پھر سچ مچ ہی
وہ آنکھ۔۔نشیلی۔۔تھی

میں اک ازلی راہی
ساتھ نہ ہو یونہی
پھر سوچ لے ماہی

چاہت کی گواہی تھے
ہم بھی کبھی یارو
اک ہیر کے ماہی تھے

حیدر قریشی کے ماہیوں نے اردو ماہیا نگاری کو عطر بیز کیا ہے اور نئی ریت کا اردو شاعری میں اضافہ کیا ہے جس میں جلوہ ہائے رنگ ہے۔انفرادیت،متانت،اعتدال اور حسن ہے۔

اس درد خزانے کے
چل دو نفل ہی پڑھ
رب کے شکرانے کے

(''محبت کے پھول'' کے بعد کا ایک ماہیا)

ماہیا نگاری بنام حیدر قریشی

ڈاکٹر جمیلہ عرشی

اُردو دنیا کا دانشور طبقہ بالخصوص شعر وسخن کے شائقین حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ آج ماہیا نگاری اور حیدر قریشی کا نام لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ماہیا نگاری کے فروغ کے لئے موصوف نے جو مستحسن کوششیں کی ہیں وہ آفتاب کی مانند روشن بھی ہیں اور قابل ستائش بھی۔ انکی مساعئ جمیلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ شعری اصناف میں گزشتہ چند سالوں سے "ماہیا" کا طوطی بول رہا ہے۔
ماہیا جو دراصل ایک پنجابی لوک صنف ہے وہ اب جرمنی سے اُردو کی نئی بستیوں میں دھوم مچاتی ہوئی ہندوستان اور پاکستان میں فتح ونصرت کے جھنڈے گاڑ رہی ہے۔ شعراء نے اسے بڑے خلوص کے ساتھ گلے لگایا ہے اور قارئین نے اسے پذیرائی بخشی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں کئی شعراء کے ماہیوں کے مجموعے منظر عام پر آئے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسکی مقبولیت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور ماہیا نگاری نے اُردو غزل کی طرح بین الاقوامی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔ اُردو میں ماہیا نگاری کا بنیاد گزار کوئی بھی ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ حیدر قریشی نے اسے بامِ عروج پر پہنچایا ہے اور عالمی سطح پر اسکے وجود کو قائم کیا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ہمت رائے شرما صاحب نے اُردو ماہیا کی جس مشعل کو روشن کیا تھا اُسی مشعل کو حیدر قریشی بڑے یقین اور اعتماد کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے ہیں اور اسکی روشنی سے اُردو دنیا کو منور کرنے کیلئے حتی الامکاں کوشاں ہیں۔
حیدر قریشی نے پنجابی ماہیا کے مزاج اور وزن کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے اُردو میں ماہیے لکھے اور دوسرے شعراء کو اسی وزن میں ماہیا نگاری کی ترغیب دلائی۔ مساوی الوزن مصرعوں میں ماہیے لکھنے والے شعرا کو پنجابی ماہیا کے درست وزن سے آگاہ کیا اور ماہیا کے وزن وبحر سے متعلق نہ صرف تحریری بحث ومباحثہ میں کھُل کر حصہ لیا بلکہ ماہیا کے مزاج، اوزان کی جانب مخالفین اور ناقدین ادب کی توجہ مبذول کرائی اور بیشتر شعراء کو ہم خیال بھی کیا۔

(۲)		(۱)	
فعلن فعلن فعلن		مفعول مفاعیلن	
فعلن فعلن فع		فعل مفاعیلن	
فعلن فعلن فعلن		مفعول مفاعیلن	

اورانہیں ہنگاموں کے درمیان موصوف نے اس سہ سطری صنفِ سخن میں موضوعاتی تجربے کئے اور اپنے اردو ماہیوں کا مجموعہ "محبت کے پھول" ۱۹۹۶ء میں شائع کیا۔اس مجموعے کی اشاعت کے فوراًبعد بڑی تیز رفتاری کے ساتھ اردو غزل، گیت کے معتبر شعراء نے حیدر صاحب کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا۔علاوہ ازیں ماہیا نگار شعراء کے جتنے بھی مجموعے اب تک اشاعت پذیر ہوئے ہیں ان میں اکثر و بیشتر حیدر قریشی کے تاثرات بطور پیش گفتار ضرور شامل ہیں جن سے بخوبی یہ بات اُجاگر ہوتی ہے کہ حیدر قریشی ماہیا نگاری کے قبلہ و کعبہ بن گئے ہیں اور پنجابی زبان کی اس صنف کے تمام راستے جرمنی تک جاتے ہیں۔عالمی ماہیا تحریک کے وہ علم بردار بن کراُ بھرے اور اب سرخیل بن گئے ہیں۔

حیدر قریشی اولاً غزل کے شاعر ہیں اور اپنی غزل گوئی کے بارے میں انہوں نے ایک جگہ کہا ہے۔

اک فرشتہ ہے عشق کا حیدؔر   مجھ پہ جو شاعری اُتارتا ہے۔

اور جب ماہیا گوئی کی طرف مائل ہوئے تو اس طرح ارشاد ہوا۔

جب ماہیے کی بات آئی
ساتھ ہی سکھیوں کے
پیتل کی پرات آئی

اور اسی پیتل کی پرات میں "محبت کے پھول" سجائے اور انہیں اپنی شاعری کا نذرانہ بنا دیا۔"محبت کے پھول" عالمی سطح پر اُردو ماہیوں کا اولین مجموعہ ہے جس کے ہر ماہیے میں تخلیق کار کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ماہیے جو رنگا رنگ اور بوقلموں ہیں، ماہیے جو رنگینی و رعنائی سے مملو ہیں، ماہیے جن میں کہیں "صحراؤں کی گرمی" ملتی ہے، تو کہیں "پھولوں کی نرمی"۔اور اگر کہیں "وصال کا موسم" اور "پھول رُت" نظر آتی ہے تو وہیں انکی "عمر گریزاں"، "درد کی جاگیریں" اور "سلگتے خواب" لے کر آجاتی ہے۔کبھی وہ "اپنے مولا کے حضور" پیش ہیں تو کبھی "ایک باغ میں ملنے والی

ایک لڑکی" سے "محبت کے پھول" چننے کے لیے کہتے ہیں۔ابھی لگتا ہے کہ وہ "داستانیں" کہہ رہے ہیں اور پھر "مکالمے کی صورت میں" "شادی بیاہ" کی بات کرنے لگتے ہیں۔یہ سب حیدر قریشی کے ماہیوں کے عنوانات ہیں جن سے موضوعات کا تنوع معلوم ہوسکتا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ حیدر صاحب کے ماہیوں کی دنیا بڑی نرالی ہے اور وہ اس دنیا کے شہزادے لگتے ہیں جو ماہیوں کے رَتھ پر سوار ہو کر محبت کے پھول برسانے نکلا ہے۔۔۔۔دیکھئے دیکھئے!۔۔بارگاہ ایزدی میں وہ سجدہ ریز ہیں۔گڑگڑا کر خدا سے دعا مانگ رہے ہیں مگر یہ دعا وہ اپنی ذات کیلئے اپنے سکھ آرام کیلئے نہیں کرر ہے بلکہ دنیا اور دنیا والوں کی فلاح ہی اُنکی دعا ہے، اُنکی التجا ہے، اُنکا مدعا ہے:۔

دنیا پہ کرم کردے	نفرت کے اندھیروں کو
پیار کی سینوں میں	توڑ مرے مالک
پھر روشنیاں بھر دے	ظلمات کے گھیروں کو

لیکن ماہیا نگار حیدر قریشی کو معلوم ہے:

پھیلے تھے اُجالے سے
کملی والے کے
پُر نور حوالے سے

دنیا والوں کے ساتھ "سوہنی دھرتی" کے بھی حیدر صاحب شیدائی ہیں۔انہوں نے مختلف ماہیوں میں اسکا گُن گان کیا ہے اور بتایا ہے کہ دھرتی کا مُکھ نورانی ہے، کھیت اسکی پیشانی، پیڑ اسکے جھومر ہیں۔اسکی گردن میں دریاؤں کی مالا پڑی ہوئی ہے اور

پھولوں کی ہے نرمی بھی
اسکی محبت میں
صحراؤں کی گرمی بھی

حیدر قریشی کو رشتے ناطے بڑے عزیز ہیں۔رشتوں کی پاکیزگی کے وہ قائل ہیں اور ہر رشتے کی عظمت کو انہوں نے کئی طریقوں سے اپنے ماہیوں کے وسیلے سے پیش کیا ہے۔رشتے داروں کی قدر دانیاں سادہ بیانی کے ساتھ ملاحظہ ہوں:۔

برگد کی جٹائیں ہیں	تب آنکھ برستی ہے

ساتھ مرے اب بھی
ابو کی دعائیں ہیں

دل میں کہیں چھپ کر
ماں جب مری ہنستی ہے۔

ماضی کے حسیں سائے
چار مری بہنیں
اور چار ہیں ماں جائے۔

رنگت مرے خوابوں کی
اسکے بدن میں ہے
خوشبو سی گلابوں کی۔

دریا کی روانی ہے
اب مرے بیٹوں میں
میری گزری جوانی۔

داستانیں چاہے عشق و محبت کی ہوں، چاہے تہذیب و ثقافت کی اور یہ اساطیر ہوں کہ روائیتی، ہمیں ماضی کے زمانے میں لے جاتی ہیں۔ ماہیا نگار حیدر قریشی نے بھی ماضی کے دریچوں میں جھانکا ہے اور مختلف داستانیں ماہیوں کی مختصر ہیئت میں ترتیب دی ہیں۔ یہ داستانیں چند لفظوں میں سمٹ کر اپنی وُسعت اور پھیلاؤ کا اندازہ کراتی ہیں اور ماہیا نگار کے تخلیقی رویہ کو بخوبی ظاہر کرتی ہیں۔ جامع و مانع یہ ماہیے منظوم داستان گوئی کا بہترین نمونہ ہیں:۔

جب بیٹھی تھی مانجھے میں
ہیر میں تھا رانجھا
اور ہیر تھی رانجھے میں۔

گھبرا کے یا پھر ڈر کے
مڑ کے اگر دیکھا
ہو جاؤ گے پتھر کے۔

اک بنسی نشانی تھی
کرشن کنہیا اور
رادھا کی کہانی تھی۔

اک ظالم جادوگر
راہ میں آ آ کے
پھونکے گا کئی منتر۔

داستانوں کے پردے میں یادیں بھی چھپی ہوتی ہیں۔ ہر یاد کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے اور جب یہ کہانی یاد آتی ہے تو دل میں کسک پیدا کرتی ہے۔ ویسے بھی درد و غم اور رنج و الم ماہیے کی بنیادی ضروریات ہیں۔ حیدر قریشی ایک دردمند دل رکھتے ہیں اور یادیں انہیں بھی ستاتی ہیں۔ اسی لئے تو

اُن کے ماہیے ایک طرح سے اُن کے لئے "درد کی جاگیریں " ہیں جنہیں وہ دل و جان سے عزیز رکھتے ہیں:۔

خوشیوں کی گھڑی آئی
آنکھ کے صحرا میں
یادوں کی جھڑی آئی۔

ماضی کی دشاؤں سے
کون بلاتا ہے
یادوں کی گپھاؤں سے۔

کونجوں کی قطاریں ہیں
درد سے کُرلائیں
یادوں کی جوڑاریں ہیں۔

زخموں سے بھرا سینہ
عشق کی دنیا میں
جینا ہے یہی جینا۔

آنکھوں میں ستارے ہیں
ہجر کی شب میں بھی
وہ پاس ہمارے ہیں

پھرتے ہیں اکیلے میں
ساتھ نہیں کوئی
صدمات کے میلے میں۔

ماہیا کو اس وقیع ماہیا نگار نے جو وقعت دلائی ہے وہ تو عیاں راچہ بیاں کی حیثیت رکھتی ہے مگر بذاتِ خود ایسے دلنواز اور جاذب نظر ماہیے کہے ہیں جو دلنوازی کی آخری حد تک پسندیدہ ٹھہرتے ہیں۔ نئے موضوعات کو ماہیے میں سمونا اور پھر زندگی کے منظر نامے سے جوڑنا بہت بڑی بات ہے۔ ماہیا کے سہ سطری منظر نامے میں کہیں وہ شادی بیاہ کی کیفیت دکھاتے ہیں تو کہیں رخصتی کا نظارا پیش کرتے ہیں۔ اگر ایک طرف دیہات کی سیر کرائی ہے تو وہیں باغ میں ملنے والی لڑکی سے متعارف کرایا ہے۔ یہ مناظر بھی دیکھئے:۔

مہندی جب لال ہوئی
شرم سے بنو بھی
تب لال گلال ہوئی

اشکوں کی صداؤں میں
رُخصتی ہوتی ہے
خوشیوں کی دعاؤں میں۔

شیشم کی قطاریں ہیں

لُو کے تھپیڑوں میں
راحت کی بہاریں ہیں۔

اگر ہم حیدر قریشی کے ماہیوں کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو انکی رنگارنگی ہمیں انگشت بدنداں کردے گی۔ رومان پرور ماہیے ملیں گے تو زندگی بخش ماہیے بھی قطار اندر قطار نظر آئیں گے۔ انہوں نے ماہیوں میں جو بات بھی کہی ہے نہایت سلیقے سے کہی ہے اور شاعرانہ انداز میں کہی ہے۔ ماہیوں کی دھنک دیکھیے جو نہ جانے کتنے رنگوں پر مشتمل ہے:۔

وہ نین غزالی تھے
فیصلہ کیا ہوتا
سب اسکے سوالی تھے۔

وہ ہاتھ دعا والے
جسم عطا والا
اور ہونٹ شفا والے۔

گندم کی کٹائی پر
چھوڑ دیا گاؤں
گوری کی سگائی پر۔

کچھ ہم نے ہی پی لی تھی
یا پھر سچ مُچ ہی
وہ آنکھ نشیلی تھی۔

بیکار کے رونے سے
کچھ بھی نہیں ملتا
پانی کو بلونے سے۔

اظہار ضروری ہے
پیارا گر ہو تو
اقرار ضروری ہے۔

لفظوں سے پھول کھلانا کوئی حیدر قریشی سے سیکھے۔ ان کے ماہیے پڑھ کر واقعی دل میں پھول کھل جاتے ہیں جو مشامِ جاں کو معطر کر کے ایک سدا بہار کیفیت چھوڑ جاتے ہیں۔ بحیثیت ماہیا نگار اور ماہیا نگاری کے علم بردار حیدر صاحب ممتاز اور مقتدر ہیں اور رہیں گے۔

تھے اپنی ہی لہروں میں
عمر گزاری جو
پنجاب کے شہروں میں

(''محبت کے پھول'' کے بعد کا ایک ماہیا)

حیدر قریشی کی غزلیہ شاعری۔ ایک تجزیہ

ناصر عباس نیر

محبت حیدر قریشی کی غزل کا غالب و مقتدر موضوع ہے حیدر قریشی کے ہاں محبت کا موضوع ٹریٹمنٹ اور اسلوب کے حوالے سے کلاسیکی غزل والی محبت سے کچھ زیادہ لگا نہیں کھاتا جس میں بقول رشید احمد صدیقی غزل کے شاعر کو ترک نسب کرنا پڑتا ہے۔ یعنی اپنے انفرادی تجربات وذاتی طرزِ اظہار کو غزل کی مخصوص ڈھلی ڈھلائی روایت پر قربان کرنا پڑتا ہے۔ حیدر قریشی کے لیے تخلیق شعر کا عمل کشف اور سیاحت باطن کا وسیلہ ہے چنانچہ وہ ایک الگ اور اپنی راہ پہ چلے ہیں (اور یہ راہ ایک حد تک اردو شاعری کے جدید اور جدید تر رجحان سے ہم رشتہ ہے)

حیدر قریشی کی شاعری میں محبت کا جو انداز اُبھرا ہے اس کی دو سطحیں بہت نمایاں ہیں پہلی سطح پر شاعر اپنی محبوبہ سے ایک گوشت پوست کے انسان کی طرح ملتا اور لپٹتا نظر آتا ہے چونکہ یہ محبت یک طرفہ نہیں اس لیے شدت جذبات کی گرمی نیز آبگینے کا تندیٔ صہبا سے پگھلنے کا منظر بھی موجود ہے (جو دراصل حیاتیاتی طلب کے شدید ہونے کا لازمی نتیجہ ہے)۔ دوسری سطح وہ ہے جہاں شاعر کو محبوبہ کا وصل محض ایک خواب دکھائی دیتا ہے وہ اس سے مل کر حسی اور ذہنی لذت کے چند ناقابل فراموش لمحے ارزانی کر کے غالباً ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاتی ہے نتیجتاً شاعر تنہائی، یاد، اداسی، کرب جدائی اور سلگتے خوابوں کے وحشت ناک بگولوں میں گھر جاتا ہے۔ ویسے تو محبت کا یہ تجربہ جو لذتِ وصل اور کرب جدائی کی کیفیات سے مرتب ہوا ہے اچھوتا اور منفرد نہیں ہے شاید ہر انسان اس سے گزرتا ہے مگر حیدر قریشی کی غیر معمولی حساسیت نے اس "معمولی تجربے" کو اندازِ دگر محسوس کیا ہے۔۔ کیسے؟ اس کی تفصیل پیش خدمت ہے پہلے دو شعر ملاحظہ کیجیے۔

محبتوں کے سفر میں عجب شریک ملا
کہیں ٹھہرتا نہیں ہے سفر نہیں کرتا

اس کے لبوں پہ میری محبت کے واسطے
انکار بھی نہیں تھا تو ہاں بھی نہیں رہی

شاعر کا محبوب بیک وقت اس کے پاس ہے بھی اور نہیں بھی! یہ ایک ایسی کیفیت ہے جس میں وصل کی شیرینی، ہجر کی تلخی ایک خاص تناسب سے گھلی ہوئی ہے۔ وصل اور ہجر کے درمیان کی نسبت شاعر کے جمالیاتی احساس کی زائیدہ ہے عام انسان اور بعض شاعر محبت کے تجربے کی کسی ایک سطح سے چپک کر رہ جاتے ہیں وہ یا تو عہدِ رفتہ کی سنہری سہانی گھڑیوں کی یاد میں ڈوبے رہتے یعنی ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتے ہیں یا پھر کرب جدائی کا سامنا نہ کر سکنے کے باعث رونے اور آہ بکاہ میں مصروف رہتے ہیں۔ حیدر قریشی کے ہاں محبت کی یہ دونوں سطحیں ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں، باالفاظ دیگر وہ اپنے تخلیقی عمل میں کسی ایک مقام پر ٹھہرتے نہیں۔ اب یہ اشعار دیکھیے جن میں محبت کی دونوں سطحوں کا ادغام ایک دوسرے رنگ میں ظاہر ہوا ہے۔

عجیب کرب و بلا کی ہے رات آنکھوں میں
سسکتی پیاس لبوں پر فرات آنکھوں میں

پیاسے سمندروں کی طرف تیرتے رہے
اپنے مقدروں کا لکھا سوچتے رہے

نجانے کب کوئی آ کر بجھائے پیاس مری
میں کتنی صدیوں سے پیاسا ہوں پانیوں کا طرح

بلاشبہ ان اشعار پر پیاس، محرومی اور نا آسودگی کا غلبہ ہے۔۔۔۔ مگر یہ کیفیات محض کرب جدائی کی پرچھائیاں نہیں ہیں اصلاً شاعر دکھوں اور محرومیوں کو زندگی کی آفاق گر وسعتوں پر پھیلا ہوا محسوس کر رہا ہے چنانچہ اپنے اظہار کے لیے شاعر نے جو علامتیں منتخب کی ہیں وہ بھی کثیر المعنی ہیں مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا مندرجہ بالا اشعار میں محبت کی مذکورہ سطحیں ایک گرہ کی شکل میں گندھی ہوئی ہیں اس لیے یہاں پانی اور پیاس کا ذکر متوازی طور پر آیا ہے۔ یعنی شاعر جس چیز کی شدید خواہش

میں بے دم ہے اس سے ملتی جلتی شے اس کے بہت قریب موجود ہے مگر اس سے پیاس نہیں بجھائی جا سکتی یہ دراصل اسی کیفیت (جس میں وصل کی شیرینی اور جدائی کی کڑواہٹ گھلی ہے) کا ہی ایک دوسرا رخ ہے۔

آنکھوں میں فرات اور لبوں پر پیاس یا پانیوں کی طرح پیاسا ہونے کی کیفیت کے بھی انوکھے اسرار ہیں یہ دراصل "پانی" اور "پیاس" کا انوکھا سنجوگ ہے جو شاعر کے دوسرے تخلیقی احساسات کی نمود کرتا ہے مثلاً شاعر پیاس کی شدت کے عالم میں پانی اور پیاس کے مابہ الامتیاز سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور ایک طرح کی "اکائی وجود" پیدا ہو جاتی ہے۔

انتہائے اجنبیت میں وہ آیا ہے مقام
اجنبی سارے کے سارے جانے پہچانے لگے

اس طرح کے احساسات خواہشوں کی بوجھل ارضی بنیادوں کو کمزور کر کے انہیں غیر ارضی رخوں کی جانب مائل پرواز کرتے ہیں یوں انسان تزکیہ نفس اور ارتقاع کی منزل کی جانب بڑھتا ہے مگر انتہائے اجنبیت کا مقام سخت مشکل بھی ہے۔ یہ ایک لحاظ سے اس صوفیانہ تصور کے مماثل ہے جس کے مطابق انسان دکھوں اور محرومیوں کو من جانب اللہ قرار دے کر راضی بہ رضا ہو جاتا ہے۔ تاہم ہے تو یہ محرومی و نا آسودگی کی انتہا ہی، اس لیے ایک پل صراط ہے۔ یہاں مثالی صبر و تحمل اور نظم و ضبط کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ حیدر قریشی کے پاس یہ سب موجود ہے اس لیے وہ اس پل صراط پر سے بخیر و خوبی گزر آئے ہیں نا آسودگی نے ان کے ہاں منفی ردعمل کو تحریک نہیں دی بلکہ وہ اس کی مدد سے حقیقت کے نئے منطقوں کی دریافت کے قابل ہو گئے ہیں یہاں دو شعر باری باری ملاحظہ فرمائیں۔

حقیقتوں کے سرابوں میں کھو چلا ہوں میں
یقیں دلاؤ مجھے بدگمانیوں کی طرح

سوچ کے پھیلے ہوئے صحرا میں تنہا دیکھ کر
پھر سرابوں کے حقائق مجھے بہکانے لگے

پہلے شعر میں حقیقت سرابوں کی دھند میں "بے نام و نشان" ہے (اور یہ نا آسودگی کی کیفیت کے

باعث ہے یعنی شاعر عین پل صراط پر ہے) دوسرے شعر میں شاعر سرابوں کی حقیقت کا مشاہدہ کر رہا ہے کیونکہ وہ ذہنی اور تخلیقی اعتبار سے فعال ہے وہ اپنی خواہشوں سے آکاس بیل کی طرح نہیں چمٹا بلکہ خواہشوں کے حقائق دریافت کر کے شاعر چیزوں کے ظاہری امتیازات کا پردہ چاک کر کے ان کے عقب میں موجود "اکائی وجود" تک پہنچتا ہے۔

محبت اگرچہ حیاتیاتی طلب کی زائیدہ ہے مگر اس کے ساتھ یہ ایک جمالیاتی اور روحانی تجربہ بھی ہے تاہم محبت جمالیاتی تجربہ تبھی بنتی ہے جب تخلیق کار خواہش کی "کشش ثقل" سے خود کو آزاد کرانے کی تخلیقی صلاحیت سے مالا مال ہو۔ بعض صوفیا رقص کر کے خود پر وجد کی حالت طاری کرتے ہیں تاکہ اپنے Self کو خواہشوں کے ناروا بوجھ سے نجات دلائی جا سکے اور ایک برتر ماورا ہستی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا جا سکے۔ محبت کا جمالیاتی تجربہ صوفیا کے تجربے سے ملتا جلتا ہے۔ حیدر قریشی اس جمالیاتی اور روحانی تجربے سے گزرتے ہیں۔ جس طرح صوفی رقص کرتے کرتے اپنے بدن اور گردوپیش کو بھول کر احساس و عرفان کے ایک انوکھے عالم میں پہنچ جاتا ہے اس طرح حیدر قریشی محبت کے سفر میں "بدن" کے انوکھے بھید اور اسرار دریافت کرتے ہیں یعنی "بدن" کی کشش ثقل سے آزادی پاتے ہیں۔

وہ بھید وہ اسرار کھلے مجھ پہ بدن کے
دنیا میں ابھی تک جو کسی نے نہیں دیکھے

یہ اسرار کیا ہیں؟ اس کی وضاحت نہیں ہو سکتی دراصل یہ احساس کی عرفان کی ایک منزل ہے شاعر "بدن" (جو ارضی اور دنیوی زندگی کی علامت ہے) سے ترکِ تعلق نہیں کرتا بلکہ وہ "بدن" کی حقیقت کے چھپے گوشے دریافت کرتے ہوئے ایک نئی سطح پر اس سے وابستہ ہوتا ہے چونکہ وہ تخلیقی میدان میں متحرک ہے، کسی ایک مقام یا منزل سے چپک کر رہ جانے پر مائل نہیں، اس لیے وہ ایک مسلسل سفر میں ہے۔ تخلیقی سفر میں وہ اپنے Self اور اشیاء و مظاہر کے درمیان یکتائی کے ایک انوکھے احساس اور رشتے کا عرفان پاتا ہے۔

ہم ازلی آوارہ، جن کا گھر ہی نہیں ہے کوئی
لیکن جن رستوں سے گزریں رستے گھر ہو جائیں

صوفی سادھو بن کر تیری کھوج میں ایسے نکلیں
خود ہی اپنا رستہ، منزل اور سفر ہو جائیں

ہے ماہِ شبِ ہجر بھی وہ ماہِ وصالاں
یوں جمع کبھی دونوں مہینے نہیں دیکھے

ان اشعار میں گھر اور رستہ، منزل اور سفر، ہجر اور وصال کے درمیان دوئی باقی نہیں رہی۔ شاعر کے Self کے جادوئی دائرے میں داخل ہو کر ان اشیاء و مظاہر کے شخصی امتیاز ماند پڑ گئے ہیں۔ سچے جمالیاتی تجربے کا ایک اہم ترین وصف ہی یہ ہے کہ اس میں زمانی فاصلے اور مکانی فرق تحلیل ہو جاتے ہیں۔ مگر انسانی شعور اپنی کارگردگی کے لیے زمانی فاصلے اور مکانی فرق کو قائم رکھنا چاہتا ہے، یوں جمالیاتی تجربہ شعور کی منطقی اور استدلالی حد بندیوں کو عبور کرنے کا تجربہ بھی ہے اور وہی تجربہ حیدر قریشی کو نامعلوم/ناموجود کے پراسرار، گریز پا دیار کی جستجو پر مائل کرتا ہے۔

حیدر کے ہاں نامعلوم کی جستجو کا چراغ روشن تو ہو گیا ہے، مگر اس کی لو ابھی مدھم ہے۔ ابھی ان کے اشعار کا ایک بڑا حصہ عشق و عاشقی کے تجربات سے متعلق ہے۔ حیدر کو عشق کے تجربے کی پیش پا افتادگی کا احساس ہوتا ہے، خاص طور پر اس وقت جب اس کا سماجی اور اخلاقی شعور اس کے جوان بچوں کی صورت میں اس کے سامنے آتا ہے۔

حیدؔر ادب کو چھوڑ کے فکر معاش کر — اپنا نہیں تو بچوں کا احساس کر ذرا
چند برسوں تک میرا بیٹا جواں ہونے کو ہے — کاروبارِ عشق سے مل جائیں گی پھر فرصتیں

مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے۔ یہ جذبہ محبت ہی تھا، جس نے شاعر کو اپنی ذات کے اندر غوطہ زن ہونے کی تحریک دی اور اسے اسرار کو مس کرنے کے قابل بنایا۔ جوں جوں شاعر اسرار کی جانب بڑھے گا (یہ عمل آہستہ روی سے ہی انجام پائے گا) وہ واضح منزل کے احساس سے بیگانہ اور سفر کو عزیز جاننے کا رویہ اپنا لے گا۔ واضح منزل کا قطعی شعور امکانات کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ یہ سوا نیزے پر آئے سورج کے مانند ہے، جس کے سامنے متخیّلہ راکھ ہو جاتی ہے۔ متخیّلہ اپنی کارگردگی کے لیے شام کے جھٹپٹے کا تقاضہ کرتی ہے، جس میں چیزیں کسی حتمی اور "ناگزیر" مفہوم کی حامل نہیں ہوتیں اور نہ ہی ایسے گھپ اندھیرے میں گرفتار ہوتی ہیں کہ ان کی کوئی اپنی معنویت ہی نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں تخلیق کا عمل شعور اور لاشعور کے سنگم پر انجام پاتا ہے ۔شعور "واضح منزل"یا" حتمی مفہوم" کا استعارہ ہے اور لاشعور امکانات یا ناموجود کا دوسرا نام ہے۔یعنی سچے تخلیقی عمل میں "منزل اور مفہوم"امکانات یا ناموجود میں گھلے ملے ہوتے ہیں۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عمدہ تخلیق کار معنی در معنی کے ایک پراسرار جہان میں سفر کرتا ہے۔حیدر قریشی کے درج ذیل اشعار ایک پراسرار جہانِ معنی سے ہی متعلق ہیں۔

ایک ان دیکھے کی سوچوں میں گھرا رہتا ہوں
اس کی آنکھیں،اس کا چہرہ سوچتا رہتا ہوں

منزلوں نے تو مجھے ڈھونڈ لیا تھا حیدر
پھر میرا شوق سفر مجھ کو چرا لایا تھا

اسے پھر اگلے سفر کے لئے ابھرنا ہے
وہ جس کو شام کی دہلیز پر اترنا ہے

مسافتوں میں ہوں کس پیکرِ ہوا کے لئے
جو کوئی رنگ نہیں ہے،کوئی صدا بھی نہیں

مسافتوں کی لگن تو فقط بہانا تھا
مسافروں کو بہرحال آگے جانا تھا

آخری تین اشعار بڑے معنی خیز ہیں۔"شام کی دہلیز "ایک پڑاؤ ہے جہاں سے مسافر ایک نئے سفر کا آغاز کریں گے،کس سمت میں اور یہ سفر کس نوعیت کا ہوگا؟ یہی بات اسرار پیدا کرتی ہے۔ رنگ اور صدا سے بے نیاز ''پیکرِ ہوا'' بھی ایک پراسرار وجود ہے،جو مسافت کی لگن کو مہمیز کرتا ہے۔ حیدر قریشی کے ہاں ناموجود کو مس کرنے کی لگن ایک زندہ ارضی تجربے کی کوکھ سے پھوٹی ہے،اس لیے اس میں توازن اور اعتدال کی ایک دلآویز کیفیت ہے۔جدیدیت کے رسیا اکثر شعرا کے ہاں

"نامعلوم کے اسرار" کے نام سے بے معنی ابہام اور بے کنار تجریدیت پائی جاتی ہے۔قاری اس کا سامنا کر کے خوفناک اجنبیت محسوس کرتا ہے اور بدکتا ہے۔حیدر قریشی کے لیے شعری تجربہ اہم ہے۔لہذا اس کے ہاں ناموجود کے اسرار یا مضامین نو ایک بالکل قدرتی اور متوازن انداز میں بتدریج ابھرتے چلے آئے ہیں۔

توقع ہے کہ "سلگتے خواب" کے بعد جب ان کا نیا شعری مجموعہ آئے گا تو اس میں ناموجود کے اسرار کو جاننے کی جستجو زیادہ فعال اور ہمہ گیر ہوگی۔

''غزلیں،نظمیں ماہیے'' کے بعد کی

حیدر قریشی کی ایک غزل

اس دربار میں لازم تھا اپنے سر کو خم کرتے
ورنہ کم از کم اپنی آواز ہی مدھم کرتے
اس کی انا تسکین نہیں پاتی خالی لفظوں سے
شاید کچھ ہو جاتا اثر، تم گریۂ پیہم کرتے
سیکھ لیا ہے آخر ہم نے عشق میں خوش خوش رہنا
درد کو اپنی دوا بناتے، زخم کو مرہم کرتے
کام ہمارے حصے کے سب کر گیا قیس دوانہ
کونسا ایسا کام تھا باقی جس کو اب ہم کرتے
ہر جانے والے کو دیکھ کے رکھ لیا دل پر پتھر
کس کس کو روتے آخر، کس کس کا ماتم کرتے
دل تو ہمارا جیسے پتھر سے بھی سخت ہوا تھا
پتھر پانی ہو گیا، سوکھی آنکھوں کو نم کرتے
بن جاتا تریاق اسی کا زہر اگر تم حیدر
کوئی آیت پیار کی پڑھتے اور اس پر دَم کرتے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

’غزلیں، نظمیں، ماہیے‘ ایک مطالعہ

ہارون الرشید

غالبؔ نے سچ ہی کہا تھا ’’عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے‘‘۔اس مصرعہ کی ماہیت پر غور کیا جائے تو خیال وفکر کی نت نئی پرتیں کھلتی ہیں اور دل ودماغ پر ایک عجیب احساس اور خیال کی لہریں ابھرنے لگتی ہیں۔۔۔۔۔جب دنیا ایک خیال اور واہمے سے آگے کچھ نہیں ہے تو اس کے اندر روز وشب انسان کی کاوشیں، خوشیاں، محرومیاں اور آزمائشیں کس تناظر میں رکھی جاسکتی ہیں۔اس عالمِ بے کنار میں انسان صدیوں سے اپنی تلاش میں بھی ہے اور اپنی شناخت کی بھی۔یہ نیرنگیاں اور یہ تبدیلیاں کس تماشے کی مظہر ہیں۔یہ بھی انسان اور اس کے شعور کی پہنچ سے دور ہیں۔انسان اپنی مرضی سے نہ تو پیدا ہوتا ہے، نہ ہی دنیا میں کسی چیز پر دسترس رکھتا ہے اور نہ ہی موت کے متعلق اس کی کوئی رضا ہے۔اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ اس دنیائے رنگ وبو میں انسان محض ایک کٹھ پتلی ہے جسے تقدیر کے ہاتھ اپنی منشا سے گھماتے ہیں اور پھر اسے ایک ویرانے میں ڈال دیتے ہیں۔دیکھا جائے تو کسی بھی چیز میں انسان کی کوئی رائے نہیں ہے۔انسان مجبورِ محض ہے۔نہ خوشی کا آسرا، نہ غم سے نجات۔محض چھوٹی چھوٹی چیزوں پر اس کی بے بسی بعض اوقات دیکھی نہیں جاتی۔روتا ہے تو حد کردیتا ہے۔اگر اسے کہیں کسی شے کی طلب ہے تو اکثر یہ عذاب بن کر اسے امید وایقان کے جزیروں میں دربدر پھراتی ہے۔قدرتی مظاہر انسان کے مزاج اور شعور پر اثرانداز ہوتے ہیں۔رشتے اور ناطے انسان کی سوچ اور فکر میں ہمیشہ تغیر اور تبدل لے کے آتے ہیں۔خواہش اور اس کے علاوہ کسی بھی چیز کی تلاش انسان کو ہمیشہ ایک کرب اور یاسیت pessimism کی غلام گردشوں کے اندر چکر کاٹنے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔تو پھر ایسی کیا چیز ہے جو انسان کے لئے سکون اور راحت کا سامان ہوسکتی ہے؟ ایسا کونسا آہنگ ہے کہ جس کے سُروں کی نمی سے وہ آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا کرتا ہے؟ تو ذہن فوراً لفظوں کی طرف پلٹ جاتا ہے۔

لفظ یقیناً اس کائنات کا حُسن ہیں۔ایک ایسا حُسن اور ایک ایسا غالب عنصر (dominant unit) کہ جن کے تصور ہی سے رُوح کے ایوانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں۔انسان کے لئے سب سے اہم زبان ہے اور زبان لفظوں کی محتاج ہے۔انسان لکھنے، پڑھنے اور بولنے کے لئے لفظ کا دست نگر ہے۔لفظ انسانی زندگی کی اسی طرح ضرورت ہیں، جس طرح ہوا، پانی اور خوراک اس کے لئے ناگزیر ہیں۔لفظ دنیا کا حُسن ہیں۔اگر دیکھا جائے تو لفظ کی طاقت زمین سے لے کر آسمانوں تک پھیلی ہوئی ہے۔خدا نے جب اس کائنات کے اندر انسان کے لئے نظام الاوقات کا تعین کیا اور اپنا پیغام ان تک پہنچانے کا قصد کیا تو لفظوں ہی کے ذریعے آسمانی کتابیں ظہور میں آئیں۔قرآنِ حکیم بھی لفظوں سے مزیّن کر کے تمام عالَم کے لئے اتارا گیا۔یہ دنیا اپنے آغاز سے لے کر اب تک لفظوں کے سحر میں مبتلا ہے۔وقت بدلنے کے ساتھ لفظوں کی ترسیل مختلف صورتیں اختیار کرتی رہی۔کہیں لفظ سُر کے ساتھ ہم آہنگ ہوئے۔کہیں گفت وشنید میں شامل ہوئے۔کہیں کہانیوں اور داستانوں کا حصہ بنے اور انہیں حُسن سے مالا مال کیا۔کہیں تصویروں میں مہکے۔کہیں سائنسی ایجادات میں معاون بنے اور کہیں انہوں نے شعروں کے قالب میں ڈھل کر ایک زمانے کو اپنے سحر سے اسیر کیا۔لفظوں کا یہ کھیل اور کرامات ازل سے جاری ہیں اور یقیناً ابد تک جاری رہیں گی۔آج کی دنیا تبدیلیوں اور انقلابات کی زد میں ہے لیکن باوصف اس کے کہ سائنس نے لفظ کی افادیت اور مقام کو کسی اور سمت میں ڈال دیا ہے، لفظ کا مقام اور درجہ نہ تو کبھی کم ہوا ہے اور نہ ہی آئندہ کوئی اسے گھٹا سکتا ہے۔شاعری بھی کئی اور مذہبی، ادبی، سائنسی اور تحقیقی علوم کی طرح لفظ کے آگے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔شاعر کہاں کہاں سے خیال کی ٹکڑیاں اٹھاتا ہے اور انہیں رنگ برنگے حرفوں سے سجاتا ہے۔

شعر کہنا بڑا جاں گسل کام ہے۔کہتے ہیں یہ Abnormal لوگ ہی کر سکتے ہیں۔شاید یہ بات درست بھی ہے۔حیدر قریشی کو دیکھئے کہ وہ اس شاعری کو ایک طویل عرصے سے اپنے سینے سے لگائے قریہ قریہ گھومتے رہے اور آخر دیارِ غیر میں جا کر پناہ لی۔ان کے اس سارے سفر کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ بحیثیت انسان ان سے زندگی میں بہت چھِنا ہوگا لیکن حرف ان سے نہیں چھِن سکے اور یہ ہر موڑ پر ان کے سنگ سنگ رہے۔حرف واقعی انسان کو معتبر بناتے ہیں۔عزّت دیتے ہیں۔شہرت بھی دیتے ہیں اور مال سے بھی نوازتے ہیں۔حیدر قریشی نے

زندگی میں یقیناً بہت کچھ کھویا بھی ہوگا اور پایا بھی ہوگا لیکن حرفوں نے انہیں جو کچھ دیا اس سے وہ کبھی انکار نہیں کر سکتے۔ ان کی اب تک کی شاعری ان کی تخلیق ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' میں موجود ہے اور اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ وہ شاعری سے کس قدر مخلص ہیں۔

حیدر قریشی کی غزل کا جب میں نے مطالعہ کرنا شروع کا تو آغاز سے لے کر آخر تک نہایت احتیاط سے ساری غزلوں کے ایک ایک شعر کو دیکھا، پرکھا اور معیار کی کٹھالی میں پگھلانا شروع کیا تو کئی اشعار نے دامنِ دل کھینچ لیا۔ ان کی غزل ہماری روایت اور تہذیب سے جُڑی ہوئی ہے۔ جس کے اندر وطن کی مٹی کی مہک بھی ہے اور اس سے بے پناہ محبت کا اظہار بھی۔ بعض اشعار میں انہوں نے ہلکے پھلکے اور نیم مزاحیہ انداز میں بدلتی ہوئی روایات اور قدیم ورثے کی زبوں حالی، اور اس سلسلے میں روا رکھی جانے والی بے حسّی پر بھی لطیف پیرائے میں چوٹیں کی ہیں لیکن ان کے بعض اشعار اسلوب اور بیان کے اعتبار سے بڑی تاثیر رکھتے ہیں اور نہایت گہرے رومان میں رنگے ہوئے ہیں۔ حیدر قریشی کی غزل محبت کے استعارے کے گرد گھومتی ہے۔ یہ یقیناً ایک آفاقی موضوع ہے۔ ان کی چند غزلوں کے اکثر اشعار ایک مسلسل مکالمے کی طرح لگتے ہیں، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاں محبت کتنی طاقتور شکل میں موجود ہے۔ یہ محبت جب درد کا ملبوس پہن لیتی ہے تو اس قسم کے شعر سامنے آتے ہیں۔

لبوں میں جس کے محبت کا اسمِ اعظم ہے
نہ جانے پیار کو وہ کیوں امر نہیں کرتا

تم نے کبھی زخموں کے نگینے نہیں دیکھے
عشّاق کے دہکے ہوئے سینے نہیں دیکھے

عجب سزا ہے کہ میرے دعاؤں والے حروف
نہ مسترد ہوئے اب تک، نہ مستجاب ہوئے
تیری لگن میں تجھ سے بھی آگے نکل گئے
تیرے مسافروں کو ٹھہرنا نہ آ سکا

کبھی دریا کی لہروں پر، کبھی صحرا کے سینے میں
محبت کا نیا قصّہ سدا تشکیل ہونا ہے

اہلِ دنیا بھلا اس رمز کو کیسے سمجھیں
عشق رسوا نہیں ہوتا کبھی رسوائی سے

غزل ہماری روایت کا ایک نہایت اہم حصہ ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات میں بھی وسعت آئی ہے۔ ہجرت بھی ہماری غزل کا ایک عرصے سے نہایت اہم اور مضبوط حصہ رہی ہے۔ خصوصاً پچھلے دو ڈھائی عشروں میں جب پاکستان سے بسلسلہ روزگار بڑی تعداد میں افرادی قوت نے بیرون ممالک کا رُخ کیا، اس موضوع کی اہمیت میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ ہجرت کو ہماری غزل میں کئی نامور شعراء نے مختلف انداز سے سمویا ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہجرت کی اس اصطلاح نے اکثر شعراء کی صلاحیتوں کی آزمائش بھی کی ہے۔ حیدر قریشی نے بھی ہجرت کی اور آج وہ وطنِ عزیز سے باہر مقیم ہیں۔ ظاہر ہے وطن کی بات اور ہی ہوتی ہے اور دیارِ غیر کی اور۔ لیکن وہ وطن سے دُور رہ کر بھی اپنی زمین سے اپنے گہرے تعلق کو فراموش نہیں کرتے بلکہ وہ اس پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں، اور فخر کرنا بھی چاہئے کہ انسان کی شناخت ہمیشہ اپنی زمین اور وطن کے حوالے سے ہی ہوتی ہے۔

دشتِ حیرت میں کھڑا ہوں چشمِ حیرت وا کئے
ہیں ابھی غائب، ابھی موجود گھر کے راستے

ابھی کچھ اور چکانے ہیں زمانے کے حساب
اس کے کچھ قرض ابھی تک مِرے سر رہتے ہیں

جرمن احسانات سبھی برحق حیدرؔ
فیض مگر کچھ اور ہی دھرتی ماں کے تھے

حوصلہ دیکھ اک اسیرِ خاک
آسماں کی زمین ڈھونڈتا ہے

اگلی نسلوں میں چلی جائے روانی اپنی
زندگی! ختم نہیں ہوگی کہانی اپنی

رشتے، ناطے، بچپن، جوانی، معصوم عمر کی شرارتیں، محفلیں، آوارگی، کبھی ایک جگہ، کبھی دوسری جگہ، کبھی یہاں کبھی وہاں۔۔۔۔ یہ ساری چیزیں زندگی کے سفر کے ساتھ چلتی ہیں اور انسان کبھی بھی انہیں فراموش نہیں کر سکتا۔ یادیں انسان کا نہایت انمول سرمایہ ہوتی ہیں۔ان میں ماں باپ، بہن بھائیوں، اور بچوں کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے۔حیدر قریشی نے بھی اپنی غزل میں انہیں کہیں نظر انداز نہیں کیا۔تیزی سے ڈھلتی ہوئی عمر کے رائیگاں ہونے کا ان کے ہاں شدید احساس ہے۔ان کے لاشعور میں ماں، باپ جو بچھڑ چکے اور بہن بھائی جو اِن سے دُور ہیں۔اُن سے اِن کی محبت کی شدت بہت واضح ہے۔اس کا ذکر ہماری غزل میں کچھ زیادہ بھی نہیں لیکن حیدر قریشی نے انہیں ہر جگہ یاد رکھا ہے اور بعض اشعار میں ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا گیا ہے

حیدؔر اب اپنی عادتیں، اطوار ٹھیک کر
ابّا بھی چل بسے، تری ماں بھی نہیں رہی

یہ ساری روشنی حیدؔر ہے ماں کے چہرے کی
کہاں ہے شمس و قمر میں جو نُور خاک میں ہے

شاخِ دل یوں تری یادوں سے ہری رہتی ہے
جیسے میووں سے کوئی ڈال بھری رہتی ہے

ماں! ترے بعد سے سورج ہے سوا نیزے پر
بس تری ممتا کا اک سایہ بچاتا ہے مجھے

اپنے بچپن سے جوانی کے زمانے تک کی
سونپ دی بچوں کو ہر ایک نشانی اپنی

آپی اور اپنے بڑے بیٹے کے نام ان کی غزلیں ان کے ساتھ ان کی دلی محبت اور چاہت کی آئینہ دار ہیں۔گفتگو کے لہجے میں ڈھلی ہوئی ان غزلوں کے اندر محبت کا جو سمندر موجزن ہے وہ یقیناً اہلِ درد کے لئے ہے جو محبت کے اس رُوپ کی اہمیت اور مقام سے آگاہ ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ حیدر قریشی کے ہاں غزل کا روایتی اسلوب کہیں کہیں بہت پیچھے لے جاتا ہے۔شعر کی نازکی ان کے کئی شعروں میں ملتی ہے۔

عشق اور جذبوں کی آنچ سے تپتے ہوئے اور مروّج و رواں دواں بحروں میں کہے ہوئے شعر کچھ دیر دل کو احساس کی وادیوں میں لیئے پھرتے ہیں۔

کیا دامنِ دل بھرتا کہ حیدؔر کے جہاں پر
کشکول بھی آنکھوں کے سخی نے نہیں دیکھے

لوگ کہتے ہیں کہ تقدیر اٹل ہوتی ہے
ہم نے دیکھا ہے مقدّر بھی بگڑ جاتے ہیں

اہلِ دنیا بھلا اس رمز کو کیسے سمجھیں
عشق رُسوا نہیں ہوتا کبھی رُسوائی سے

عشق کی دنیا کے اَن دیکھے نگر رہتے ہیں
عمر تھوڑی سی ہے اور اتنے سفر رہتے ہیں

یہ سوچ لیجئے پہلے، یہ بازارِ عشق ہے
سودا تو مل ہی جائے گا، پَر نقدِ جان پر

جب اُس نے خاک اڑانے کا ارادہ کرلیا ہے
تو ہم نے دل کے صحرا کو کشادہ کرلیا ہے

جانے کیسے یہاں چلے آئے
ہم کسی دوسرے جہاں کے تھے

حیدر قریشی کی نظمیں ان کی غزل ہی کا پرتَو ہیں۔انہوں نے اپنی نظموں کے لئے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے ان میں سے بعض نہایت تاثیر کی حدّت دیتے ہیں۔الفاظ کی نشست و برخاست سے لگتا ہے کہ ان کے ہاں لفظوں کو برتنے کا سلیقہ موجود ہے۔''درد'' کی یہ سطریں:

یہ ساری صدائیں مری آشنا ہیں
مجھے جانتی ہیں
میں ان سب کو پہچانتا ہوں،
متاعِ فقیراں۔۔۔
یہ سب میرے دردوں کی آواز ہیں
درد جو میرے مونس ہیں
ماں جائے ہیں!

ان چند لائینوں کے اندر دیکھا جائے تو ان میں ایک انسان کی پوری زندگی کا عکس ملتا ہے۔درد جیسے بھی ہوں درد ہی ہوتے ہیں اور شاید ان سے انسان کا تعلق اتنا مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے کہ وہ ماں جائے بن جاتے ہیں۔''پھاگن کی سفاک ہوا'' میں ایک ٹھنڈک اور شانتی ہے۔جس میں شاعر کی شریکِ حیات بھی موجود ہے اور اس کے بچے بھی۔اس کی امیدیں بھی ہیں اور آنے والے سہانے دنوں کا تصور بھی۔اس نظم میں ماضی بھی ہے، حال بھی اور مستقبل کی پرچھائیاں بھی۔''چاند کی تسخیر کے بعد'' کے اندر بے پناہ رومان کی رو بھی چلتی ہے اور ایک تلخ حقیقت کے سائے بھی سرسراتے ہیں۔اس کی آخری لائنوں میں حسرت و یاس کی کیفیت نظم کے مجموعی تاثر کو بہت بڑھا دیتی ہے۔''میں پھر آنسوؤں کا گلا گھونٹ دوں گا'' لڑکپن اور جوانی کے مابین سفر کرتے ہوئے ان

لمحات کی کتھا سناتی ہے جب انسان صحیح معنوں میں شعور سے آشنا ہوتا ہے اور اسے خون کے رشتوں کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔اس نظم میں ایک بہن جب پیا کے دیس سدھارتی ہے تو ایک بھائی کے دل پر کیا گزرتی ہے۔نظم کی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی سطریں دل میں ایک عجیب سا گداز پیدا کر دیتی ہیں۔اس نظم میں حیدر قریشی نے محبت کے رشتوں کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھا ہے۔

''دعا گزیدہ'' اس خوف کا دبا دبا سا اظہار ہے جو انسان پر ہمہ وقت طاری رہتا ہے۔یہ ایسا خوف ہے جو کبھی انسان کے دل سے نہیں نکلتا۔اس دنیا میں وہ لوگ جن سے آدمی کے خون کے رشتے ہوتے ہیں، کسی موڑ پر بچھڑنے لگتے ہیں تو اسے دنیا کی بے ثباتی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔اس نظم میں ماں، باپ کی مفارقت کے دکھ بھی لہراتے ہیں اور موت کا ایک نادیدہ خوف بھی۔مگر ان کا یقین انہیں ہر قدم پر ڈھارس دیتا ہے کہ موت اک ماندگی کا وقفہ ہے۔''ایک خواہش کی موت'' بھی اسی سلسلے کو آگے بڑھاتی ہے۔وہ آنسو جو ان کی آنکھوں میں موجزن ہیں وہ انہیں ہمیشہ بے کل اور مضطرب رکھتے ہیں۔خواہشیں انسان کو مارتی بھی ہیں اور بعض اوقات مرنے سے بچا بھی لیتی ہیں۔

''تخلیق در تخلیق'' اسلوب اور معنویت کے اعتبار سے حیدر قریشی کی نہایت اہم اور فکر انگیز تخلیق کہی جا سکتی ہے جس میں خالق اور بندے کا ازلی رشتہ مختلف دھاگوں سے بندھا ہوا ملتا ہے۔نظم میں حسرت بھی ہے اور امید کی کوملتائیں بھی۔اور قدرت کی اَن گنت صناعیوں کا اعتراف بھی۔امکان اور یقین بھی اس میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔''دعا'' ایک ایسے منظر کی قوسیں بناتی ہے جس میں امیدوں اور تمناؤں کا ایک وسیع جہاں آباد ہے۔اس میں ایک تفاخر بھی ہے اور بے بسی کا دکھ بھی۔سورۂ فیل کے پس منظر میں لکھی گئی چند آس بھری سطریں اس نظم کی جان کہی جا سکتی ہیں۔

ماہیا جدید اردو شاعری میں پچھلے چند برسوں سے نہایت تیزی سے ابھر کے سامنے آیا ہے۔جہاں جہاں اردو بولی، لکھی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہاں اس نے نہایت مضبوطی سے قدم جمائے ہیں۔ماہیا دراصل پنجابی اور ہندکو لوک گیتوں کی ایک صنف ہے اور یہ اس سے اردو میں منتقل ہوا ہے۔اس میں محبت کی کئی داستانیں پنہاں ہیں۔لیکن اردو تک آتے آتے ماہیے کے اندر موضوعات کی ایک وسیع ورائٹی در آئی ہے، جس کی وجہ سے ماہیا اردو شاعری میں قبولیت عام کا درجہ

حاصل کر چکا ہے۔پچھلے چند برسوں میں اردو ماہیے کی تحریک بڑے شدومد سے ترقی کے کئی مدارج طے کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہے۔اس تحریک کو آگے بڑھانے اور اسے مقبول عام بنانے میں حیدر قریشی نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ ابھی تک اس کی راہوں میں بچھائے گئے کانٹے ہٹانے میں نہایت دلجمعی سے جُتے ہوئے ہیں۔انہوں نے ماہیے کے اوزان کے ضمن میں پائے جانے والے ابہام کو دور کرنے کے سلسلے میں بڑی محنت کی ہے اور شبانہ روز کاوشیں کی ہیں۔جس سے ماہیے کے واضح خدو خال ابھر کر سامنے آئے ہیں۔اس سلسلے میں انہوں نے نہایت عرق ریزی سے کام لیا اور نہ صرف فلمی دنیا کے ابتدائی دور کے ماہیوں کو بھی دریافت کیا بلکہ پنجابی ماہیوں کے وزن کو اردو ماہیے کے وزن کے لئے ناگزیر قرار دیا۔یہ نہایت اہم پیش رفت ہے کہ اردو ماہیے کے لئے صحیح اور درست وزن کا اصول وضع کر لیا گیا ہے۔حیدر قریشی ابھی بھی ماہیے کو مزید ترقی دینے کے لئے سرگرمِ عمل ہیں۔انہوں نے خود بھی مختلف موضوعات کو اپنے ماہیوں میں استعمال کیا ہے۔ان کے ماہیوں میں ہمارے ماحول کی مانوس قدرتی فضا ملتی ہے۔انہوں نے حمدیہ اور نعتیہ ماہیے بھی کہے ہیں جو پاکستان کے موقر ادبی جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔

جھک آئے فلک سائیں
دیکھی تھی ہم نے
بس ایک جھلک سائیں

سب صبحوں کا تاج ہوئی
رحمتِ عالمؐ کو
جس شب معراج ہوئی

نکلی ہے یہ دل سے دعا
فیضِ محمدؐ سے
ربِّ زدنی علما

دنیا پہ کرم کر دے
پیار کی سینوں میں
پھر روشنیاں بھر دے

حیدر قریشی کی ساری شاعری میں وطن اور مٹی کا حوالہ نہایت شدومد سے ابھر کے سامنے آتا ہے اور اپنی چھب دکھلاتا ہے۔ان کے ہاں دیہات کی زندگی اور اس کی روایات بہت واضح ہیں۔آج شہروں کی ہوا نہایت مسموم ہو کے رہ گئی ہے۔شہر میں بسنے والا انسان نئے ماحول اور مشینی طرزِ حیات کی وجہ سے نہایت محدود ہو کر رہ گیا ہے، جس کی وجہ سے دیہاتی زندگی کی اہمیت بڑھنے لگی ہے۔دیہاتوں کے اندر سرسبز وشاداب کھیت، لہلہاتی ہوئی فصلیں، کچے گھر، کنویں، سایہ دار درخت اور باہمی احترام آج کے شہری انسان سے دور ہوتے چلے جارہے ہیں اور اس کی پریشانیاں بڑھتی چلی جارہی ہیں۔اس پس منظر میں لکھے گئے ماہیے ان کے اندرونی کرب کے مظہر ہیں۔

شیشم کی قطاریں ہیں
لُو کے تھپیڑوں میں
راحت کی بہاریں ہیں

ریوڑ کئی بھیڑوں کے
نہر کنارے پر
وہ سلسلے پیڑوں کے

بُور آ گیا آموں میں
رونقیں جاگ اُٹھیں
دیہات کی شاموں میں

گندم کی کٹائی پر
چھوڑ دیا گاؤں

گوری کی سگائی پر

دیہات کی زندگی سے دوری کا درد حیدر قریشی کے ماہیوں میں جا بجا پھیلا ہوا ہے۔اس کے ساتھ ان کے ہاں محبت کی کسک اور پنجابی ماہیوں کا مخصوص رُومانی آہنگ ان کے اردو ماہیوں میں بھی موجود ہے۔پنجاب کے کلچر کو انہوں نے اپنے ماہیوں میں ہر جگہ سمویا ہے جس کی وجہ سے ان کے ماہیے پنجابی ماہیوں کا دوسرا روپ لگتے ہیں۔

کلیوں کی چٹک بھی تھی
سانولی لڑکی میں
اُپلوں کی مہک بھی تھی

نہیں، ہم نہیں روئے تھے
چاند کی کرنوں میں
کچھ موتی پروئے تھے

سب دُکھ کے فسانے تھے
آنکھ کے آنسو تھے
یا اوس کے دانے تھے

وہ نین غزالی تھے
فیصلہ کیا ہوتا
سب اس کے سوالی تھے

حیدر قریشی کے ماہیوں میں موضوعات کی کوئی کمی نہیں ہے۔اس سے لگتا ہے کہ وہ غزل اور نظم کے ساتھ ماہیے کو بھی نہایت سنجیدگی سے لیتے ہیں۔اس کے اندر انہوں نے اپنے جو تجربات منتقل کئے ہیں وہ ان کی ماہیے سے گہری وابستگی کے مظہر ہیں۔اور یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ ماہیے کا مستقبل نہایت تابناک ہے اور اس میں حیدر قریشی کے ماہیے اور ان کا اس کے فروغ کے ضمن میں

کردار یقیناً ہمیشہ باقی رہے گا۔

ماہیے: نمازِ عشق

(حیدر قریشی کے ''محبت کے پھول'' کے بعد کے ماہیے)

☆اک ''فجر'' آغاز ہوئی
درد میں ڈوبے ہوئے
اس دِل کی نماز ہوئی

☆پھر بعد زوال ہمیں
''ظہر'' نے بخشی ہے
اُمیدِ کمال ہمیں

☆جب ''عصر'' اشارہ ہوا
سُود میں ڈھلنے لگا
جتنا بھی خسارہ ہوا

☆یوں روشن جان ہوئی
دل میں کہیں جیسے
''مغرب'' کی اذان ہوئی

☆جب وقتِ ''عشاء'' آیا
یاد تری آئی
اور وقتِ دعا آیا

☆مومن تھا دلِ بد میں
جس نے جگا ڈالا
پھر وقتِ ''تہجد'' میں

''محبت کے پھول'' کے ماہیے

نیاز احمد صوفی

پنجابی شاعری میں ماہیے کی اپنی الگ پہچان اور آن بان ہے۔تین مصرعوں میں جس دھیمے انداز سے ہجر وفراق، انتظار، اداسی اور تنہائی کا اظہار صدیوں سے کیا جاتا رہا ہے وہ پنجاب کی ثقافت اور معاشرت بلکہ اجتماعی مزاج اور نفسیات سے اس قدر جُڑا ہوا ہے کہ اسے الگ کرنا ماہیے کی روح کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔میں تو یہاں تک کہوں گا کہ پنجابی ماہیے کو محض اردو زبان میں کہنے سے ہی اس کے فطری حسن پر میک اپ کی ہلکی سی تہہ چڑھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔یعنی یوں سمجھئے کہ اگر گاؤں کی کوئی الہڑ مٹیار اپنی کمر سے کورا گھڑا اتار کر آپ کو Flask سے پانی پلائے، پیاس تو بجھ جائے گی مگر تشنگی رہ جائے گی۔جب شروع شروع میں انڈین فلموں کے اردو ماہیے سننے کا اتفاق ہوتا تھا تو ایسے لگتا تھا جیسے کپ پرچ میں لسّی پی رہے ہیں۔مگر پچھلے چند برسوں میں پنجاب کی کنواریوں کے ہونٹوں پر تھرکنے والا یہ مدُھر گیت اردو شاعری میں اپنا مقام بنا چکا ہے اور اس ٹرانسفارمیشن میں حیدر قریشی صاحب نے منفرد رول ادا کیا ہے۔جس ہنرمندی اور احتیاط سے انہوں نے اردو ماہیا کہا ہے وہ نہ صرف قابلِ داد ہے بلکہ ماہیے پر بہت بڑا احسان ہے کہ اب ماہیا دیہات کی پگڈنڈیوں سے تو جدا نہیں ہوا مگر شہر کی شاہراہوں پر بھی سایہ کر رہا ہے۔کیا ماہیا اپنے نئے سفر کی نئی منزلوں سے آشنا ہو کر اپنے پرانے گاؤں کو بھول جائے گا؟ قیاس ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔کم از کم جب تک حیدر قریشی جیسے شاعر اور ان کا کلام زندہ رہے گا ماہیا پنپتا رہے گا۔اس میں گنے کے رَس کی مٹھاس، کھیت کھلیانوں کی ہریالی، کہساروں، نہروں اور پیڑوں کا ذکر ہوتا رہے گا۔

حیدر قریشی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔انہوں نے ماہیے کی ہیئت کو بدلے بغیر موضوعاتی اعتبار سے جو گراں قدر اضافے کئے ہیں اس سے ماہیے کی قدوقامت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ان کا

خصوصی کمال یہ ہے کہ انہوں نے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ زبان بدل گئی ہے۔

یوں انہوں نے ماہیے کو اس کی جڑ سے نہیں اُکھیڑا بلکہ اسی زمین کو اور بھی porus اور مزید ہموار کیا ہے جو اس کی اپنی اور اصلی ہے۔چند ماہیے دیکھیں:

دیکھا جو کمادوں کو
جان گئی سجنی
ساجن کے ارادوں کو

دن وصل کے تھوڑے ہیں
جی بھر کر مل لو
پھر لمبے وچھوڑے ہیں

حیدر صاحب نے نہ صرف ماہیے کی چاشنی کو برقرار رکھا ہے بلکہ ہماری معاشرت جس Transitional دور سے گزر رہی ہے اور ہمارے فطری مناظر میں جو تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں ان کا کسیلا پن بھی اپنے حلق میں محسوس کیا ہے:

پگڈنڈیوں کے دل دھڑکیں
بستی میں پکّی
جب بچھنے لگیں سڑکیں

بجلی کے لگے کھمبے
کٹ گئے، رستے میں
جو پیڑ بھی تھے لمبے

حیدر قریشی اپنی زمین کے عاشق ہیں مگر کسی حد بندی کو قبول نہیں کرتے۔وہ مسلسل کھلی فضاؤں میں پَر پھیلا کر نئے نئے مناظر دیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں۔وہ اپنے تخیل کی ایک ہی اڑان سے کوسوں دور نکل جاتے ہیں۔تاسف اور اداسی بھی ہوتی ہے مگر مڑ کر نہیں دیکھتے:

ماضی کی دشاؤں سے

کون بلاتا ہے
یادوں کی گپھاؤں سے

گھبرا کے یا پھر ڈر کے
مُڑ کے اگر دیکھا
ہو جاؤ گے پتھر کے

وہ اندر کی طرف بھی سفر کرتے ہیں۔اپنی ہی ذات کے نشیب وفراز میں چھپے ہوئے اَن گِنت گوشے دریافت کرتے ہیں اور کھلم کھلا اعترافِ ذات کرتے ہیں۔انہیں اپنے عشق کی صداقت کا بھرپور یقین ہے:

نیّت تھی مری کھوٹی
تم بھی تھے آمادہ
اور کھلتی گئی چوٹی

بیروں سے لدی بیری
جو مرضی اس کی
اب مرضی وہی میری

حیدر قریشی کی کتاب ''محبت کے پھول'' یقیناً اردو ماہیے میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔سب سے خوبصورت بات یہ ہے حیدر قریشی کا اردو ماہیا Diction کی تبدیلی کے باوجود سراسر پنجابی ماہیا ہے اور یہ ان کی بہت بڑی contribution ہے۔انہوں نے موضوع کے اعتبار سے ماہیے کو وسعت ضرور دی ہے مگر اس کی اصلی شناخت کو مجروح نہیں ہونے دیا' بلکہ اس کی چال میں ایک بانکپن آ گیا ہے۔میں ان کے ماہیوں سے بے حد لطف اندوز ہوا ہوں۔Inspire بھی ہوا ہوں۔میرے خیال میں ہر حساس قاری اس مجموعے میں دیئے گئے ماہیوں سے شاعر کی عظمت کا قائل تو ہو گا ہی۔۔۔ساتھ ساتھ وہ پنجابی ماہیے کو ایک نئے رُوپ میں دیکھے گا اور یقیناً اسے سراہے گا۔

''سلگتے خواب'' سے ''عمرِ گریزاں'' تک

سعید شباب

حیدر قریشی کی ۲۵ سالہ شاعری کا ثمر "سلگتے خواب" (مطبوعہ ۱۹۹۱ء) اور "عمرِ گریزاں" (مطبوعہ ۱۹۹۶ء) کی صورت میں سامنے آیا ہے۔"سلگتے خواب" صرف غزلوں کا مجموعہ ہے اس مجموعے میں حیدر قریشی کی غزل کے تین مرحلے آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں پہلا مرحلہ ابتدائی شاعری کا ہے جس میں ایسے شعر ملتے ہیں۔

ہم جو میدانِ عمل میں ڈٹ گئے   راستے سارے سفر کے کٹ گئے
آپ کی رسوائیوں کے خوف سے   آپ کے رستے سے ہم خود ہٹ گئے

مجھ سے تیری یاد کے سائے بھی کترانے لگے   پھول تیری چاہتوں کے اب تو مرجھانے لگے

لے نہ ڈوبے خواہشوں کا یہ تلاطم دیکھنا   خود بھی اس طوفان میں ہو جاؤ نہ گم دیکھنا

اگر ہم پر عنایت ہی نہ کچھ اکرام ہونا تھا   ترے قہر وغضب ہی کا کوئی انعام ہونا تھا

دوسرا مرحلہ جدیدیت کی اس روش کے زیر اثر ہے جو انتہا پسندی تک پہنچتی ہے اس کی چند مثالیں ایسے اشعار میں موجود ہیں۔

رستے چلے گئے ہیں خرابوں کی جھیل میں   ہم تشنہ لب ہی رہ گئے خوابوں کی جھیل میں

جب آئے موسموں کی زد میں ساونوں کے بدن   ہوا میں بھیگ گئے ننگی بارشوں کے بدن

وہ نفرتوں سے بھی دیکھے تو دل میں پیار اُگے   ہر ایک دھوکے پہ دل میں اک اعتبار اُگے

وہ پچھلی گھڑی شب کی، وہ خوفزدہ چہرہ   سو پایا نہ اک پل بھی خوابوں سے ڈرا چہرہ

اگ رہا تھا درخت سورج کا   جب ستاروں کو بور ہا تھا وہ

تیسرا مرحلہ حیدر قریشی کی غزل کا اس لہجے سے عبارت ہے جب اس کی غزل ابتدائی اور جدیدیت کے اثر سے نکل کر جوان ہوگئی اور نئی غزل میں اپنی پہچان آپ بننے لگی اس لہجے کے ڈھیروں ڈھیر اشعار میں سے چند اشعار۔صرف چند مطلعے اور مقطعے۔

جہاں بھر میں ہمارے عشق کی تشہیر ہو جائے   اُسے کس نے کہا تھا دل پہ یوں تحریر ہو جائے

فاصلہ سا کچھ ہمارے درمیاں ہونے کو ہے   یعنی تھوڑا فائدہ تھوڑا زیاں ہونے کو ہے

تم نے کبھی زخموں کے نگینے نہیں دیکھے   عشاق کے دہکے ہوئے سینے نہیں دیکھے

مِرے بدن پہ ترے وصل کے گلاب لگے   یہ میری آنکھوں میں کس رُت میں کیسے خواب لگے

شاخِ دل یوں تیری یاد سے ہری رہتی ہے   جیسے میووں سے کوئی ڈال بھری رہتی ہے

طلوعِ صبح سے پہلے شگاف نیل ہونا ہے   یہ منظر سامنے کا جلد ہی تبدیل ہونا ہے

وزیر، فیل اور شاہ پھر سے بدل رہا ہے   وہ چال شاید اب اور ہی کوئی چل رہا ہے

بکھر گئے ہیں ملن کے تمام دن حیدؔر   ٹھہر گئی ہے جدائی کی رات آنکھوں میں

اپنی کچھ نیکیاں لکھنے کے لئے بھی حیدؔر   اپنے ناکردہ گناہوں سے سیاہی مانگوں

حیدؔر اب اپنی عادتیں، اطوار ٹھیک کر۔   ابا بھی چل بسے تری ماں بھی نہیں رہی

رزق کی تنگی، عشق کا روگ اور لوگ منافق سارے   آؤ ایسے شہر سے حیدؔر شہر بدر ہو جائیں

ایسے ڈھیر سارے خوب صورت اشعار سے مزین غزلیں کہنے والا حیدر قریشی "عمرِ گریزاں" تک پہنچتے پہنچتے مزید پختہ کار ہو گیا ہے اب اس کی غزل کی جوانی نکھر گئی ہے اس نکھار کا ثبوت ایسے اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ایسی عمروں کے پیار تو حیدؔر   جسم و جاں سے لگان مانگتے ہیں

منزلوں نے تو مجھے ڈھونڈ لیا تھا حیدؔر   پھر مرا شوقِ سفر مجھ کو چُرا لایا تھا

درد اندر کے سب آنکھوں میں اُبھر آئے تھے   عشق میں جب ہمیں پانی کے سفر آئے تھے

کیا خبر کب سفر پہ چل نکلیں   اسپِ جاں پر ہمیشہ زین رہے

اس میں مل جائے گا جا کر میرے اندر کا خلا   اور بڑھ جائے گا باہر کا خلا میرے بعد
عشق کے قصے سبھی مجھ پہ ہوئے آ کے تمام   کوئی مجنوں، کوئی رانجھا نہ ہوا میرے بعد

یہ خواب بھی تیرے تھے انہیں ساتھ ہی لے جا   یہ بجھتے ہوئے خواب، مِرے خواب نہیں تھے

حیدؔر مذاق مت اسے سمجھو یہ عشق ہے   بازی ہے اس میں پاؤں سے سر تک لگی ہوئی

کعبۂ دل کو کہاں چھوڑ چلے ہو حیدؔر   تم تو کہتے تھے یہ ہجرت نہیں ہونے والی

یونہی دیکھا تھا جسے چشمِ تماشائی سے ‏ ‏ ‏ اب نکلتا ہی نہیں روح کی گہرائی سے
آخری مرحلہ اس کھیل کا رہتا ہے ابھی ‏ ‏ ‏ خوش نہ ہو لشکرِ اعداء مری پسپائی سے

عشق میں اپنی ہی جب خاک اڑا لی ہم نے ‏ ‏ ‏ پھر وہی خاک ترے پیار پہ ڈالی ہم نے

میری دھرتی سے پرے کوئی بلاتا ہے مجھے ‏ ‏ ‏ کہکشاؤں کی عجب راہ دکھاتا ہے مجھے

صرف یہ عمرِ گریزاں ہی نہیں کرتی اداس ‏ ‏ ‏ میرا ہنستا ہوا بچپن بھی رُلاتا ہے مجھے

مجھے ہر گنہ کی جزا ملی ‏ ‏ ‏ وہ شرافتوں کی سزا میں ہے

اُس کے ہونٹوں کی محراب دعاؤں والی ‏ ‏ ‏ اُس کی خاموشی بھی اذاں جیسی لگتی ہے

فرشتے کیسے کریں گے حساب پھر اس کا ‏ ‏ ‏ ہر اک گناہ کا حیدرؔ جواز رکھتا ہے

وہ مسکرا تو دیا ہو گا سوچ کر مجھ کو ‏ ‏ ‏ پر اس کی آنکھ سے آنسو بھی بہہ گئے ہوں گے

"سلگتے خواب" اور "عمرِ گریزاں" کے یہ چند غزلیہ اشعار حیدر قریشی کی غزل کا براہ راست تعارف ہیں۔ حیدر قریشی کی غزلیں ایسے خوب صورت اشعار سے بھری پڑی ہیں اس عہد نا سپاس کا المیہ ہے کہ اس میں گروہ بندیوں اور مفادات کے چکر میں حیدر قریشی جیسے عمدہ شاعر کو وہ پذیرائی نہیں ملی جو اس کا حق بنتا تھا اس سے کہیں کم تر درجے کے شاعروں کو نام نہاد دانشوری کے بانس پر چڑھایا گیا اور ان کا قد بڑا کر کے دکھایا گیا۔ اور تو اور وہ شعرا کرام جن کی غزلوں میں حیدر قریشی کے قافیہ، ردیف ہی نہیں پورے پورے شعر بولتے دکھائی دیتے ہیں وہ بھی اپنے آپ کو قد آور ظاہر کرنے کے لیے ایک طرف حیدر قریشی کی غزل سے استفادہ کرتے ہیں اور دوسری طرف ادبی رسالوں میں حیلوں بہانوں سے اسی کے خلاف خطوط بازی بھی کرتے ہیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ

ستر کی دہائی میں ابھرنے والے شاعروں میں حیدر قریشی صفِ اوّل کا شاعر ہے اس کی غزل میں اتنا دم خم ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود کو منواتی چلی جائے گی۔

"عمر گریزاں" میں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں اور ماہیے بھی شامل ہیں نظموں میں "تمہارے لیے ایک نظم"، "محبت کا خدا"، "خلا"، "چاند کی تسخیر کے بعد"، "حاصل زندگی"، "بہار کے پہلے دن"، "عجیب دشمن"، "یہ دل"، "سرسوں کا کھیت" اور "ایک خواہش کی موت" جیسی نظمیں رومانوی انداز کی نظمیں ہیں۔ جدید نظم میں دانشوری کے نام پر گہرے فلسفیانہ افکار کو اس طرح ٹھونسا گیا ہے کہ محبت کو جیسے اس کے لیے شجر ممنوعہ قرار دے دیا گیا ہے۔ حیدر قریشی نے اپنی نظم میں محبت کے موضوع کو خوب صورت تخلیقی انداز سے پیش کیا ہے۔

"وہ اک بھولی بھالی سی صحرائی خواہش
جو اس دل کے صحرا میں بستی تھی
آنکھوں میں امید کی روشنی کے دیئے سے جلاتی
کبھی دل کے زم زم سے چھینٹے اڑاتی
وہ میرے ہی چھینٹوں سے مجھ کو بھگو کر جو ہنستی
تو جیسے مرے دل کا صحرا
کھجوروں کے سرسبز میٹھے پھلوں والے
اونچے درختوں کی ٹھنڈک میں
ساری بہاریں سمیٹے ہوئے مسکراتا
مرے دل کا صحرا کھجوروں کے سرسبز میٹھے پھلوں والے
اونچے درختوں کی ٹھنڈک میں ساری بہاریں
سمیٹے ہوئے مسکراتا تو دیکھے ہوئے گرم سورج
کے سینے میں بھی پھول سے کھلنے لگتے"

(ایک خواہش کی موت)

"خزاں کی آخری ہچکی

بہار آنے کی پہلی چاپ سے
جب تک نہیں ملتی
خزاں جا ہی نہیں سکتی
بہار آ ہی نہیں سکتی
میں اپنی آخری ہچکی پہ ہوں
اب جلد آ جاؤ"

(بہار کے پہلے دن)

"خلوص دل سے جب مجھ کو
بلانے کا ارادہ ہی کرو گی
اپنی شہہ رگ سے بھی تم نزدیک پاؤ گی مجھے"

(محبت کا خدا)

" کبھی تم دل میں بستے تھے
تو آنکھوں میں
کہیں اندر۔۔۔
بہاریں مسکراتیں،
کہکشائیں رقص کرتی تھیں
زمین و آسماں میں
ایسی یکتائی کا عالم تھا
خلا کیسا؟
کہیں اک درز تک بھی تو
نہیں معلوم ہوتی تھی"

(خلا)

نظم "درد" میں چار آوازوں کا ذکر ہے کالے انجن کی سیٹی کی آواز، تانگے کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز، ٹوٹتی چوڑیوں کی چھنک اور بانسری کی دکھی اور سریلی صدا، جدائی اور دکھ کی علامت ان چاروں آوازوں کے ذکر کے بعد حیدر قریشی یوں نظم کو سمیٹتے ہیں۔

"یہ ساری صدائیں مری آشنا ہیں
مجھے جانتی ہیں
میں ان سب کو پہچانتا ہوں
متاعِ فقیراں
یہ سب میرے دردوں کی آواز ہیں
درد جو میرے مونس ہیں
ماں جائے ہیں"

"ایک اداس کہانی" تقسیم شدہ انسان کی کیفیات کو نمایاں کرتی ہے۔ "پھاگن کی سفاک ہوا" اور "نصف سلور جوبلی" بیوی بچوں کے بارے میں بہترین نظمیں ہیں۔ "میں پھر آنسوؤں کا گلا گھونٹ دوں گا" بہنوں سے محبت کا اور "دعا گزیدہ" ماں باپ سے محبت کا ایسا اظہار ہیں جن میں جدائی کے دکھ کی لہریں دکھائی دیتی ہیں۔

"ایک دراوڑ کا پیغام آریاؤں کے نام"، "ہوا" اور "تخلیق در تخلیق" جیسی نظموں میں تہذیبی اور ثقافتی حوالوں سے اور کسی حد تک ہلکے پھلکے فلسفیانہ حوالے سے زندگی کو دیکھنے کی کاوش کی گئی ہے جب کہ نظم "تیامت" (TIAMAT) میں (قدیم عراق) سمیری دیومالا کے ایک ہولناک کردار کے حوالے سے آج کے عراق کو دیکھا گیا ہے اور مغرب کی استعماری طاقتوں کو اسی خوفناک بلا کے روپ میں دکھایا گیا ہے۔ عراق کی تائید و حمایت میں اعلیٰ ادبی سطح پر اس سے خوب صورت نظم ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری۔ سمیری دیومالا میں سمندر سے ایک بلا نکلتی تھی جو زمین پر تباہی پھیلاتی اور زبردستی اپنا احترام کراتی اسی عراقی سرزمین پر سمندری بلا تیامت اب ایک نئے روپ میں نازل ہوئی ہے نظم کی آخری لائنیں یوں ہیں۔

" کئی صدیوں تلک سوئی ہوئی، کھوئی ہوئی
جابر تیامت جاگ اٹھی ہے

ہلاکت خیز قوت اور عظمت کے نشے میں جھومتی
قاہر تیامت ساحل مغرب سے نکلی ہے
سیمری سرزمیں کو اب کے اس نے
صرف خشکی اور پانی ہی نہیں
ساری فضا سے، ہر طرف سے، ہر جگہ سے
گھیر رکھا ہے!"

(تیامت)

"عمر گریزاں" میں حیدر قریشی کے ۴۲ ماہیے شامل ہیں اب تک حیدر قریشی کے ماہیوں کے مجموعہ "محبت کے پھول" کے منظر عام پر آنے کی خبر بھی آ چکی ہے تاہم "عمر گریزاں" کے ماہیے اردو میں ماہیا نگاری کا وہ اولین اظہار ہیں جن سے اردو میں ماہیا نگاری کے نام پر ہونے والی بے راہ روی کا تخلیقی سطح پر تدارک کیا گیا ہے اگر چہ درست وزن کی ماہیا نگاری کی مثالیں قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی کے ہاں بھی موجود ہیں لیکن ان سے ربع صدی سے بھی زائد عرصے کے بعد حیدر قریشی نے نہ صرف غلط وزن میں رائج ماہیوں کا رخ موڑا ہے بلکہ انہیں درست سمت میں لا کر رائج بھی کیا ہے۔ حیدر قریشی کے ماہیے وزن، مزاج اور شعری کیفیات ہر لحاظ سے پنجابی ماہیے کی روح کے مطابق ہیں اور پنجابی ماہیے سے آگے کا سفر بھی ہیں۔

چنبیلی کی کلیاں تھیں
اپنی جوانی تھی
اور شہر کی گلیاں تھیں

مستی ہے ہواؤں میں
رات کی رانی کی
خوشبو ہے فضاؤں میں

سونے کی انگوٹھی ہے
پیار میں سچی ہے
پر قول کی جھوٹی ہے

سوہنی ہے نہ ہیر ہے وہ
اس کی مثال کہاں
آپ اپنی نظیر ہے وہ

جوگی کے نہیں پھیرے
دل جہاں آ جائے

اس حال فقیری میں
عمریں بیت گئیں

وہیں ڈال دیئے ڈیرے

زلفوں کی اسیری میں

کچھ رشتے ٹوٹ گئے
برتن مٹی کے
ہاتھوں سے چھوٹ گئے

مل مہکی فضاؤں سے
یار نکل باہر
اندر کے خلاؤں سے

مجھے سید ضمیر جعفری کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے کہ حیدر قریشی جدید غزل کے نوجوان شعراء کے گروہ کے سرپنچوں میں سے ہے اور جدید غزل کی ساکھ ایسے ہی شاعروں کے دم سے بنی ہوئی ہے اور مظہر امام کی یہ رائے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ حیدر قریشی کی بعض نظمیں پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ غزل کے زیادہ اچھے شاعر ہیں یا نظم کے۔۔۔ نیز یہ بھی کہ اب حیدر قریشی کی شناخت ماہیے کے بغیر نامکمل ہے اور ماہیے کی شناخت حیدر قریشی کے بغیر نامکمل ہے۔

(نوٹ: ''تخلیق'' لاہور میں مطبوعہ یہ مضمون ۱۹۹۶ء میں لکھا گیا تھا۔ اب تک حیدر قریشی کے مزید دو مجموعے اور چاروں مجموعوں کا مجموعہ ''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' بھی شائع ہو چکے ہیں)

''غزلیں، نظمیں، ماہیے'' کے بعد کی

حیدر قریشی کی ایک غزل

وہ جو ابھی تک خاک میں ملنے والے ہیں
سُچے موتیوں میں اب تُلنے والے ہیں

اپنی ذات کے دروازے تک آ پہنچے
بھید ہمارے ہم پر کھلنے والے ہیں

دودھ بدن ہے وہ تو مصری کوزہ ہم
سو اب اُس کے عشق میں گھلنے والے ہیں

واقفیت ہے اِن سے اپنی برسوں کی
دُکھ تو ہمارے ملنے جلنے والے ہیں

آنکھیں اس کی بھی ہیں اب برسات بھری
حیدرؔ مَیل دِلوں کے دُھلنے والے ہیں

حیدر قریشی کی افسانہ نگاری

پروفیسر جیلانی کامران

۱)

نئے اردو افسانے نے جہاں انسان کو معاشرے کے حوالے سے بیان کرنے کی روایت قائم کی ہے وہیں معاشرہ کو جن اصولوں کے تحت زیر بحث لایا ہے ان اصولوں نے معاشرے کی آب وہوا کو ویران کر دیا ہے اور انسان کو اس کے ذہنی اور فکری پس منظر سے محروم بھی کیا ہے۔ غالباً اسی لیے نئے افسانے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ افسانہ بے آسرا انسان اور بے آباد زمین کی روداد بیان کرتا ہے۔ اسی ضمن میں ایک بات یہ بھی سننے میں آئی ہے کہ نیا افسانہ محض رودادِ ذات ہے اور اس کے رگ وریشے سے کہانی پیدا نہیں ہوتی۔ ضمیر متکلم کی روداد نمایاں ہوتی ہے۔ اور ضمیر متکلم اپنے طور پر شکست وریخت سے دو چار ہے۔ اس لیے اس مرکزی استعارے ضمیر متکلم کی مدد سے افسانے کا انسانی تاثر واضح نہیں ہوتا۔ بلکہ نفسیاتی اعتبار سے ایک مرضیاتی زائچہ تیار ہوتا ہے۔ ایسے رویوں کی موجودگی میں حیدر قریشی کے افسانوں کا مجموعہ "روشنی کی بشارت" ایک نئے تخلیقی قدم اور نئے فکری اعتماد کی خبر دیتا ہے۔

حیدر قریشی نے اپنے افسانوں کی دنیا اسی ماحول سے اخذ کی ہے۔ جس ماحول سے نیا افسانہ بخوبی آشنا ہے۔ لیکن حیدر قریشی نے اس ماحول کو ایک فکری مسئلے کے طور پر قبول کیا ہے۔ اور اس مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان افسانوں کے اندر موجود انسان کو اعتماد کے رویے فراہم کیے ہیں۔ ان افسانوں کی دنیا ایسی ہے جس کی اندھیری جہتوں سے باہر نکلنا دشوار ہے۔ اس لیے ان کہانیوں کے افراد اندھیرے شب وروز میں اپنے ہونے اور نہ ہونے کے آشوب سے دو چار ہیں۔ ان کی نظر میں سچائیاں اضافی ہو چکی ہیں۔ اور وہ سچائیوں کی راہنمائی کے بغیر اپنے لیے کوئی بہتر ساعت بھی دریافت نہیں کر سکتے۔ ایسے غیر فطری منظر میں کبھی وہ شک اور یقین کے دوراہے سے گزرتے ہیں اور کبھی ان کا اپنا وجود ٹوٹ کر من اور غیر از من میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ دھند کے بخشے ہوئے راستوں میں سفر کرتے ہیں اور اپنے ماضی کو اپنی خطاؤں کا مجرم گردانتے ہیں۔ تاہم ان افسانوں کے لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ کو الزام دینے سے کتراتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی زندگی کو بے معنی صورت مہیا کرنے پر برابر تیار دکھائی دیتے ہیں۔ اور جس دنیا سے ان کا سابقہ ہوا ہے اس کی اپنی رفتار صرف ہلاکت ہی کی منزل کو قریب لاتی ہے۔ اس اعتبار سے ان افسانوں کے بطن میں ہلاکت کا غیر محسوس سفر جاری نظر آتا ہے اور سارے کے سارے افراد اس سفر کو قبول کر کے برابر بے حس ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس صورتحال کو رنگوں کا استعارہ بخوبی بیان کرتا ہے جہاں سبز رنگ پیلے رنگ میں بدل جاتا ہے اور سرخ خون سفید ہونے لگتا ہے! ان افسانوں کی دنیا میں شدید دباؤ، نفسیاتی بحران اور فرد اور گروہ کے مابین غیریت کا پھیلتا ہوا سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ انسان اپنے بحران کے جنگل میں پریشان' یک وتنہا اپنی ویرانیوں کو وسیع سے وسیع تر کرتا چلا جاتا ہے!

حیدر قریشی نے اس انسانی معروض کو ایک سوال کی صورت میں بیان کیا ہے اور قاری کے ذہن میں بار بار یہ ضمنی سوال ابھرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ اور ایسا کس لیے ہے؟

۲)

حیدر قریشی نے اپنے افسانوں کے لیے جس نوع کے عنوان چنے ہیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ ان کی مدد سے اس افسانوی دنیا کی آب وہوا مرتب ہوتی ہے جس میں قاری کو سفر کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ اس افسانوی دنیا میں صحرا، آسمان کے بدلتے ہوئے رنگ، رات اور ایک ایسا طرز احساس مرکزی ہیں جن سے ایک انجانا خوف پھوٹتا ہے۔ اس خوف کی توجیہہ کے لیے کبھی جرنلزم کی سرخیوں کو شریک کیا گیا ہے، کبھی ایٹمی جنگ کے ہلاکت خیز امکان کو منظر میں سمویا گیا ہے اور کبھی عصر حاضر کے ان عالمی تعلقات کو انسانی صورتحال میں شامل کیا گیا ہے جہاں درآمدی گندم اور تیل کی پیداوار سرفہرست دکھائی دیتی ہیں ۔ اس اعتبار سے حیدر قریشی کے افسانوں کی دنیا عصر حاضر کے حالات، واقعات اور امکانات سے رونما ہوتی ہے۔ اور رونما ہوتے ہی انسانوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس مقام تک حیدر قریشی اجتماعی کیفیت کو ہمراہ لے کر چلتے ہیں۔ لیکن بہت جلد یہ اجتماعی کیفیت اپنے بطن سے انفرادی کیفیت اخذ کرتی ہے۔ اس تخلیقی

عمل کے ساتھ ضمیر متکلم آشکار ہوتی ہے اور یہ صورت حیدر قریشی کے افسانوں کو اور ان افسانوں کے مرکزی انسان کو انفرادیت فراہم کرتی ہے۔

نئے افسانے کے آداب اور مزاج کی روشنی میں یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ نیا افسانہ اپنے منظر کی بجائے اپنے انسان کے گرد گردش کرتا ہے اور اس کا انسان ہی اس کا محور ہے۔ لیکن نئے افسانے کے لکھنے والے عموماً حالات اور فرد کا رشتہ تخلیق کرتے ہوئے فرد کے مقابلے میں حالات کو بے حد طاقت ور بتاتے ہیں اور اس تناسب سے فرد کی انا کو برابر کمزور ہوتے دکھاتے ہیں۔ ایسا فرد افسانے کی دنیا میں حالات کے جبر سے شکست کھاتا ہے اور حالات کے پیدا کیے ہوئے ماحول میں اپنے ٹوٹے ہوئے وجود ہی کی نشاندہی کرتا ہے۔ حیدر قریشی کے افسانوں میں ایسے حالات بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے ان افسانوں کا انسان وجود کی شکست وریخت سے دوچار نہیں ہوتا۔ اس کی انا برابر قائم رہتی ہے اور وہ ہر لمحے حالات کو غلبہ پانے سے روکنے کی سعی کرتا ہے۔ ایسا انداز نظر اس لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے کہ افسانہ جس دنیا کی نشاندہی کرتا ہے اس میں فرد کا طرز عمل تہذیبی رویوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ فرد کے ٹوٹنے سے تہذیبی شعور میں درزیں رونما ہوتی ہیں۔ حیدر قریشی کا افسانہ اس تہذیبی دوراہے کا ازالہ کرتا ہے۔

(۳)

افسانے کی اس دنیا میں جسے حیدر قریشی نے دریافت کیا ہے۔ روشنی کی کرن ایک ایسا استعارہ ہے جسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ روشنی کی کرن رات کے پچھلے پہر ظاہر ہوتی ہے۔ کبھی اس کے ساتھ انسانی شعور کے وہ رشتے آشکار ہوتے ہیں جن کی ترتیب آسمانی نشانات نے کی ہے۔ اور کبھی یہ کرن امید بن کر گلاب کے پودے کی صورت اختیار کرتی ہے اور کبھی محبت بن کر دل میں ظہور کرتی ہے۔ یہ کرن کشف اور رویا بن کر دل کا خوف دور کرتی ہے اور سفید پرندوں کو اپنے پاس بلاتے ہوئے انسانوں کو وحدت کی دعوت دیتی ہے۔ حیدر قریشی نے اس استعارے کو جابر ماحول سے رہائی پانے کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تاہم یہ استعارہ جہاں ماحول اور فطرت اور آرزوئے قلب میں ظاہر ہوتا ہے وہیں اس استعارے کی توانائی اس حقیقت میں بھی مضمر ہے کہ اس استعارے کو الہامی اور آسمانی نشانات نے آل آدم کی تربیت میں نسل در نسل راسخ کیا ہے۔ اس لیے روشنی کی کرن نہ تو گم ہوتی اور نہ دجل و بطلان کے دبیز پردے اسے آنکھوں سے اوجھل

رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ انسان کے آخری سہارے کے طور پر یہ استعارہ انسان کی زندگی کی ضمانت دیتا ہے حیدر قریشی نے اس استعارے کو اپنے افسانوں میں مجسم کیا ہے اور اس کی مدد سے اپنے مرکزی کرداروں اور ضمیر متکلم کی تشکیل کی ہے۔ اگر اس زاویے سے دیکھا جائے تو حیدر قریشی کے افسانے انسان کی امکانی صورتحال کو پیش کرتے ہیں اور یوں روشنی کی کرن کو انسانی فلاح کا مرجع قرار دیتے ہیں۔ ''حوا کی تلاش'' جو ان افسانوں میں اہم رمزیت کی حامل ہے ایسی ہی صورتحال سے عہدہ برآء ہوتی ہے۔ اور روشنی کی کرن جدید عہد کی ٹیکنالوجی کے ہمراہ ایک نئے زمانے کی بنیاد رکھتی ہے۔ اسی مجموعے کی ایک دوسری کہانی (گلاب شہزادے کی کہانی) میں گلاب کا پھول انسان کی ابدی حکمرانی کا سمبل ہے لیکن اس سمبل کو انسان کی ہوس اور نظام زیست کے جبر نے پامال کر رکھا ہے۔ ان دونوں کہانیوں سے ایسے اشارے بخوبی حاصل کیے جا سکتے ہیں جو انسان کو ایک نئی زندگی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ تاہم جو باتیں عمومی طور پر کہی گئی ہیں ان سے ایک نئے طریق کار کا احساس ہوتا ہے اور ایک ایسے اثباتی تہذیبی رویے سے آشنائی ہوتی ہے جو عصر حاضر کے افسانے میں بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ حیدر قریشی نے ان افسانوں کے ذریعے کہانی کے کینوس کو وسیع کرتے ہوئے نئے امکانات کی طرف اشارا کیا ہے اور اس سچائی کو نمایاں کیا ہے کہ Limit Situation کے دوران انسان صرف کرب ہی کی نمائندگی نہیں کرتا اور نہ اس کا وجود ہی پاش پاش ہوتا ہے بلکہ اس کے نطق سے اس کی اپنی تاریخ گفتگو کرتی ہے۔ ہمارا افسانہ تاریخ کے اس مکالمے سے شاید اب تک غافل تھا۔ حیدر قریشی نے اپنے افسانوں کی راہ سے تاریخ کے اس مکالمے کو سننے کی سعی کی ہے۔

میں نے حیدر قریشی کے افسانوں کے مرکزی رجحان کو واضح کرتے ہوئے ان کہانیوں کا ذکر نہیں کیا جن میں دانستہ روشنی کو روپوش کیا گیا ہے۔ ایسی کہانیاں جو اس مجموعے میں دو تین سے زیادہ نہیں ہیں دراصل حیدر قریشی کے افسانوں کی دنیا کا پس منظر ترتیب دیتی ہیں۔ اور اس پس منظر کی تلخ صورت ہی سے وہ کیفیت رونما ہوتی ہے جو حیدر قریشی کے افسانوں کو ان کا مزاج فراہم کرتی ہے۔ حیدر قریشی کے افسانے ایک نئے طریقے سے قاری تک پہنچتے ہیں اور ان کی گفتگو کا لہجہ بھی مختلف ہے۔ اس اعتبار سے ان افسانوں میں ایک ایسا رویہ بھی شامل ہے جو کہانی سنتے ہوئے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ کہ کہانی محض کسی واقعے ہی کی بات نہیں کرتے بکہ اس سچائی کا ذکر

بھی کرتی ہے جو واقعیت کے رگ وریشے میں جاگتی ہے اور سب سے کہتی ہے کہ مجھے پہچانو۔ میں کون ہوں؟

سچائی نے ہمارے زمانے میں افسانے کا لباس پہن رکھا ہے۔

دوسرے درویش نے اپنی کہانی شروع کی:

''میری کہانی عام سی ہے۔ میری بیوی نے اپنی آنکھوں کے جادو اور ہونٹوں کے منتر سے مجھے گدھا بنادیا تھا اور میں کئی صدیوں سے بوجھ اٹھاتا چلا آ رہا تھا۔ پھر ایک دن مجھے بھی ایک اسم مل گیا۔ میں گدھے سے انسان بن گیا اور تب میں نے اپنے اسم کے زور سے اپنی بیوی کو گھوڑی میں تبدیل کر دیا۔''

تیسرا اور چوتھا..... دونوں درویش اس کی کہانی بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے جبکہ پہلا درویش گلاب کی اس قلم کو دیکھ رہا تھا جس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے کانٹے سے چپکے ہوئے تھے.... قلم آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔

''اب مجھے صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ پھر میں نے اسے تانگے میں جوت دیا تھا، گھوڑ دوڑ کے کلب میں لے گیا تھا یا ویسے ہی اسے سرپٹ دوڑاتا رہا.... یا پھر پتہ نہیں وہ خود ہی سرپٹ دوڑتی رہی.... دوڑتی رہی.....''

''پھر کیا ہوا؟'' تیسرے اور چوتھے درویش نے بڑے اشتیاق اور تجسس سے پوچھا۔

پہلا درویش ابھی تک گلاب کی اس بڑھتی ہوئی قلم کو دیکھ رہا تھا۔

''پھر؟'' دوسرے درویش نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا۔ ''پھر..... جب میری بیوی اپنی پہلی تنخواہ لائی تھی تو اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی آدھی تنخواہ گھر کے اخراجات میں ڈال دی اور بقیہ آدھی بچوں کے مستقبل کے لئے بنک میں جمع کرادی اور پھر ہمیشہ ہی اس کا یہی طریق رہا۔ میری اور اس کی تنخواہ سے ہمارا گھر خاصا خوشحال ہو گیا۔ البتہ وہ اپنے باس کی بہت تعریفیں کرتی رہتی تھی۔ وہ اس کا ضرورت سے زیادہ ہی خیال رکھتے تھے''۔

(حیدرقریشی کے افسانہ ''گلاب شہزادے کی کہانی'' سے اقتباس)

روشنی کی بشارت کے افسانے

جوگندر پال

اگر کسی شخص کا چہرہ اس کے طبع زاد نقوش میں رچا بسا سا لگے اور اس کی شبیہ اور حرکات وسکنات پر کسی مصنوعی ڈیزائن کا گمان نہ گزرے تو اس سے مانوس ہوتے ہوئے کسی تامل کا احساس نہیں ہوتا۔ حیدرقریشی سے مل کر، اس سے بات چیت کر کے یا اسے پڑھ کر بھی ہم جھٹ ہی اس سے مانوس ہو جاتے ہیں اور اس سے مل کر واقعی ہمارا اسی سے ملنا ہوتا ہے۔ اپنے اس بیان سے مجھے حیدرقریشی کی کوئی خارجی شناخت ٹھہرانا مقصود نہیں۔ وہ تو جیسے بھی ہے ویسے ہی ہمارے سامنے ہے۔ مجھے تو خارج کے شواہد میں مضمر اس کے ان امکانات کی ٹوہ ہے جن کی بدولت اس کی روشنی کی بشارت ناقابل یقین معلوم نہیں ہوتی۔ حیدرقریشی کے اس افسانوی مجموعے "روشنی کی بشارت" میں تیرہ کہانیاں شامل ہیں۔ یہ تیرہ مختلف وارداتیں اسے ایک ہی راستے پر پیش آئی ہیں۔ ایک جادہ مستقیم، جہاں یکساں موسم ہیں، زمین اور آسمان کے ویسے ہی خطوط، وہی جھاڑ، جانور، پنچھی اور انسان، اور ان کی بود و باش کا وہی تلمیحی اور تمثیلی انداز، جس کے باعث زندگی پر داستان کا گمان ہونے لگے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ حیدرقریشی کے اس مخصوص ماحول میں جسے جہاں جو کچھ بھی پیش آتا ہے اسے وہاں وہی کچھ پیش آنا عین فطری معلوم ہوتا ہے۔ افسانوں میں واقعیت کا باب دراصل انہی کے سیاق وسباق سے منسوب ہوتا ہے۔ کوئی واقعہ یا کردار از خود جھوٹا یا سچا نہیں ہوتا۔ اس کی سچائیاں--- جزئیاتی سچائیاں بھی۔۔۔۔ کسی افسانے کی ایک خاص سچویشن سے وابستگی کے پیش نظر برمحل ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ سوال قطعی طور پر غیر اہم ہے کہ کیا رامائن کا رام چندر سچ مچ کا کوئی شخص تھا یا محض کوئی افسانوی کردار، یا کیا راون کے واقعی دس سر تھے۔ اہم صرف یہ ہے کہ رام چندر رامائن کا ایک زندہ کردار ہے اور کہ راون کے دس سر نہ ہوتے تو وہ اپنا آپ لگنے کی بجائے کوئی اور معلوم ہوتا۔ زندہ کردار کتابوں میں ہو بہو ویسے ہی سانس لیتے ہیں اور واقعتاً ہوتے ہیں

جیسے زندہ لوگ اپنی بستیوں میں زندگی کرتے ہیں۔

افسانہ نگار کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے کردار زندگی کر کر کے اپنی کہانیاں بناتے ہوئے محسوس ہوں اوران کہانیوں کے تناظر میں اگر پانی میں آگ لگنا یا انسانی وجود کا بکھرا جانا ہی تخلیقی طور پر صحیح ہو تو ایسے سانحات کو انہونا قرار دے کر ان سے ہاتھ نہ کھینچ لیا جائے۔ ایسا کرنا افسانوی واقعیت کو مجروح کرنے کے مترادف ہوگا۔

حیدر قریشی کے یہاں ایمان کا کراماتی عمل کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ ایمان زندہ رہے تو معجزوں کا رونما ہوتے چلے جانا بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ حیدر قریشی کے ایمان کی توانائی اسے انہدام کی ہیبت سے محفوظ رکھتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے انہدام کے انہدام کا پورا یقین ہے اوراس قیامت کا نظارہ کرنے کے لئے وہ اپنی آنکھیں وا کئے ہوئے ہے۔ ہر چہ بادا باد!

موجودہ آدمی بے چارہ اسی لئے اتنا ہراساں ہے کہ اپنی چھوٹی چھوٹی سہولتی اورنجی دلائل کی بھیڑ میں کھو کر وہ خود پارسا ہو کر رہ گیا ہے اور المناک مضحکہ خیزی سے اس ہمہ گیر زندگی بخش منطق کی بے ضمیر نفی پر تل گیا ہے جس سے بے ریا اجتماعی رفاقتوں کو تقویت پہنچی ہے۔ نمرود کا انکار فی الحقیقت اس کی ہراساں ذہنی کیفیت کا ہی آئینہ دار ہے۔ متوازی خدائیوں کے دعوے دار اپنی بوکھلاہٹوں کے محاصرے میں بالآخر خود آپ ہی اپنی تباہی کا سامان کر لیتے ہیں اور پھر کہیں روشنی کا ہالہ نمودار ہوتا ہے اور از سرِ نو منہدم زندگی کے وجود سے گزر کر ایک خوبصورت تر دور کی ابتداء کی بشارت دیتا ہے۔ "اب بتاؤ کہ تم دونوں رب کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے"۔

گناہ کو جب تک جرم قرار نہ دیا جائے، ہم اس سے باز نہیں آتے، حالانکہ صرف ہمارے گناہوں کی سزا میں قدرت ہمارے وجود کو ہی سمیٹ کر زنداں منتقل کر دیتی ہے جہاں پنجوں پر کھڑے ہو ہو کے بھی ہم ایک اپنی آنکھوں کے روزن تک نہیں پہنچ پاتے کہ باہری وسعتوں کو روح میں اتار لیں نئے آدمی نے بہ فخر انانیت کو اپنی تربیتوں میں روا رکھا ہے اور اوروں کے دلوں میں بسنے کا خواہشمند ہونے کی بجائے اپنے دل کو بھی خون صاف کرنے کی مشین سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے اور سر سے پاؤں تک لڑھک لڑھک کر ہی ساری عمر بتا دی ہے۔ ان حالات میں اسے محبت اور سپردگی کے ان کرشموں کا عرفان کیونکر ہو جن کی بدولت وہ کسی حقیر سے حقیر انسان کی بہبود کو اپنی ہی بہبود اور بقا کے اسباب پر محمول کرے۔ "تساں بادشاہ ہوا ساں کوں غریبی" کی طاعت جھیل کر

ہی ہم بے لاگ محبتوں کے دروازوں پر پہنچ پاتے ہیں اور یہی دروازے وسیع تر زندگی کی جانب کھلتے ہیں۔

حیدر قریشی اسی وسیع تر زندگی کی دریافت کے لئے اپنی کہانیاں تخلیقتا ہے۔ اپنے اس کھلے کھلے راستے کو طے کر کے اسے دور یا نزدیک کسی شیشے کے محل میں اقامت نہیں اختیار کرنا ہے، بلکہ راستوں سے راستوں تک پہنچنا ہے اور ہر راستے پر تباہ حال زندگی کی بازآبادکاری کئے جانے ہے۔ وہ لکھ لکھ کر گویا کچھ بیان نہیں کر رہا ہوتا، بلکہ اپنے لکھے ہوئے کو کر رہا ہوتا ہے اور اسے ایسا کرتے ہوئے پا کر بے لوث انسانی رشتوں پر باور کر لینا غیر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی تخلیقات میں تاکید اور اصرار کے عناصر کا شاید یہی جواز ہے کہ وہ تحریر کو بے ضرر آرائشوں کی حدود سے باہر لا کر اسے کارکردگی کا فعال ذریعہ بنا لینا چاہتا ہے۔ ایسی ہی تخلیقی شرکتیں گنجان ہو کر آخر کسی دیرپا آہنگ کی پیامبری کی اہل ہو جاتی ہیں۔

میں نے مندرجہ بالا سطور میں لکھا ہے کہ حیدر قریشی کو اپنی ساری وارداتیں اپنے جادۂ مستقیم پر پیش آئی ہیں۔ ایسا نہیں کہ سیدھے راستوں پر کوئی موڑ واقع نہ ہوں۔ اس مجموعے کی کئی کہانیوں میں راستے کہیں تمثیلی باریکی اختیار کر کے اور کہیں اچانک داستانوی پھیلاؤ میں بے ساختہ بل کھاتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور انہیں اس طرح مڑتی ہوئی سیدھ میں دیکھ کر دھیان بے اختیار دلوں کی گزرگاہوں کی طرف ہو لیتا ہے۔

"روشنی کی بشارت" کے آبادکار کی بے چینیاں گواہ ہیں کہ ابھی اسے کہانیوں کے کئی اور شہروں کو منور کرنا ہے۔ مجھے ابھی سے انتظار ہے کہ میرا ان روشن بستیوں میں بھی خوب گھومنا پھرنا ہو۔

میں ہی پنوں تھا اور میں ہی مجنوں تھا، میں ہی فرہاد تھا اور میں ہی رانجھا تھا، میں ہی کرشن تھا اور میں ہی مہندرا تھا..... میں ہر روپ میں تمہیں ڈھونڈتا تھا اور تمہارے جتنے بھی نام تھے سسّی، لیلیٰ، شیریں، ہیر، رادھا۔ مول سب ایک تھے اور میرے بھی جتنے نام ہیں سب ایک ہیں.....لیکن ہم صدیوں سے ایک دوسرے کی تلاش اور جستجو میں حصے بخرے ہوتے چلے جا رہے ہیں اور ہمارے ہر حصے میں دکھ کی ایک کہانی بنتی چلی جا رہی ہے۔۔۔۔۔''

(حیدر قریشی کے افسانہ ''**غریب بادشاہ**'' سے اقتباس)

روشنی کے شیشا گھر میں

دیوندر اِسّر

وہ لوگ بڑے خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں ہر چیز صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ جن کے دل میں کبھی کوئی شک پیدا نہیں ہوتا۔ جن کے پاس ہر سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب موجود ہے۔لیکن جب میں حیدرقریشی کی کہانیاں پڑھتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان کے دل میں شک ہی شک ہے۔سوال ہی سوال ہیں۔ جو اس دھند اور اندھیرے کی دنیا میں مسلسل بھٹک رہے ہیں۔شاید کہیں کوئی روشنی کی کرن مل جائے جس کے ساتھ چلتے چلتے وہ اس لامتناہی سرنگ سے باہر نکل آئیں جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے، سناٹا ہی سناٹا ہے۔ روشنی کی کرن کی اسی آرزو، اسی تلاش سے ان کی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ روشنی کی کرن ان کی کہانیوں کی مرکزی علامت ہے جس کے پرت در پرت کھلنے سے ان کا ضمیر اور کُل کائنات نورانی خزانہ بن جاتی ہے۔ظاہر ہے یہ تلاش باہر کے آدمی کو بھیتر کی دنیا میں لے جاتی ہے، جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام، نہ کوئی کنارا، نہ حد اور نہ طول و عرض! بس خلا ہی خلا ہے، سپیس ہی سپیس ہے، وقت ہی وقت ہے۔

جب کوئی کہانی کار بھیتر کے اس لامحدود مقام سے گزرتا ہے تو اس کی سوچ ان سرحدوں کو چھونے لگتی ہے جہاں صرف صوفی صفت ہی پہنچ سکتا ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہم جو نہ صوفی ہیں اور نہ رشی مُنی ۔ محض آدم زاد ہیں۔ ہمیں تاریخ اور ثقافت کے دائرے میں رہ کر ہی نجات حاصل کرنی ہے، راستہ ہم جو بھی اپنائیں۔ گیان کا، دھیان کا، بھگتی کا---حیدرقریشی کی کہانیاں ان مختلف راستوں سے گذرتی ہیں اور انجام کار اس نقطہ پر پہنچتی ہیں جہاں تمام ثقافتیں' تمام انسان ایک ہو جاتے ہیں-- کہانیوں کے اس لمبے سفر میں ان کے دل میں کئی سوال اٹھتے ہیں۔ یہ دبیز اندھیرا کیوں؟ صدیوں سے انسان کیوں اس خلا' اس تیرگی میں بھٹک رہا ہے۔تنہا' گم صم، اجنبی سا، بے سہارا' لعنت زدہ!---حیدرقریشی جب ان سوالوں کے روبرو ہوتے ہیں تو انہیں کوئی جواب

نہیں ملتا۔ اگر کوئی جواب ملتا بھی ہے تو وہ ایک دوسرے سوال کی صورت میں ہوتا ہے۔ یہ سوالوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے---ان سوالوں کے گھنے اور گنگ جنگل میں انہیں کئی کہانیاں ملتی ہیں۔ ایسے کرداروں سے سامنا ہوتا ہے جو انہیں کی طرح نہ جانے کب سے، کتنی صدیوں سے، جب سے انسان اس دھرتی پر اترا ہے تب سے، بھٹک رہے ہیں، روشنی کی تلاش میں، اس اولین کرن کی تلاش میں جس میں انسان اور کائنات نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ اور پھر وہ اجنبی ہوتے چلے گئے، ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے--- تو یہ ہے حیدرقریشی کی کہانیوں کا مسئلہ کہ وہ روشنی کہاں سے آئے گی جس میں اجنبی ہوتے چہرے ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔

حیدرقریشی تاریخ کے جھروکے میں جھانکتے ہیں، تہذیبوں کی سرحدوں کو عبور کرتے ہیں، مذہبی صحیفوں کی نظریاتی اور روحانی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔ انسان کی روح میں اترتے ہیں، اسکے دل کو بلوتے ہیں، اس کے تصور کے ساتھ اڑان بھرتے ہیں اور جسم کی لذت سے بھی آشنا ہوتے ہیں اور یوں کہانیاں روپ بدل بدل کر شیشا گھر میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ حیدرقریشی کی کہانیوں کی دنیا ایسے کرداروں سے آباد ہے سچائی کا المیہ جن کی قسمت بن چکا ہے۔ اسی لئے انہوں نے اپنی کہانیوں کے اردو مجموعے کا نام "روشنی کی بشارت" رکھا ہے۔ظاہر ہے ایسی کہانیوں میں اس نوع کا سچ نہیں ہے جسے اکثر ہم مجسم کائناتی سچ، سماجی سچ یا نام نہاد بھوگا ہوا سچ کہتے ہیں، کیونکہ ایسی کہانیوں میں دل کا بے انت پاتال ہے، روح کا سارا آکاش ہے، جسم کی حدوں کو توڑتا ہوا تفکر اور قوت متخیلہ ہے--- انسان اپنی کل ثقافت، جامع تاریخ، اپنے تمام گناہ و ثواب کی پونجی لئے اپنے آپ سے مخاطب ہے۔ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کدھر جا رہا ہوں؟--- یہ ایسے سوالات ہیں جو مجھے بھی مسلسل ستاتے رہتے ہیں، یہ سب کیا ہے؟ میں کیوں ہوں؟ یہ جیون کیا ہے؟ میں کیوں زندہ ہوں؟ موت کیا ہے؟ روح، غیر روح، وجود، عدم وجود، انسان، خدا، خلا!! حیدرقریشی کی کہانیاں ایسے ہی سوالوں سے پریشان ہیں اسی لئے ان کی کہانیوں میں مجسم وارداتوں کی بجائے تفکر اور احساس کی لطافت ہے۔ ایسی کہانیوں میں "ایک کافر کہانی" "روشنی کی بشارت" اور "روشن نقطہ" بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اب آپ چاہیں تو انہیں پراسرار صوفیانہ مزاج کی کہانیاں بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس صدی میں انسان سے کیا ایسا گناہ سرزد ہوگیا کہ وہ قنوطیت اور عدم شعوریت کے اندھے کنویں میں جا گرا، یا پھینک دیا گیا۔ ایٹمی دھماکے کا قہر، خوفناک وجودی اذیتیں، نفرت، کینہ ،خوں چکانی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ خود زوالیت اور ثقافت کے اس بحران سے وہ کیسے آزاد ہو پائے گا؟

حیدر قریشی کی ایک کہانی "غریب بادشاہ"--- سے ایک اقتباس:

"قدیم ثقافت آج بھی کسی نہ کسی روپ میں ہمارے ساتھ ہے۔ جذباتی نعرے بازی کر کے اس سے فرار ممکن نہیں۔ ہماری پیدائش سے لے کر شادی بیاہ اور موت تک کی رسومات پر پرانے ہندوستانی کلچر کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ کھرچنے سے بھی ختم نہ ہو"۔

"یہ ٹھیک ہے لیکن اب ہماری اپنی تہذیب کا رنگ جمتا جا رہا ہے اور ہماری اپنی تہذیب اس سے زیادہ خوبصورت ہے"۔

"یہ تہذیب بھی اس کلچر کے اثرات سے خالی نہیں۔ کلچر گم نہیں ہوتا بلکہ قدرے مختلف روپ میں پھر سامنے آجاتا ہے"۔

"بابا! اس میں کلچر کا کیا کمال ہے؟ یہ تو دھرتی کا کمال ہے۔ جغرافیے کا کمال ہے۔ یہاں کی مٹی، یہاں کے دریا، پہاڑ، کھیت، جنگل، آب وہوا، انہیں سے ہی تمہارے قدیم کلچر کی تشکیل ہوئی تھی اور انہیں عناصر ہی سے ہماری تہذیب بن رہی ہے۔ اس میں جغرافیے کے ساتھ ساتھ ہماری ہسٹری بھی شامل ہوگئی ہے"۔

کہانی کے آخر میں اس بحث کا نتیجہ کہانی کے ہیرو کے اس جملہ سے عیاں ہوتا ہے۔

"میرے اندر اور باہر میری شکست کے منظر ہیں۔ ماہ رخ نے سچ کہا تھا۔ کلچر گم نہیں ہوتا بلکہ قدرے مختلف روپ میں پھر سامنے آجاتا ہے"۔

اس کہانی سے واضح ہے کہ حیدر قریشی جغرافیائی حد بندیوں کو عبور کر کے انسان کے آفاقی روپ کو پیش کرتے ہیں۔ دراصل غور کیا جائے تو حیدر قریشی کی کہانیاں کائناتی انسان، خدا، روح، ثقافت اور ثقافتی وراثت کے ازلی سوالوں کی کہانیاں ہیں۔ ایسی کہانیاں اردو میں بہت کم لکھی گئی ہیں۔ کسی ایک مصنف کے ہاں ایسی ایک دو کہانیاں نظر آجائیں گی لیکن کوئی ایک ہی

مصنف ان ازلی سوالوں، نظریات اور حسیات سے جھوجھتا ہے ایسا کوئی دوسرا کہانی کار میری نظر میں نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حیدر قریشی کی کہانیوں میں مختلف مذہبی صحیفوں کا فشار موجود ہے۔ مثلاً ان کی ایک کہانی ہے "میں انتظار کرتا ہوں" اس کہانی میں تین کرداروں کو ایک کردار کا روپ دیا گیا ہے۔ یہ تین کردار اسلامی روایت کے مطابق حضرت اسماعیل، اسلامی اور اسرائیلی مشترکہ روایت سے حضرت یوسف اور اس برصغیر کی روایت سے بھگوان رام چندر ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حیدر قریشی ایک ہی انداز میں کہانیاں لکھتے ہیں۔ انہوں نے انسانی قلب کے اندر گہرا جھانکا ہے اور باہر کی دنیا کو بھی دیکھا ہے "پتھر ہوتے وجود کا دکھ" اور "آپ بیتی" "محبت کی کہانیاں ہیں۔ "غریب بادشاہ" برصغیر کی غیر منقسم تہذیب پر مبنی ہے، "دھند کا سفر"، "اندھی روشنی"، "بے ترتیب زندگی کے چند ادھورے صفحے" پاکستان کی سیاسی سرگرمیوں کی داستانیں کہتی ہیں۔ "مامتا" سوتیلے پن سے عاجز ایک عورت کی کہانی ہے۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ حیدر قریشی کی کہانیوں میں سوتیلا پن بھی ایک لعنت کے روپ میں ابھرتا ہے۔ حیدر قریشی کی کہانیوں کے بارے میں درست کہا گیا ہے کہ ان کی نظر میں سچائیاں آئینہ ہو چکی ہیں۔ اور وہ سچائیوں کی رہنمائی کے بغیر اپنے لئے کوئی ایسا پل بھی نہیں تلاش کر سکتے جب انہیں ذرا سی راحت ملے۔ ایسے غیر فطری پس منظر میں کبھی وہ شک اور یقین کے دوراہے پر ٹھٹھک کر رہ جاتے ہیں اور کبھی ان کا اپنا وجود سمٹ کر روح اور غیر روح میں تقسیم ہو جاتا ہے اور قاری کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایسا کیوں ہے اور ایسا کس لئے ہے؟ ان کی کہانیوں کی دنیا میں ریگستان کی رنگین ریت، آکاش کے بدلتے ہوئے رنگ اور ایک ایسا دھندلا احساس بند ہے جس میں داخل ہوتے وقت ڈر لگتا ہے۔ لیکن جس میں داخل ہوئے بغیر ہماری نجات ممکن نہیں--- دل، دماغ، روح اور نورالٰہی --- روشنی کی کرن ان کی کہانیوں میں ایک علامت بن گئی ہے جو رات کے پچھلے پہر ظہور پذیر ہوتی ہے۔ کبھی اس کے ساتھ انسانی شعور کے وہ تار جڑے ہوتے ہیں جن کی تخلیق نورالٰہی نے کی ہے اور کبھی یہ آشا کی کرن بن کر گلاب کے پھول میں جھلکنے لگتی ہے اور کبھی مامتا اور محبت بن کر دل میں بسیرا کر لیتی ہے۔ انسان خوف سے آزاد ہو جاتا ہے اور پرندوں کے پنکھ اس کو چھایا اور ہوا دیتے ہیں۔

حیدر قریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی شروعات ہیں جو واقعاتی تسلسل اور کہانی

پن پر مبنی ہوکر سوال، شک اور فکر کی بنیاد پر کہانی کا شفاف شیشا گھر تعمیر کرتی ہیں۔اس شیشا گھر میں ہم داخل ہونے کے لئے آزاد ہیں لیکن اس سے باہر نکلنے کے رستے بند ہیں،صرف ایک چھوٹا سا روشن دان کھلا ہے، ہمارے دل کا---جس میں نہ جانے کہاں سے روشنی کی کرن چھٹک کر آ رہی ہے جس کے ساتھ ساتھ چل کر ہم وقت کے اس نقطہ پر پہنچتے ہیں جہاں سچ ہمارا منتظر ہے۔

جہاں سچ سے ہم معانقہ کرتے ہیں!

(ہندی سے ترجمہ:**پروین کمار اشک**)

''توحید کا بھید!'' پیر سائیں کی آواز لرزی ''تم نے سنا نہیں۔ جو توحید کے بارے میں سوال کرتا ہے وہ جاہل ہے۔اور جو کوئی جواب دے کر اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے وہ مشرک ہے کیونکہ ''بے مثال'' کے بارے میں بتانے کے لئے اسے کسی مثال کا سہارا لینا پڑے گا'' پیر سائیں کی لرزتی آواز اب جوش سے بھرنے لگی تھی۔

''اور جو توحید کی معرفت کا دعویٰ کرے وہ ملحد ہے کیونکہ خدا لامحدود ہے اس لئے اس کا عرفان کبھی مکمل ہو ہی نہیں سکتا اور۔ جو توحید کو نہ سمجھے وہ کافر ہے'' پیر سائیں کے بیان سے میں جھومنے لگا۔مجذوب فقیر نے بھی الا اللہ۔الا اللہ کی صدائیں بلند کیں۔

''سائیں پھر تو ساری بات ایک الف پر ہی تمام ہوتی ہے'' مجھے بلھے شاہ یاد آ گئے۔

''تم نے الف سے آگے کا سبق نہیں پڑھا۔الف بھی زیادہ ہے''

اس دفعہ پیر سائیں کی بجائے مجذوب فقیر بولا اور مجھے یوں لگا جیسے بھونچال سا آ گیا ہے۔پیر سائیں بھی اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگے۔

''علم ایک نقطہ ہے جسے جاہلوں نے بڑھا دیا ہے'' مجذوب فقیر اپنی لے میں بولا ''الف تو بہت زیادہ ہے۔بات ایک نقطے میں تمام ہو چکی ہے۔'' پیر سائیں، مجذوب فقیر کی بات سن کر تڑپے اور بے ہوش ہو گئے۔دور کہیں سے بلھے شاہ کی کافی گانے کی آواز آ رہی تھی۔اک نقطے وچ گل مُکدی اے۔۔۔۔۔۔۔۔

(حیدر قریشی کے افسانہ ''**روشن نقطہ**'' سے اقتباس)

افسانے

(حیدر قریشی کے دو افسانوی مجموعے ''روشنی کی بشارت'' اور ''قصے کہانیاں'' ایک جلد میں)

قیصر تمکین

یورپ میں مقیم اردو قلم کاروں کی فہرست میں حیدر قریشی صاحب کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہ گیا ہے۔ویسے تو انہوں نے مختلف اصناف ادب میں اپنی محنت و ریاضت سے ممتاز جگہ حاصل کی ہے لیکن افسانے کے میدان میں ان کی مساعی واقعی بہت قابلِ لحاظ ہیں۔بعض بالکل ہی منفرد خصوصیات کی وجہ سے عصری کہانی کاروں میں ان کا ایک بالکل ہی علاحدہ اور نا قابلِ انکار تشخص متعین ہو چکا ہے،جس کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ ان کی کوششیں اور تخلیقات آج نہیں تو کل (نئی صدی میں ☆) ضرور اپنی آب و تاب کے پیمانے پر ایک نئے دبستان ادب و تحریر کی ہمنوائی کا شرف حاصل کریں گی۔

جن ادب شناسوں نے حیدر قریشی کے افسانوی فن پر غور سے نظر ڈالی ہے وہ ان کی واضح خصوصیات پر آسانی سے تبصرہ کر سکتے ہیں۔یہ بات یہاں اس خیال سے کہی جا رہی ہے کہ بیشتر اوقات ہم گہرائیوں کے چکر میں اور اسرار و رموز کی نشاندہی کے سلسلے میں بالکل سامنے کی باتیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

حیدر قریشی کی ایک واضح خصوصیت تو مجھے یہ نظر آتی ہے کہ ان کے یہاں غیر ارادی طور پر جدید امریکی ''تخلیقی تحریروں'' کے دبستان کی پرچھائیاں موجود ہیں۔ممکن ہے قریشی صاحب خود مجھ سے متفق نہ ہوں۔لیکن میرے تاثر کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر مکالماتی تحریروں میں وہ ڈیوڈ لاج یا اُن کے رفقاء کے انداز کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ہمارے کہانی کاروں میں یہ انداز تا حال مفقود ہے۔

خیر تو کہنا یہ ہے کہ حیدر قریشی کا مخصوص مکالماتی انداز جسے انگریزی میں Monologue کے

ڈھنگ پر واحد متکلم بیشتر اوقات استفہامیوں کی صورت میں پیش کرتا ہے، ڈیوڈ لاج ہی نہیں بلکہ بے جادہ و منزل نسل Biat Generation کے دائروں سے بھی ٹکراتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ قریشی صاحب ادب و سماج کے تسلسل اور فرائض کے بارے میں ایک بہتر اور باشعور طرزِ فکر کے قائل ہیں۔ دوسری خوبی۔۔جس کے بارے میں کوئی واضح تبصرہ قبل از وقت ہے۔ یہ ہے کہ حیدر قریشی کی ہر کہانی کی ابتدا ایک شعر سے ہوتی ہے۔ یہ طرزِ تحریر بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بہت مروّج تھا۔ ایم اسلم تو اس کے ماہر تھے۔ لیکن تقسیم ہند کے بعد یہ ادبی نوادر خانوں میں بھی نسیاً منسیا ہو گیا۔ حیدر قریشی نے اس طریقے کو نسیان خانوں سے نکال کر پھر استعمال کیا ہے، لیکن ایک ندرت کے ساتھ۔۔۔دوسرے قلم کار ''اقوالِ زرّیں'' کے طور پر اشعار یا کہاوتوں کو استعمال کرتے ہیں۔ حیدر قریشی نے ہر نفس مضمون کی وضاحت کے لئے خود اپنے ہی اشعار پیش کئے ہیں اور یہ کہنا واقعی ناممکن ہے کہ انہیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

حیدر قریشی مختلف میدانوں میں سرگرم تگ و تاز ہیں۔ ان سے یہ شکایت بالکل جائز اور بروقت ہے کہ وہ افسانہ نگاری کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہی ایک میدان ایسا ہے جس کی طرف اگر وہ پورے انہاک سے دلچسپی کا اظہار کریں تو ایک ممتاز اہمیت و عظمت ان کا مقدر بن جائے گی۔ ان یک افسانوں کا مجموعہ دیکھ کر (میں کوشش کرتا ہوں کہ اردو کہانیاں جہاں کہیں بھی مل سکیں توجہ اور غور سے پڑھوں) اور دلچسپی سے پڑھ کر اپنے تاثرات کا اظہار کر رہا ہوں۔ کسی ایک افسانے کے حسن و قبح کو زیر بحث لانے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ پھر سب کی نگاہیں اسی طرف مرکوز ہو جاتی ہیں اور دوسرے (کبھی کبھی بہتر) افسانے پس پشت چلے جاتے ہیں۔ میں نے کسی افسانے کو مرکز توجہ بنانے کے بجائے پورے مجموعے پر ایک رائے دی ہے۔ جو حضرات حیدر قریشی کا مجموعہ پڑھنے کی زحمت فرمائیں گے وہ مجھ سے اختلاف یا اتفاق بے شک کر سکتے ہیں لیکن وہ جو کچھ بھی کہیں گے وہ پڑھنے کے بعد ہی کہہ سکیں گے۔ میرا مقصد بھی یہی ہے کہ مطالعہ شرط اوّل ہے۔ اس کے بعد جو بھی تاثرات ہوں گے وہ ہر طرح مقصد ادب کے زمرے میں شامل کئے جا سکیں گے۔

☆ یہ مضمون گزشتہ صدی کے سال ۱۹۹۹ء میں لکھا گیا تھا

افسانے

(روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں)

ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

''افسانے'' مصنف کی قائم کردہ تقسیم کے مطابق ٹو اِن ون قسم کا مجموعہ ہے۔ جزو اوّل ''روشنی کی بشارت'' میں تیرہ افسانے اور جزو دوم ''قصے کہانیاں'' میں بارہ کہانیاں ہیں۔ حیدر قریشی کے طرزِ نگارش کی خوبی اس کی رمزیت، علامتوں کی تہہ داریاں، اشاروں کنایوں میں مقصدیت کی ترسیل کی فکر ہے۔ اس لیے ان کے نتائج سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ جس کو بالارادہ قاری کے ذمے چھوڑ دیتے ہیں۔ بلاشبہ ابلاغ مقصد کا یہ ہنر ایسی وسیع دنیا کی سیر کراتا ہے جس سے حظ حاصل کر کے اقدار کی بازیافت کے اسباب فراہم ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کی یہ انفرادیت قدیم داستانی رنگ سے بھی الگ ہے اور دورِ جدید کے افسانوں سے بھی جدا ہے، جن سے بڑی حد تک کہانی پن کا اخراج ہے اور وہ غیر مربوط اور مبہم خیالات کا ایسا معمہ ہیں جو سمجھنے کا ہے نہ سمجھانے کا۔

حیدر قریشی کے افسانوں میں تاریخی حقایق کی جھلک اور مشاہدات کی مہک ہے۔ مذہبی افکار و عقاید کے اظہار میں ان کا وہ فنی سلیقہ بھی نمایاں ہے جو انہیں خطیب ہونے کے الزام سے بری کرتا ہے۔ ان کے افسانوں میں زہاد کی سی خشک بیانی کی جگہ جمالیات کے ساتھ طرزِ ادا کی وہ سچائیاں ہیں جو مینارۂ نور بن کر رہنمائی کرتی ہیں۔ حیدر قریشی ارضی مسایل کے افکار میں محض کرب حیات کی ترجمانی نہیں کرتے جو قنوطی بنا کر انسان کو مجہول اور از کار رفتہ کر دے، بلکہ ان میں وہ تہذیبی، اخلاقی، معاشرتی اور تاریخی حقایق کی ایسی جاذب نظر تصویر پیش کرتے ہیں جو ضمیر پر دستک دے کر

خواب غفلت سے بیدار کرتی ہے۔اس طرح وہ انسانی فکر کو نئی جہات اور نئے امکانات سے روشناس کراتے ہیں۔''گلاب شہزادے کی کہانی''میں زندگی کی سچائیاں ہیں۔''شناخت''حیوانیت اور درندگی سے معمور انسانوں کی شرمناک داستان ہے جس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔''روشنی کی بشارت''اور''ایک کافر کہانی''میں حیدر قریشی کے مذہبی افکار وعقاید کا پرتو نظر آتا ہے۔اسی طرح ان کے دوسرے افسانے بھی ان کی فنی صلاحیتوں اور صحتمند تعمیری مقصدیت کی غمازی کرتے ہیں۔

سبھی افسانے نئے زاویۂ نگاہ، نئے لہجہ، اور اسلوب نگارش اور نئی فکر سے آراستہ ہیں۔اس کے علاوہ جدیدیت کے شیدائیوں کو نئی سمتوں اور ان امکانات سے آشنا کرتے ہیں جن کے رشتے انسانیت کی بازیافت اور اس کی بہبود و بقا سے مستحکم ہیں۔افسانوی ادب میں حیدر قریشی کے افسانے لائق قدر اضافہ ہیں۔

میں نے اپنا سارا دکھ شاہ جی کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ان کی آنکھوں میں
ایک ملکوتی چمک پیدا ہوئی۔''شیطان ہمارے اندر بھی ہوتا ہے اور باہر بھی۔
جنّوں میں بھی، انسانوں میں بھی اور ان سے سوا بھی۔شیطان کے لاکھوں روپ
اور کروڑوں حربے ہیں۔ہم عاجز انسان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''شاہ جی ذرا
دم لینے کو رُکے اور پھر گویا ہوئے''ہم شیطان کو مار نہیں سکتے اس لئے کبھی بھی
شیطان کے ساتھ نہیں لڑنا''   مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔
یا الٰہی! یہ شاہ جی کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے پریشانی کے عالم میں سر اٹھا کر شاہ جی
کو دیکھا۔ان کی آنکھوں میں وہی ملکوتی چمک تھی۔
''ہاں۔ہم شیطان کو ہلاک نہیں کر سکتے اس لئے کبھی بھی شیطان کے ساتھ نہیں
لڑنا۔بس جتنا ہو سکے اس نامراد سے بچ کر رہو اور اس سے دور بھاگو۔اس سے
دور بھاگنے ہی میں عافیت ہے اور یہی تقویٰ ہے''۔شاہ جی کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔
(حیدر قریشی کے افسانہ'**دو کہانیوں کی ایک کہانی**' سے اقتباس)

افسانے،

روشنی کی بشارت اور قصے کہانیاں

بیگم وسیم راشد

افسانے''روشنی کی بشارت''اور''قصے کہانیاں''حیدر قریشی کے دو افسانوی مجموعے ہیں جو ایک ہی جلد میں شائع کئے گئے ہیں۔ان کے زیادہ تر افسانوں میں ایسا لگتا ہے کہ خود کہانی کار کی ذات اس میں پوشیدہ ہے۔حالانکہ زیادہ تر افسانے علامتی ہیں اور ان کے کردار آسمانوں کی مخلوق ہیں لیکن وہ نت نئے طریقوں سے ان کو آسمان سے زمین پر لے آتے ہیں۔

"میں جو صحرا میں پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ رہا ہوں ابراہیم کا بیٹا ہوں"

"میری آنکھوں میں طلوع ہوتے سورجوں کا گواہ مٹی کا چراغ میرے ہاتھوں میں ہے لیکن کوئی بھی میری بشارت پر ایمان نہیں لا رہا"

اپنے ان افسانوں میں مصنف نے اس حقیقی روشنی کی بشارت دی ہے جو انسان کو سچائی کا راستہ دکھاتی ہے۔یہ سچائی صرف اور صرف ہمارے ضمیر پر منحصر ہے اگر ضمیر زندہ ہے تو یہی روشنی ہمیں موسیٰ بھی بنا سکتی ہے۔جنہوں نے کوہ طور پر صرف ایک روشنی دیکھی تھی اور وہ خدا کا جلوہ تھا

مصنف نے اپنے کئی افسانوں میں عورت کے وجود کو بہت اہم تسلیم کیا ہے عورت جو شجر ممنوعہ تک لے جانے کی ذمہ دار ہے لیکن مرد جنت بدر ہونے کے باوجود بار بار اس گندم کے قرب میں آ جاتا ہے۔عورت وہ ہستی ہے کہ بڑے بڑے تجرد پسند بھی جس کے لیے مجبور ہو گئے اور ایسی عورت کے پرائے ہونے کا دکھ مصنف"پتھر ہوتے وجود کا دکھ"افسانے میں بہت خوبصورتی اور علامتی انداز میں بیان کیا ہے اس افسانے کی شروعات جس شعر سے کی گئی ہے وہ بھی بہت خوب ہے۔

بکھر گئے ہیں ملن کے تمام دن حیدؔر
ٹھہر گئی ہے جدائی کی رات آنکھوں میں

مصنف کے اس مجموعے میں 13 افسانے ''روشنی کی بشارت'' کے اور 12 ''قصے کہانیاں'' کے ہیں اور ہر افسانہ ایک شعر سے شروع ہوتا ہے یعنی قاری کو حیدر قریشی کو بحیثیت شاعر جاننا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔مصنف کا ہر شعر اپنے اندر بڑی معنویت اور گہرائی رکھتا ہے اور روح تک میں اتر جاتا ہے۔

حیدر قریشی کے شعر بھی اپنے اندر بڑی نغمگی رکھتے ہیں ۔بڑے پر معنی اور عنوان ان کے لحاظ سے مناسب ہیں ۔بلکہ میرا دل تو چاہتا ہے کہ میں یہ کہوں کہ ان کی تو پوری نثر ہی مجھے نظم کا لطف دے گئی کیونکہ ان کے افسانوں میں ایک عجیب سی نغمگی ہے جو ان کی نثر کو بھی نظم بنا دیتی ہے

مصنف کے کئی افسانے بڑے عبرت انگیز ہیں جیسے ''کاکروچ'' جس میں ایٹمی جنگ کے بعد انسان کے حوالے سے ایک بہت ہی عجیب وغریب دنیا ملتی ہے کیونکہ لوگ ایٹمی جنگ کی بات تو بڑے آرام واطمینان سے کر جاتے ہیں لیکن اس سے ہونے والی ہولناک تباہی اور اس کے اثرات کا کسی کو اندازہ نہیں ۔حیدر قریشی نے ایٹمی جنگ کے بعد انسان کو پھر اسی جنگل میں پہنچا دیا ہے جہاں سے اسکی کی ابتدا ہوئی تھی ۔مصنف نے تہذیب کی تاریخ کو بڑے ہی دل آویز انداز میں بیان کیا ہے وہ وقت کے قصے ہیں جو داستان دل بھی ہیں تہذیب کی تاریخ بھی۔

حیدر قریشی کے یہاں ایمان کی حرارت ملتی ہے اور ایمان زندہ ہو تو معجزوں کا ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں ان کا افسانہ ''بھید'' ان کے ایمان آفرین تجربوں سے پُر ہے ۔ان کے کردار سچائی کا المیہ ہیں ان کا قاری اپنے آپ کو اس زمانے میں محسوس کرتا ہے ان فضاؤں میں سانس لیتا ہے جس زمانے کی وہ تخلیق کر رہے ہوں۔

حیدر قریشی کی کہانیوں میں نہ غصہ ہے نہ جھنجھلاہٹ نہ وہ کسی پر الزام تراشی کرتے ہیں وہ تو اپنے تجربات واحساسات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن گئے ہیں ۔ان کی کتاب کا سرورق بے حد شاندار اور پر اسراریت لیے ہوئے موڈرن آرٹ کا نمونہ ہے ان کا اسلوب بہت مدھم ،شائستہ اور تر وتازہ ہے لیکن ان کے افسانے عام قاری کو شاید مشکل سے سمجھ میں آئیں گے کیونکہ حیدر کے یہاں گہری ادبیت بھی ہے اور تلوار کی کاٹ بھی اور ان کا قاری وہی ہو سکتا ہے جس کا ادبی ذوق نکھرا ہوا اور پختہ ہو۔

حیدر قریشی کے افسانے

انجلا ہمیش

ماں اپنے بچے کو سلانے کی کوشش میں کہتی ہے ''میرے بچے سو جا نہیں تو اللہ بابا آ کے ڈانٹیں گے'' یا پھر چاند کو بچوں کا ماما بنا کر لوری سنانا ،کسی شخصیت کو پر اسرار بنانے کے لئے طرح طرح کی باتیں اور پھر انسانی نفسیات جو کسی کی محبت میں بہت سی خوبیاں دریافت کرتی ہے اور کسی کی نفرت میں اس کا خامیاں دریافت کرتی ہے۔

یہ اللہ بابا کا کوف، چندا ماما کا تصوّر اور انسان کے رویوں کی عملی صورت،اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی کہانی انسان کے ساتھ سفر کرتی رہی ہے۔مگر اپنی جگہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تاریخ میں ایسی بہت کم ہستیاں گزری ہیں جنہوں نے کہانی کو اپنا ہمسفر بنایا۔یعنی کسی واقعہ کو محض بیان کرنا نہیں بلکہ اس واقعہ کی روح تک اترنا اور اپنے اندر محسوس کر کے برتنا۔۔۔یہی ہے کہانی اور کہانی کار کا سفر۔

جناب حیدر قریشی نے اپنے دونوں افسانوی مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' اور ''قصے کہانیاں'' میں انکشافات کا سفر طے کیا۔ایک ایسا سفر جس میں مسافر پہ جانے کیسے کیسے دکھ منکشف ہوئے اور ایک موڑ پہ آ کے مسافر اپنے اس دکھ کو بیان کرتا ہے کہ:

''میں سوتیلے جذبوں کے عذابوں سے گزرتا ہوں کہ مجھے اپنا سفر مکمل کرنا ہے''

(میں انتظار کرتا ہوں)

مگر کیا یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سفر مکمل ہو سکے گا؟ کیا سوتیلے جذبے اس سفر میں حائل نہیں ہوں گے؟ جیسے نماز کے سفر میں سجدے تک پہنچتے ہی اسٹین گن اٹھائے مکروہ تکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا ایک شخص سامنے آ جاتا ہے اور کہتا ہے:

''میں تمہیں خدا تک نہیں پہنچنے دوں گا'' (ایک کافر کہانی)

یہاں ایک سوال جنم لیتا ہے کہ جسے ہم منزل سمجھتے ہیں کیا واقعی وہی ہماری منزل ہے؟ جس لمحہ ہم جی رہے ہیں کیا واقعی وہ ہماری زندگی ہے؟ یہ سوال حیدر قریشی نے اپنی کہانی ''اندھی روشنی'' میں اٹھایا ہے۔ایسی چکا چوند روشنی جو آنے والے اندھیروں سے بے خبر رکھے۔انسان کے ساتھ بہت بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ لالچ میں ان چیزوں کی طرف بڑھتا ہے جو بظاہر بہت خوبصورت اور مفاد میں معلوم ہوتی ہیں مگر اس خوبصورتی اور مفاد کے پیچھے جو بدصورتی اور گھاٹا چھپا ہوتا ہے وہ انسان کو اس وقت محسوس ہوتا ہے جب سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔صحیح کہا حیدر قریشی صاحب نے

باہر کے شیطان خرابی سی کر جاتے ہیں
ورنہ ہر انسان کی فطرت نوری ہوتی ہے

جیسا ''انکل انیس'' میں انہوں نے ان تنظیموں پر طنز کیا ہے جو عورتوں کے حقوق کے آڑ میں اپنی عیاشیوں کا سامان کر رہی ہیں۔اور یہ ایک تلخ حقیقت کہ ان شیطان صفت تنظیموں نے عورتوں کو حقوق کے نام پر سرِ عام بے لباس کر دیا ہے۔اب مشکل یہ ہے کہ ان تنظیموں کا خاتمہ کیسے کیا جائے؟ یہ تو Neuclear Poison کی پیداوار ہیں،جیسے حیدر قریشی نے اپنی کہانی ''کاکروچ'' میں ہمیں بتایا ہے کہ آنے والے دور میں اس زمین کے مالک اور حکمراں کاکروچ ہوں گے۔

گویا اس سفر میں یہ بات منکشف ہوئی کہ اسٹین گن اٹھائے مکروہ تکونے چہرے اور نحوست برساتی آنکھوں والا شخص Neuclear Poison کی پیداوار ہے اور اس Element کی وجہ سے مزید منحوس اور مکروہ چہرے روئے زمین پر Growth کرتے رہیں گے۔

کئی بار اس نے سوچا اس سے تو بچپن کا وہ نلکا اور کھرّا بہتر تھا۔وہاں اتنی شدید گھٹن تو نہیں تھی۔ تنگ باتھ روم میں جا کر کبھی کبھی اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی ملنگ ہے جو کسی شہزادی پر فریفتہ ہو گیا ہے اور بادشاہ نے اسے سزا کے طور پر دیواروں میں زندہ چُن دینے کا حکم دے دیا ہے۔تب وہ نہائے بغیر ہی گھبرا کر باہر نکل آتا۔

(حیدر قریشی کے افسانہ '**گھٹن کا احساس**' سے اقتباس)

حیدر قریشی کے افسانے۔چند اہم آراء اور تبصرے

ڈاکٹر وزیر آغا: "پتھر ہوتے وجود کا دکھ" بہت عمدہ افسانہ ہے۔اگر آپ اسی رفتار اور انداز سے آگے بڑھتے رہے تو بہت جلد صف اول کے افسانہ نگاروں میں شمار ہونے لگیں گے"۔

ڈاکٹر قمر رئیس: "کہانیاں علامتی ہیں لیکن معاصر جدید کہانیوں سے الگ اور انوکھی۔یہاں تاریخ گنگناتی ہے۔انسانی تہذیب سرگوشیاں کرتی ہے اور ان کی کوکھ سے آج کے جلتے ہوئے مسائل پھنکار مارتے نکلتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔پرکشش کہانیاں جو سوچنے پر اکساتی ہیں"۔

ڈاکٹر انور سدید: "حیدر قریشی بظاہر ادب کی کئی اصناف میں ایک طویل عرصے سے بڑی پختہ کاری سے تخلیقی کام کر رہے ہیں تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ افسانے کے دیار میں قدم رکھتے ہیں تو فطرت اپنے اسرار کی گتھیاں ان پر بانداز دگر کھولتی ہے۔"روشنی کی بشارت" ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے لیکن وہ نئے افسانہ نگار نہیں۔ان کا شمار ساتویں دہے کے ان افسانہ نگاروں میں کرنا مناسب ہوگا جو تجریدیت سے معنی کا نیا مدار طلوع کرتے اور سوچ کو نئی کروٹ دیتے ہیں۔

"روشنی کی بشارت" کے افسانوں میں حیدر قریشی کرنوں کے تعاقب میں سرگرداں نظر آتا ہے لیکن جب اسے سدھارتھ کا معصوم چہرہ نظر آ جاتا ہے تو اسے اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس کل جگ میں زندہ رہنے کا جواز موجود ہے۔ترقی پسند افسانہ نگاروں نے اپنے نظریاتی انسان کو کلیت کے دائرے میں محصور کر دیا تھا۔حیدر قریشی نے اس دائرے کو توڑ کر اس منفرد انسان کو پیش کیا ہے جو اپنے خالق کا نائب ہے اور جس کا وجود پوری دنیا میں ہر جگہ موجود ہے۔"دھند کا سفر" "ہوا کی تلاش" "گلاب شہزادے کی کہانی" "مامتا" "اپنی تجرید کے کشف کا عذاب" جیسے افسانوں میں حیدر قریشی نے اندھیرے سے روشنی کی جہت میں سفر کیا ہے۔بے اطمینانی سے اطمینان کی دولت تلاش کی ہے۔خودغرض انسان کا سامنا کرتے کرتے جب اس نے بے لوث اور بے ریا انسان سے ملاقات کر لی تو اس کا دل شانت ہو گیا۔"روشنی کی بشارت" کے افسانے ایک ایسے فنکار کی

تخلیقات ہیں جس نے روح اور مادے کو متصادم دیکھا اور عرفان کی منزل خود تلاش کی"۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی:"حیدر قریشی الہامی قصص، اساطیر، ذاتی اور معاشرتی مسائل کو آپس میں مدغم کر کے ایک ایسا آئینہ تخلیق کرتے ہیں جس میں پیدائش سے موت تک زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ بیشتر کہانیوں میں میجر کردار خود کہانی کار کی ذات ہوتی ہے اور اس طرح حیدر قریشی فلسفیانہ، مذہبی اور اخلاقی قدروں پر رائے بھی دیتے ہیں تو کسی غیر متعلق یا خارجی خیال آرائی کا احساس نہیں ہوتا اور سب کچھ کہانی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

حیدر قریشی کی کہانیاں زمینی زندگی کے معمولی واقعات سے شروع ہوتی ہیں جنہیں فلو بیر کے لفظوں میں SLICES OF LIFE کہا جا سکتا ہے مگر ان میں جلد ہی مذہبی، عقیدتی اور روحانی رنگ بکھرنے لگتا ہے اور ان کی اٹھان عمودی ہو جاتی ہے۔ پھر ان کہانیوں کی فضا زمین اور آسمان کے بہت بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اکثر کہانیوں کا اسلوب داستانی معلوم ہوتا ہے لیکن لہجہ کا دھیما پن، علامتوں، تمثیلوں اور تلازمے کا استعمال انہیں داستانی رنگ سے الگ بھی کرتا ہے۔ کہیں کہیں مذہبی عقائد کا اظہار بھی ہوتا ہے مگر جمالیاتی طور پر ان میں نہ کوئی خطابیت پیدا ہوتی ہے اور نہ کسی آئیڈیل یا انفرل دنیا میں داخل ہونے کی ترغیب ہوتی ہے۔ حیدر قریشی کی کہانیوں میں زبان اور حوالہ جات اس وقت، زمانے اور علاقے کی حدوں کا تاثر ضرور دیتے ہیں جب اور جہاں ان کی کہانیوں نے جنم لیا کیونکہ اس سے کسی تخلیق کار کو مفر نہیں، لیکن ان کہانیوں کا مجموعی سپکٹرم زمان اور مکاں کی قید سے آزاد ہوتا ہے اور دنیا کے کسی بھی حصے کا قاری ان کہانیوں میں امکانی سچائی دیکھ سکتا ہے"۔

پروفیسر ڈاکٹر حمید سہروردی:"حیدر قریشی کے افسانے پریم چند اور یلدرم کے اسلوب و مزاج کی آمیزش اور آویزش سے اپنا ایک نیا افسانوی مزاج اور ڈکشن تیار کرتے ہیں۔ ان کا تجربہ ہم سب کا تجربہ بن جاتا ہے۔ ان کی بصیرت تیز اور روشن ہے اور وہ افسانے کی میڈیم سے روزمرہ زندگی کے انگنت تجربوں کو کچھ اس طرح سے گرفت کرتے ہیں کہ زبان وقلب سے بے ساختہ حیرت اور استعجاب کے کلمات ادا ہوتے ہیں۔ حیدر قریشی اپنے رنگ و مزاج کو اپنے ہر افسانے میں افسانوی زبان کے تخلیقی واکتسابی امتزاج کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کی خوبی نہ صرف ڈکشن میں ہے بلکہ موضوعات کے برتاؤ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

میں ذاتی طور پر حیدر قریشی کو جدید تر افسانوی میدان میں کامیاب و کامران سمجھتا ہوں۔ ان کا یہی انداز توازن و تناسب کے ساتھ برتا جائے تو وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھیں گے اور وہ حضرات جو جدید اور جدید تر افسانے کے باب میں شاکی ہیں اطمینان حاصل کر لیں گے"۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:حیدر قریشی کے افسانے میں تجربے کا نقش ہے، مشاہدے کی باریکی ہے، زندگی کے فلسفے کی جھلک ہے اور اشارات و کنایات ہیں، ساتھ ہی تفہیم کی فکر نمایاں ہے۔ بیانات قاری یا سامع کو ایک طرح کی خود اختیاری سچویشن میں لا کر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ حالات سے اثر تلاش کرے۔ یہ خود اختیاری (option) کی صورت پرانے افسانہ نگاروں کے ابلاغ سے الگ ہے اور جدیدیوں کے خود میں گم ہو جانے والی ترکیب (Device) سے جدا ہے۔ اس طرز میں نہ غصہ ہے نہ جھنجھلاہٹ، نہ الزام تراشی۔ بس ایک گہرا تاثراتی بیان ہے جو ذہن کے خانوں سے ہوتا ہوا واقعات میں پھیل جاتا ہے۔

ڈاکٹر ذکاء الدین شایاں: ہمارے نئے افسانہ نگاروں نے ترقی پسندی کی ضد میں افسانے کا کچھ ایسا طریقہ کار بھی اختیار کیا کہ اس صنف کی اپنی زمین متزلزل ہو گئی۔ اس افراتفری کے عالم میں حیدر قریشی کے افسانوں کا مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' بہت متوازن اور منفرد معلوم ہوتا ہے، جس میں بھرپور علامتی، تمثیلی اور اشاراتی زاویوں سے کام لیتے ہوئے مصنف نے اپنے زمانے کے جدید مسائل اور سماجی، مذہبی، صحافتی اور شخصی احساسات کو آج کے نئے انسان کی مرکزیت اور اکائی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مسعود منور:" آپ کی کہانیوں سے مجھے کوئی بیتی خوشبو آئی ہے۔ ٹھہریئے میں اگر جلالوں---- میں اگر جلا آیا ہوں اور خوشبو میں بھیگتے ہوئے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔ مجھے آپ کا کہانی بننے کا ڈھنگ نویکلا لگا ہے"۔

سعید شباب: کافکا کی تقلید، تجریدیت اور بے معنویت کے مختلف تجربات سے گزرنے کے بعد آج جدید افسانے نے اپنی راہیں متعین کر لی ہیں۔ جو افسانوی مجموعے جدید افسانے کی آبرو اور شناخت سمجھے جا سکتے ہیں ان میں ''روشنی کی بشارت'' بے حد اہم ہے اور مجھے یقین ہے کہ حیدر قریشی کے افسانے اپنے عصر کو عبور کرنے کے بعد زیادہ بامعنی اور معتبر قرار پائیں گے۔

میری محبتیں

ڈاکٹر انور سدید

حیدرقریشی کی ترقی کا گراف عمودی بھی ہے اور افقی بھی۔انہوں نے عمودی ارتقاء ادب میں کیا اور افقی ترقی زندگی میں۔ادب میں وہ غزل سے چلے تو گردوپیش کے حقائق کو بڑی خوبی سے عمومی گردش دی اور اچھی غزل لکھی۔پھر وہ حیات و کائنات کے گہرے مسائل پر غور کرنے کے لئے افسانہ نویسی،انشائیہ اور تنقید کی طرف آ گئے۔انہوں نے زندگی کا ابتدائی سفر خانپور سے شروع کیا ۔پھر ایبٹ آباد میں نظر آئے اور اب جرمنی پہنچ گئے ہیں جو نوبل پرائز کی سرزمین سے قریب ہے۔
حال ہی میں حیدر قریشی نے مجھے خاکوں کی کتاب ''میری محبتیں'' کا تحفہ بھیجا ہے۔اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں حیدر قریشی نے اپنے خون کے رشتوں کو ذرا فاصلے سے دیکھا اور اور ان کی شخصیت کی وہ پرتیں ہمارے سامنے پیش کیں جن سے ان کرداروں کی فطری ہمدردی،محبت اوراخوت کی قدروں کی تعمیر ہوئی۔اس قسم کی ایک عمدہ کاوش پہلے غلام الثقلین نقوی اور پھر اکبر حمیدی نے سرانجام دی ہے۔عزیز واقربا کی شخصیت کے زاویے خودنوشت سوانح عمریوں میں بھی کثرت سے نظر آتے ہیں۔یہاں مجھے وزیر آغا کی خودنوشت سوانح حیات ''شام کی منڈیر سے'' کے دو کردار مولانا صلاح الدین احمد اور شمس آغا یاد آ رہے ہیں جنہیں متذکرہ کتاب میں آپ زندہ اور متحرک دیکھ سکتے ہیں۔حیدر قریشی نے اپنی والدہ،دادا،والد،بیوی،بہن اور بچوں کو انسانی زاویے سے دیکھا اور ان کی صرف انسانی خوبیوں کا تذکرہ کیا لیکن یہ تذکرہ اتنا دلچسپ ہے کہ یہ سب کردار حقیقی معاشرے کی غیر معمولی شخصیات نظر آتی ہیں۔''برگد کا پیڑ''،''اجلے دل والا''، ''زندگی کا تسلسل''،''پسلی کی ٹیڑھ'' بے حد معنی خیز خاکے ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ جن لوگوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر رہا ہے وہ حقیقی معنوں میں عظیم تھے۔ان کی عظمت اشتہاری نہیں تھی۔کتاب کا پہلا حصہ ''اوّل خویش'' ہے۔

دوسرا حصہ ''بعد درویش'' میں ڈاکٹر وزیر آغا،غلام جیلانی اصغر،اکبر حمیدی،عذرا اصغر اور میرزا ادیب کے خاکے شامل ہیں۔اس حصے میں انہوں نے دیدہ کے ساتھ شنیدہ بھی شامل کر لیا ہے۔شخصیات کا واضح نقش مرتب کرنے اور عقیدت واحترام کی نہایت کو ابھارنے میں حیدر قریشی نے کامیابی حاصل کی ہے۔غلام الثقلین نقوی نے یہ کتاب دیکھی تو فی البدیہہ بولے کہ:
''اس میں متعدد ''درویشوں'' کا ذکر نہیں ہے'' میں سمجھ گیا کہ ان کا اشارہ کن لوگوں کی طرف تھا۔

اباجی کی وفات کے بعد ہم نے ان کی میّت کو سر سے پیروں تک گلاب کے پھولوں سے بھر دیا تھا اور پھولوں سمیت ہی دفن کیا تھا۔وفات کے تیئیسویں دن،رات کے نو بجے کے بعد اس کمرے کی کھڑکی سے گلاب کی خوشبو کی تیز لپٹیں اٹھنے لگیں جو اباجی کا ذاتی کمرہ تھا۔ یہ خوشبو پہلے امی جی نے محسوس کی اور مجھے کمرے میں بلایا۔کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے گلاب کی تیز خوشبو کا احساس ہوا۔میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیئے۔میری ایک کزن خالدہ کے دیور شاہد حسین بھی اس وقت ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔میں نے انہیں بھی کمرے میں بلا لیا۔انہوں نے بھی حیرانی کے ساتھ خوشبو کی موجودگی کی تصدیق کی۔خوشبو اتنی تیز تھی کہ باہر کی گلی میں بھی ہلکی ہلکی محسوس ہو رہی تھی جبکہ کھڑکی سے تو خوشبو کا سیلاب امڈ رہا تھا۔ایک دن کے وقفے کے بعد دوپہر کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے اسی کمرے میں پھر گلاب کے پھولوں کی تیز خوشبو پھیل گئی۔ اس خوشبو کو میں نے کمرے میں آ کر محسوس کیا اور پھر آوازیں دے کر سارے افراد خانہ کو جمع کر لیا۔سب نے ہی خوشبو کو محسوس کیا۔چند منٹ کے بعد خوشبو غائب ہوتی چلی گئی۔دونوں دفعہ خوشبو کا جانا ایسے لگا جیسے کوئی انسان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے نکل رہا ہو۔۔بابا جی نے مجھے کہا کہ اگر تم اس معاملے میں دوسروں سے بات نہ کرتے تو یہ خوشبو وقتاً فوقتاً تمہاری ماں کو اور تمہیں ملتی رہتی۔شاید خوشبو سے بڑھ کر بھی کچھ رونما ہو جاتا۔ مگر تم نے اس کا بھید افشا کر کے خود کو اس سے محروم کر لیا ہے۔
(حیدر قریشی کے خاکہ ''**برگد کا پیڑ**'' سے اقتباس)

میری محبتیں

قاضی اعجاز محور

میں نے حیدر قریشی کی کتاب "میری محبتیں" جب دیکھی تو عنوان کے حوالے سے جو بات سب سے پہلے میرے ذہن میں آئی وہ اس کے ٹائیٹل کے بارے میں تھی۔ میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ نام کی مناسبت سے ٹائیٹل پر کوئی خوبصورت نسوانی چہرہ یا چہرے ہوتے تو بہتر ہوتا۔ تاہم گلاب بھی محبت کی علامت ہیں۔ پھر کتاب کے مطالعہ سے آہستہ آہستہ تمام شخصیتیں پھولوں کا روپ دھارتی چلی گئیں اور گلابوں میں مجھے خوبصورت چہرے نظر آنے لگے۔

"اول خویش بعد درویش" کی ترتیب میں حیدر نے اپنی محبتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ پہلا حصہ ان محبتوں کا ہے جو ہر انسان کے حصہ میں کافی حد تک لازماً آجاتی ہیں جبکہ دوسرا حصہ ان محبتوں کا ہے جن کے حصار میں انسان خود جانے کی تمنا کرتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر دو محبتوں کا ایک دوسرے سے موازنہ یا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ محبت ایک ناقابلِ پیمائش جذبہ ہے اور انسان زندگی میں مختلف لوگوں سے ایک ہی وقت میں ہر اعتبار سے سچی محبت کرتا ہے۔ ایک محبت وہ اپنے ماں باپ سے کرتا ہے، ایک اپنے بیوی بچوں سے یا پھر کسی اور سے---- مگر اس کی ان محبتوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ یا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ یا اس سے یہ نہیں پوچھا جاسکتا کہ تمہاری سچی محبت کون سی ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے مختلف رنگوں کے گلاب کے پھول سامنے رکھ کر ان میں سے اصلی گلاب کے چناؤ کے لئے کہا جائے۔

حیدر قریشی کے اپنے قریبی عزیزوں کے بارے میں لکھے ہوئے خاکے ہوں یا دوسرے احباب کے بارے میں، دونوں میں اس کی محبتیں بڑی نمایاں ہیں اور انہیں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ انسان زندگی میں صرف ایک بار محبت نہیں کرتا بلکہ کرتا چلا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات

کی ہوتی ہے کہ اس کے اندر محبت کرنے کا جذبہ موجود ہو۔

کتاب کے پہلے حصہ میں دس خاکے حیدر کے قریبی عزیزوں کے بارے میں ہیں اور دوسرے حصہ میں ادبی شخصیات اور احباب کے خاکے ہیں جن میں میرزا ادیب، فیض احمد فیض، وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، اکبر حمیدی، عذرا اصغر، سعید شباب، محمد اعجاز اکبر، طاہر احمد اور خانپور کے احباب شامل ہیں۔

خاکہ نگاری کے بارے میں حیدر قریشی کے حدود کیا ہیں اس بارے میں ہمیں ایک اشارہ مصنف کے اکبر حمیدی پر لکھے خاکے میں ملتا ہے۔

"اکبر حمیدی کے خاکے سرسبز، پیڑوں کی طرح اس ادبی آلودگی کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ خاکہ نگاری نہ تو شخصیت کی خاک اڑانے کا نام ہے اور نہ شخصیت پر خاک ڈالنے کا---- بلکہ یہ تو پل صراط سے گذرنے کا عمل ہے۔''

میری محبتیں پڑھتے ہوئے بھی یہی احساس ہوتا ہے کہ حیدر قریشی نے اپنے خاکوں کے لئے بھی یہی "ضابطہ اخلاق" اپنایا ہے اور اپنے لئے پل صراط سے گذرنے کے کٹھن مرحلے کو بہت آسان بنالیا ہے۔

خاندان کی شخصیتوں کے بارے میں لکھے گئے خاکوں میں رشتے کا احترام، خاندانی محبت اور ایک تعلق کا لحاظ بہت نمایاں ہے اور یہ جذبہ اتنا شدید ہے کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ خاکہ نگار کہیں "خاکہ اڑانے" کی جرات بھی کرے گا۔ یہاں تک کہ بیوی کا خاکہ، جسے "رسماً" بڑی آسانی سے "اڑایا" جاسکتا تھا۔ حیدر قریشی وہاں بھی مودب اور بیوی کی محبت میں ڈوبا دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ کوئی بھی خاکہ نگار دل کی بھڑاس نکالنے کا ایسا سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ حیدر قریشی نے اپنے عزیزوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش تو کیا، ایسا خیال بھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ اگرچہ کچھ حالات و واقعات ان شخصیتوں کے بارے میں ایسے بیان کئے گئے ہیں جن کا سہارا لے کر انہیں بڑی آسانی سے ولی اللہ کے درجے پر پہنچایا جاسکتا تھا۔ مگر حیدر کی محبت کا یہ انوکھا انداز ہے کہ اس نے اپنے بزرگوں کو عام انسانی سطح پر ہی عقیدت دینا پسند کیا اور مختلف زاویوں سے ان کی شخصیت کی پروجیکشن کو اچھوتا بنانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ سچائی اور حقیقت کے قریب پہنچنے کی پرخلوص کوشش کی ہے۔

ان خاکوں میں کچھ ایسی شخصیتیں ہیں جن سے حیدر کا ذاتی میل ملاپ رہا اور کچھ ایسی بھی ہیں جن سے میل ملاپ نہیں رہا۔ مثلاً اپنے دادا پر لکھے جانے والے خاکہ کی بنیاد ایک پوتے کی فطری محبت اور خاندان کے افراد سے سنی باتوں پر ہے۔ فیض احمد فیض سے بھی حیدر کی ایک دو ملاقاتیں ہوئیں۔ تاہم حیدر نے اپنی معلومات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ ان شخصیات کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ البتہ جن شخصیات سے حیدر کا ذاتی میل ملاپ رہا ان خاکوں میں جذبے کی فراوانی ان کے تعلقات کی گہرائی کا پتا دیتی ہے اور یہی خاکے اس کتاب کے بہترین خاکے ہیں جن میں امی جی، ماموں ناصر، آپی، بیوی، غلام جیلانی اصغر اور اکبر حمیدی پر لکھے گئے خاکے شامل ہیں۔ ان خاکوں میں جہاں ہمیں ان شخصیتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے وہاں حیدر کی تحریر کی خوبصورتی اور حسِ ظرافت اپنی خوبصورت شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے اور ایسے ایسے بے ساختہ کاٹ دار اور مزاح سے بھرپور جملے پڑھنے کو ملتے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ چند جملے ملاحظہ فرمائیے۔

"ابا جی جب پینتالیس سال کے تھے بابا جی (تایا) ساٹھ سال کے تھے۔ ابا جی پچاس سال کے ہوئے، بابا جی ساٹھ سال کے رہے۔ ابا جی ساٹھ سال کے ہوئے۔ بابا جی پھر بھی ساٹھ سال کے رہے۔ ابا جی چونسٹھ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ بابا جی پھر بھی ساٹھ سال سے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھے۔ ہم نے منت سماجت کی تو بمشکل پینسٹھ سال کے ہوئے اور جب بیاسی سال کی عمر میں فوت ہوئے تب بھی پینسٹھ سال ہی کے تھے"---- (تایا جی)

"انہوں نے ان تھک محنت کی۔ خاندان کے تقریباً ہر فرد پر احسانات کیے اور تقریباً ہر فرد سے ان احسانات کی مناسب سزا پائی---- (ماموں ناصر)

ایک جگہ اپنی اور اپنی رفیقہ حیات کی معصومیت کا ذکر بڑے معصومانہ انداز میں کیا ہے۔

"میں اٹھارہ سال کا تھا۔ مبارکہ چودہ سال کی تھی جب ہماری شادی ہو گئی۔ ہماری شادی کیا تھی گڈی گڈے کا بیاہ تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہ اسے کچھ خبر۔ بے خبری کے عالم میں ولیمہ بھی ہو گیا۔ کئی دن گذر گئے اور ہم بے خبری کی جنت میں سوئے رہے۔ پھر یکا یک از خود آگہی کا کوندا لپکا---- اور پھر ہم پتوں سے اپنے تن ڈھانپنے لگے۔ آدم اور حوا کی کہانی آگے بڑھنے لگی"۔

ایک جگہ حیدر نے اپنے دوست غلام جیلانی اصغر کی شخصیت کے انسانی پہلو کو اس کے

دعائیہ الفاظ کے ذریعے نہایت خوبصورتی سے نمایاں کیا ہے۔

"مولا! مجھ میں گناہ کرنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔ مجھے یہ صلاحیت عطا کر۔ پھر گناہ کرنے کی توفیق دے اور اس کے بعد میرے گناہ کو معاف بھی کر دے۔ بے شک تو غفور الرحیم ہے۔''

اپنے بچوں کے مشترکہ خاکہ میں حیدر کا اپنی ذات پر ایک جملہ ملاحظہ فرمائیے۔

"بعض والدین کی اولاد نالائق ہوتی ہے۔ میں وہ خوش قسمت ہوں جو پانچ اچھے بچوں کا نالائق باپ ہوں"۔

اس طرح فیض احمد فیض پر لکھے گئے خاکہ میں ایک جملے کی دھار اور کاٹ کسی ادبی معرکے کی پیش گوئی کرتی نظر آتی ہے۔ ''میں فیض مرحوم کو دور سے دیکھنے والوں میں شامل ہوں لیکن میری دعا ہے کہ خدا انہیں قریب کے ان ساتھیوں کے شر سے رکھے۔''

یا پھر اپنے بھائی پر لکھے گئے ایک خاکہ میں خونی رشتوں کی بے حسی اور بے بسی دونوں کو ایک ہی جملے میں اس طرح سمیٹا ہے کہ رعایت لفظی کے حسن سے تحریر کا مزہ دو چند ہو جاتا ہے اور دورِ جدید کی ایک بڑی المناک حقیقت کا انکشاف بھی۔ مثلاً

" کہتے ہیں انسان کے دست و بازو اس کے بھائی ہوتے ہیں۔ ہم پانچ بھائی ہیں۔ پانچوں اپنی جگہ بے دست و پا"۔

ایسا لگتا ہے کہ حیدر سخت سے سخت بات بھی حوصلے اور ظرافت سے کہنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نجی خاکوں میں بھی زندگی کے ایسے تجربات بیان کر دیتا ہے کہ وہ خاکے ایک عام قاری کے لئے اتنے ہی دلچسپ بن جاتے ہیں جتنے کسی ادبی شخصیت پر لکھے گئے خاکے۔ حیدر قریشی کی اپنی شخصیت پورے زمانی تسلسل کے ساتھ سامنے آ جاتی ہے۔ ان میں حیدر کا بچپن، لڑکپن، جوانی اور جوانی سے آگے کے سفر کو کھلی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ کبھی حیدر معصوم ننگے بچے کی صورت باپ کی ٹانگوں سے لپٹا دکھائی دیتا ہے تو کبھی شعور کی پہلی منزل پر اپنی ہمجولی کو بیوی بنانے کا عزم کرتا نظر آتا ہے اور کبھی بچپن میں باپ بننے کی خواہش کرتا ملتا ہے۔ ان خاکوں میں حیدر قریشی ایک ایسی زنجیر کی صورت پھیلا ہوا ہے جس کی ہر کڑی میں اس کی اپنے خاندان سے محبت بزرگوں سے عقیدت اور اپنی اگلی نسل تک ایک میراث کی منتقلی کا فریضہ پرویا ہوا ہے۔ بچپن میں وہ بزرگوں میں اپنا آپ ڈھونڈتا ہے اور پھر اپنے بچوں میں اپنی جوانی دیکھتا ہے اور یہ سب

ہمارے مشترکہ خاندانی نظام کی ایسی خوبی ہے جو انسان کو کبھی کمزور نہیں ہونے دیتی جو اسے بچپن میں بزرگوں میں جوان رکھتی ہے اور بڑھاپے میں اپنے بچوں میں توانا رکھتی ہے اور اسے حیدر "دریا کی روانی" سے تعبیر کرتا ہے۔

دریا کی روانی ہے
اب میرے بیٹوں میں
مری گزری جوانی ہے

یہ خاکے جہاں حیدر قریشی کی محبتوں کے امین ہیں وہاں ہمارے معاشرے کے ایک عام گھرانے کے طرزِ تمدن کا بھرپور عکس بھی ہیں۔ "میری محبتیں" صرف محبتوں کی داستان ہی نہیں بلکہ اس میں خود مصنف سمیت ہر عمر کے افراد کارزارِ حیات میں سرگرمِ عمل دکھائی دیتے ہیں اور اس طرح یہ کتاب حیاتِ انسانی کے لیے جدوجہد کا ایک پیغام بن جاتی ہے۔

بابا جی کی آنکھ میں موتیا اتر آیا۔ آپریشن ہوا، کامیاب رہا مگر نظر مزید کمزور ہوگئی۔ انہوں نے ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیا۔ ٹی وی دیکھنا چھوڑ کر بھی بابا جی کے ''حُسن نظر'' میں کمی نہیں آئی۔ جیسے ہی ملکۂ ترنم نور جہاں کا کوئی نغمہ سنائی دیتا، نغمہ سننے اور ملکہ ترنم کی زیارت کے لئے ٹی وی والے کمرے میں آجاتے۔۔ نور جہاں کا نغمہ بڑی محویت سے سنتے بلکہ بڑی محویت سے دیکھتے۔ ایک موقعہ پر تو عالمِ محویت میں ان کی عینک ہی گر گئی تھی۔۔۔۔۔ پھر یوں ہوا کہ مسرت نذیر یکایک ٹی وی پر نمودار ہوگئی۔ بچوں نے اپنی عمر سے آگے بڑھ کر جوان ہونا شروع کر دیا اور بوڑھوں نے ریورس گیئر میں جوان ہونا شروع کر دیا۔ بابا جی بھی مزید جوان ہوگئے۔ مسرت نذیر کے گائیکی کے انداز نے بابا جی کی توجہ کھینچ لی تھی۔ اس کے باوجود بابا جی نے ملکۂ ترنم نور جہاں سے تعلق خاطر کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ البتہ یہ تعلق کمزور ضرور پڑ گیا۔ مثلاً ایک بقرعید پر ملکۂ ترنم کا نغمہ دکھایا گیا۔ بابا جی محبت کا بھرم رکھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے مگر ٹی وی والے کمرے تک پہنچتے پہنچتے اتنی دیر ہوگئی کہ گانا ختم ہوگیا اور بابا جی الٹے پاؤں یوں لوٹ گئے جیسے ملکہ ترنم سے کہہ رہے ہوں ''اچھا اگلی بقرعید پر سہی!''۔
(حیدر قریشی کے خاکہ **مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ** سے اقتباس)

حیدر قریشی کی ''میری محبتیں''

سید وقار مُعین

حیدر قریشی ایک زمانے میں خانپور سے "جدید ادب" نکالتے تھے۔ ۱۹۹۹ء میں انہوں نے جرمنی سے اسی نام کا رسالہ نکالا ہے۔ "میری محبتیں" کچھ خاکوں اور کچھ یادوں پر مبنی حیدر قریشی کی خوب صورت کتاب ہے۔ اس کا پاکستانی ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا تھا۔ زیرِ نظر ایڈیشن (۱۶۰ صفحات پر مشتمل) معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔ ممتاز دانشور اشفاق احمد کے بقول ۔۔۔"ولایتی زبانوں میں ایسے اسکیچ اپنے انداز میں بہت ملتے ہیں۔ لیکن اردو میں "میری محبتیں" اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ "۔۔۔ جس کی ہم پلہ ایک کتاب اکبر حمیدی کی " چھوٹی دُنیا بڑے لوگ" (۱۹۹۹ء) کو قرار دیا جاسکتا ہے، جو جزواً " قد آدم" کے نام سے ۱۹۹۳ء " میں چھپی تھی۔ کیسے لطف کی بات یہ ہے کہ حیدر قریشی اور اکبر حمیدی ہم پیالہ و ہم نوالہ بھی رہے۔ اس کی تفصیل حیدر قریشی کے خاکے "بلند قامت ادیب" (ص ۱۱۹-۱۲۳) میں ملتی ہے۔

جوگندر پال نے بالکل صحیح کہا ہے کہ:۔۔۔" حیدر قریشی کا ذہن زرخیز ہے اور منہ کھٹی میٹھی باتوں سے لبریز۔ حیدر قریشی چونکہ پورا منہ کھول کر جی جان سے بات کرتا ہے، اس لیے اس کی تحریر برجستہ اور غیر مبہم ہوتی ہے اور قاری اس میں شامل ہو کر محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے خاکے میں ممدوح اسی کی جان پہچان والوں میں سے ہے۔ حیدر قریشی کی اس خوبی نے اس کے خاکوں کو بہت جاندار اور قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔"

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے:" اول خویش" (ص ۹-۹۴) میں حیدر قریشی نے اپنے والد، والدہ، دادا، نانا، تایا، ماموں، آپی، بیوی، چھوٹے بھائی اور اپنے پانچ بچوں کے خاکے تحریر کئے ہیں۔ " بعد درویش" (ص ۹۵-۱۶۰) میں میرزا ادیب، فیض، وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، اکبر حمیدی، عذرا اصغر، سعید شباب، محمد اعجاز اکبر، طاہر احمد اور خانپوری احباب کے خاکے شامل ہیں۔

جوگندر پال نے کتاب کی ترتیب اور صاحب کتاب کے فن پر بہت بلیغ تبصرہ کیا ہے،
وہ کہتے ہیں کہ:"حیدرقریشی کی اس کتاب کے بیس خاکے دوحصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ پہلے دس کے لیےتو وہ اپنے گھر کی چاردیواری ہی میں تاکا کیا ہےاور باقی کے دس کے لیے گھر سے باہرنکل آیا ہے۔اول خویش،بعد درویش! گھر والوں کے تو کلوز اپ تیار ہو گئے ہیں اور "درویشوں" کے پروفائل اور ہر دو پر سے نظر اٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

یہ کتاب واقعی ایسی ہے کہ حیدرقریشی کا غیر رسمی طرز اظہار اور میٹھا سوندھا لب ولہجہ پڑھنے والے کوتا آخر اسیر رکھتا ہے۔مثال میں پوری کتاب نقل کر دینا ممکن نہیں!صرف ایک اقتباس دیکھئے:

لاہور میں ایک بار ایک امریکی نیگریس خاتون سے ملاقات ہوئی۔دوران گفتگو محترمہ نے میرے بچوں کی تعداد پوچھی تو میں نے کہا:

"Two daughters and three sons, total five sins---"

"But holly sins!" خاتون نے میری بات کا لطف لیتے ہوئے جملہ مکمل کر دیا۔

مجھے خوشی ہے کہ پاپولیشن پلاننگ کے اس دور میں بھی میں اپنے جداعلیٰ کے گناہ کو پانچ بار دہرانے میں کامیاب رہا ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ۔"(ص۹۴)

"میری محبتیں" تازہ ہوا کے جھونکے کا احساس دلاتی ہے۔یقین ہے کہ یہ ہمیشہ ذوق وشوق سے پڑھی جاتی رہے گی اور اردو میں خاکہ نگاری کی ایک دلکش اور منفرد جہت کے طور پر تاریخ ادب میں اس کا حوالہ ناگزیر ہوگا۔

نانا جی نہانے سے سخت پرہیز کرتے تھے۔صرف عید کے عید نہاتے۔ایک دفعہ مجھے کہنے لگے نلکا چلاؤ میں نے وضو کرنا ہے۔نانا جی نے صرف چادر اور واسکٹ نما پھتوئی پہنی ہوئی تھی۔میں نے نلکا چلانا روک کر کہا نانا جی نہا کیوں نہیں لیتے؟۔۔سر اٹھا کر میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہنے لگے:''بیٹے! جب سے تمہاری نانی مری ہے مجھے نہانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔چلو تم نلکا چلاؤ اور وضو کراؤ''

(حیدرقریشی کے خاکہ''**مظلوم متشدد**''سے اقتباس)

محمود ہاشمی کا خط بنام حیدرقریشی

''میری محبتیں''کے حوالے سے

محترمی حیدر قریشی صاحب   سلام ودعا

آپ کی بھیجی ہوئی''میری محبتیں'' مجھے مل گئی ہے۔یقیناً یہ کتاب کا کمال ہے کہ اسے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی گیا۔اور اس وقت تک کسی اور طرف توجہ دینے کا ہوش ہی نہ رہا جب تک کہ وہ ختم نہ ہوگئی۔

آپ کی''محبتیں''پڑھی تو آپ کے قلم اور مشاہدہ کا قائل ہونا پڑا۔آپ کے بزرگوں 'عزیزوں' دوستوں اور بعض ادیبوں کے خاکوں کی یہ کتاب پڑھ کر مجھے کچھ ایسا احساس ہوا جیسے یہ کتاب ایک طرح سے آپ کی اس کتاب کی تمہید یا خاکہ(Synopsis) ہے جو آپ آج سے چالیس پچاس سال بعد لکھیں گے۔اور جو آپ کی خودنوشت سوانح حیات ہوگی۔اس کتاب سے آپ کے والدین اور دوسرے قریبی عزیزوں کے خاکے مختلف دریاؤں کی طرح آپ کی طویل زندگی کے سمندر میں جا شامل ہوں گے۔خان پور کی دوستیاں اس سمندر کی موجوں سے اٹھکیلیاں کرتی نظر آئیں گی۔اور ان ادیبوں کے بارے میں جن کا اس کتاب میں ذکر ہے' آپ اپنی وہ کتاب لکھتے ہوئے سوچیں گے کہ انہیں کس طرح سمویا جائے؟

ادیبوں کے خاکوں میں میرزا ادیب نے مجھے خاص طور پر متوجہ کیا۔اس میں ایک جگہ آپ نے لکھا ہے:''۔۔۔۔۔بہت خوش ہوئے اور اس خوشی میں دیر تک فرحت کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے رہے۔تب مجھے شدت سے یہ خواہش ہونے لگی کہ کاش میں بھی میرزا ادیب کی عمر کا ہوتا!''

آخری جملہ کی شگفتگی سے بہت محظوظ ہوا۔ڈاکٹر انور سدید کی کتاب''غالب کے نئے خطوط'' کی میں نے تلاش شروع کر دی ہے۔اب اسے بھی پڑھنا پڑے گا۔''سادگی وپُرکاری'' سے شرابور جملے مجھے آپ کی تحریر کی خصوصیت معلوم ہوئے۔ایک اور جگہ آپ نے لکھا ہے:

''رِم جھم رِم جھم پڑے پھوار' تیرا میرا نت کا پیار''۔۔اس گیت کا سین دیکھا۔ہیرو اور ہیروئن دو

جھولوں پر بیٹھے جھولا جھول رہے ہیں۔ہلکی ہلکی برسات ہو رہی ہے۔آپی بعد میں کہنے لگی ہائے
اللہ! وہ بہن بھائی جھولا جھولتے ہوئے کتنے پیارے لگ رہے تھے۔بس یہاں سے سادگی اور
بھولپن کے معاملے میں ہماری راہیں ایک دوسرے سے الگ ہوگئیں''
آخری جملہ کی بے ساختگی پر بے اختیار مسکرادیا۔واہ۔واہ۔واہ!!!
آپ کی کتاب میں ہلکی سی گدگدی کر کے اس طرح کے ہنسنے ہنسانے کا سامان ہی نہیں، بلکہ اس میں
سوچ کو مہمیز کرنے کے لئے بھی خاصا مواد ہے۔مثلاً:
''ٹیپو کے نزدیک تو سارے خاندان میں دادا ابو ہی سب سے بڑے تھے۔چنانچہ اس نے پوچھا کیا
اللہ میاں دادا ابو سے بھی بڑے ہیں؟ اس پر اسے یقین دلانا پڑا کہ اللہ میاں دادا ابو سے بھی بڑے
ہیں اور ہر کسی سے بڑے ہیں۔۔کوئی زیادہ سے زیادہ کتنا بڑا ہو سکتا ہے اور اس لحاظ سے اللہ میاں
کتنا بڑا ہو سکتا ہے، یہ جاننے کے لئے ٹیپو نے اپنے دونوں بازو کھولے اور انہیں جس حد تک پیچھے
لے جا سکتا تھا، لے جا کر پوچھا: کیا اللہ میاں اتنے بڑے ہیں؟۔۔۔۔بس اسی لمحے میں مختلف
مذاہب اور فرقوں کے خدا کے بارے میں عقائد اور تصورات مجھ پر آئینہ ہو گئے۔مجھے محسوس ہوا کہ
سارے مذہبی لوگ ننھے ننھے معصوم بچوں کی طرح اپنی اپنی بانہیں پھیلائے کھڑے ہیں۔جس کی
بانہیں جہاں تک جا سکی ہیں اس نے اُسی حد تک خدا کو بڑا سمجھ رکھا ہے۔کیونکہ اس سے زیادہ بڑائی
اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ سکتی۔''
اور اب خوبصورت اندازِ بیاں کی ایک مثال:

'' کہتے ہیں انسان کے دست و بازو اس کے بھائی ہوتے ہیں۔
ہم پانچ بھائی ہیں۔پانچوں اپنی اپنی جگہ بے دست و پا''

اور ایک اور مثال جسے پڑھتے ہوئے میں نے محسوس کیا جیسے کوئی شعر پڑھ رہا ہوں:
''میں نے گزارش کی کہ صحن کی مٹی کی خوشبو سے ہی محبت پوری کر لیجئے۔مگر وہ تو ''تمنا کا دوسرا قدم
''ڈھونڈنے کے چکر میں تھے''
مختصراً یہ کہ مجھے آپ کی یادیں بہت دلچسپ لگیں۔آپ کے پاس کہنے کی باتیں ہیں اور انہیں لکھنے
کا ڈھنگ بھی اللہ میاں نے آپ کو دے رکھا ہے۔آپ کے قریبی عزیزوں اور بزرگوں کے
بارے میں بعض حقائق بڑے دلآویز ہیں۔آپ کے ابا جی اور آپی کی روحانی قوت کے کوائف

نانا جی کا اپنے بھائیوں کے تشدد کے خلاف ردعمل اور ان کی نسلیں ختم کر دینے والی پیشین گوئی جو سچ
ثابت ہوئی۔اور آپ کے دادا جی کا مر کر زندہ ہو جانا اور ماموں ناصر سے ناگن کا انتقام پڑھتے
ہوئے مجھے بار بار خیال آتا رہا کہ وہ جو کسی نے کہہ رکھا ہے کہ سچ فکشن سے زیادہ حیرت انگیز ہوتا
ہے، واقعی سچ ہے۔

دادا جی معمولی سا بیمار ہوئے اور فوت ہو گئے۔گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔سارے
عزیز و اقارب جمع ہو گئے۔دادا جی کو غسل دے دیا گیا تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔وفات کی خبر
سن کر آئے ہوئے سارے لوگ خوفزدہ ہو گئے۔کچھ چیختے چلاتے گھر سے نکل بھاگے،
ایک دو عزیز دہشت سے بے ہوش ہو گئے۔ابا جی کو ''شادیٔ مرگ'' کا مطلب پوری
طرح سمجھ میں آ گیا۔دادا جی اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فوراً کہنے لگے دوسری گلی سے اللہ رکھا
کمہار کا پتہ کراؤ۔وہاں سے پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی بیٹھے بیٹھے ہی فوت
ہو گیا ہے۔۔دادا جی نے ایک انوکھی کہانی سنائی۔انہوں نے بتایا کہ مجھے دو سفید
کپڑوں والے کہیں لئے جا رہے تھے کہ ایک مقام پر رُکنا پڑا۔وہاں موجود کچھ اور
سفید کپڑوں والوں نے ایک رجسٹر چیک کیا (اسے عالم بالا کا شناختی کارڈ آفس سمجھ
لیں) دادا جی کو لے جانے والوں کو، چیکنگ کرنے والوں نے کہا: باری تو اللہ رکھا کمہار
کی تھی تم لوگ اللہ رکھا قریشی کو لے آئے ہو۔چنانچہ غلطی معلوم ہو جانے کے بعد دادا جی
کو پھر اس دنیا میں واپس لایا گیا اور اسی وقت اللہ رکھا کمہار کی موت واقع ہو گئی۔جہاں
تک اس واقعہ کی صحت کا تعلق ہے ابا جی، بابا جی، بوا حیات خاتون۔۔سب نے یہ واقعہ
اپنی چشم دید گواہی پر بیان کیا۔چاچڑاں شریف اور کوٹ شہباز کے بعض دُور کے اور
بوڑھے عزیزوں نے بھی تصدیق کی کہ ہم بھاگ نکلنے والوں میں شامل تھے۔اس قصے کا
اصل بھید کیا تھا؟ یہ تو شاید کوہ ندا کی دوسری سمت جا کر ہی معلوم ہو سکے۔دلچسپ بات یہ
ہے کہ سفید کپڑوں والے سارے فرشتے سرائیکی زبان بول رہے تھے۔ظاہر ہے انہیں
علم تھا کہ ہمارے دادا جی صرف سرائیکی زبان ہی جانتے ہیں۔
(حیدر قریشی کے خاکہ ''**ڈاچی والیا موڑ مہار وے**'' سے اقتباس)

میری محبتیں

رؤف خیر

جناب حیدر قریشی ہرفن مولا آدمی ہیں۔ وہ افسانہ نگار بھی ہیں، تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ انشائیے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ شاعری تو ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ پنجابی صنف ماہیے کو اردو میں روشناس خلق کروانے میں حیدر قریشی پیش پیش ہیں۔ ''اردو میں ماہیا نگاری'' اور ''اردو ماہیے کی تحریک'' جیسی کتابیں ان کے ماہیوں سے قلبی لگاؤ کی غماز ہیں۔ زیر نظر کتاب "میری محبتیں" ان کے سوانحی حالات و واقعات پر مبنی ہے ''اول خویش'' کے تحت ان کے خاندانی و نجی حالات پیش کئے گئے ہیں اور ''بعد درویش'' کے زیر عنوان انہوں نے بعض مشاہیر سے اپنے تعلقات کی نوعیت کا اظہار کیا ہے۔

"میری محبتیں" اتنے دلچسپ اسلوب میں لکھی گئی ہے کہ کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں کرتا۔ حصہ اول اگرچہ کہ خالص شخصی معاملات کے گرد گھومتا ہے مگر حیدر قریشی صاحب سے تعارف میں اہم حصہ ادا کرتا ہے۔ ان کے والد نے دو شادیاں کیں۔ اولاد صرف دوسری بیوی سے ہوئی۔ پہلی بیوی نے ان پر اولاد پیدا نہ کر سکنے کا الزام رکھ کر علیحدگی اختیار کر لی تھی، مگر خود بے اولاد رہی۔۔۔ خود حیدر قریشی اور ان کی بیوی مبارکہ کے درمیان لوگوں نے دیوار اٹھانے کی کوشش کی مگر صراحتاً یہ نہیں لکھا گیا کہ اسباب کیا تھے جن کی روشنی میں مذہبی ملاؤں نے جدائی کا اعلان کیا۔ بہر حال حیدر صاحب نے کامیاب ازدواجی زندگی میں رخنہ پڑنے نہیں دیا۔

ان کے والد ہر محرم کی دس تاریخ کو اپنی والدہ کے مزار پر پھول پتے اور کھجور کے پتوں کی چھڑیاں چڑھایا کرتے تھے ایک سال قبرستان سے لوٹے تو بے حد دکھی تھے کہ انھیں ان کی والدہ کی قبر ہی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ان دنوں قبرستانوں پر ناجائز قبضے ہو رہے ہیں میں خود اس تجربے سے گزر چکا ہوں۔ میں نے جب ایک نظم "ماں/باپ کی قبر" پر کہی تھی اور جب وہ چھپی

تو مجھے کئی دردناک خطوط ملے کہ ان کے ماں باپ کی قبروں کے نشان بھی گم ہو چکے ہیں۔

حیدر قریشی صاحب نے اپنے نانا کے بارے میں لکھا کہ وہ مظلوم متشدد تھے۔ محنتی، جفاکش، سیلف میڈ کے علاوہ اہل حدیث تھے۔ کبھی وہ اہل تشیع کی جاسوسی بھی کرتے تھے اور بعد میں "الوؤں والا پیر" بن گئے۔ ان کی یہ ترقی معکوس حیرت ناک ہے ورنہ عموماً اہل حدیث تو پیری مریدی قبر پرستی وغیرہ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔ جناب حیدر قریشی نے اس کتاب میں قوت باہ کے بڑھانے کے لئے بعض آزمودہ مجرب نسخے بھی لکھے ہیں۔ جو حضرات ان نسخوں میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ کتاب سے رجوع کریں۔ انہوں نے اپنی بہن اور اپنے ایک میلے میں کھو جانے کا حال بھی دلچسپ پیرائے میں لکھا ہے جسے پڑھ کر ملک راج آنند کی مشہور کہانی THE LOST CHILD یاد آتی ہے۔ اپنے بعض رشتہ داروں کے بارے میں حیدر قریشی صاحب نے ایک تلخ جملہ لکھا کہ ''خون کے رشتے' 'خونی رشتے' بن گئے۔''

اس سوانحی کتاب کے دوسرے حصے میں جناب حیدر قریشی نے اردو ادب کی بعض عہد ساز شخصیتوں اور قریبی دوستوں کا ذکر بڑے خلوص سے کیا ہے۔ میرزا ادیب کے بارے میں لکھا کہ "ان کا وجود خود اردو ادب کے لئے نوبل پرائز کا درجہ رکھتا ہے" فیض احمد فیض نے نثری نظم سے اپنے کسی تعلق کی نفی کی ہے۔ یہی حال آزاد غزل اور فیض کا ہے۔ فیض نے صاف طور پر کہہ دیا کہ "میں آزاد غزل اور نثری نظم دونوں خوبیوں سے پاک ہوں" یہ تو ڈاکٹر مناظر عاشق ہیں جنھوں نے فیض کی ایک آزاد نظم کو آزاد غزل میں ڈھال دیا۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے اپنی ملاقات کا احوال اور انگریزی زبان و ادب سے ترغیب دلانے کا دلچسپ انداز میں اظہار کیا ہے۔ غلام جیلانی اصغر کی خود پرستی کا بیان بھی خاصہ دلچسپ ہے۔ اعجاز اکبر کی مجذوب پرستی کے وسیلے سے خوب تعارف ہوتا ہے۔ بریگیڈیئر اعجاز اکبر ایک ننگ دھڑنگ مجذوب کو گاڑی میں بٹھا لیتے ہیں۔ وہ بھی اگلی سیٹ پر اپنے بازو۔ حیدر قریشی کو تشویش یہ ہوتی رہی کہ دوران سفر گیئر تبدیل کرتے ہوئے بریگیڈیر صاحب کا ہاتھ کہیں چوک نہ جائے۔ وہ اپنے دوست مشہور شاعر و ادیب اکبر حمیدی سے اپنی قربت و مماثلت کا خاکہ بھی خوب کھینچتے ہیں۔ صاف گو ادیبہ عذرا اصغر، طاہر احمد اور سعید شباب کا ذکر بھی خوب ہے۔ سب سے آخر میں انہوں نے اپنے وطن خانپور کے احباب کا تذکرہ بھی کیا جنہوں نے ایک "انجمن انسدادِ شعراء" قائم کر

رکھی تھی۔مختصر یہ کہ "میری محبتیں" بڑی دلفریب کتاب ہے۔اس میں ماں، باپ، بھائی، بہن، تایا، ماموں، دوست احباب سب کا ذکر ہے لیکن اس میں "پردہ نشینوں" کے نام ہی نہیں آتے یہ ایک NON-AMOROUS سوانح ہے۔معیار پبلی کیشنز نئی دہلی نے روایتی اہتمام سے اسے شائع کیا ہے صرف ایک سو روپے میں مناسب ہی ہے۔

''راج دلارے!

او میری اکھیوں کے تارے

میں تو واری واری جاؤں۔۔راج دلارے.....''

یہ مشہور لوری میں نے کوثر پروین کی آواز سے پہلے اپنی امی جی کی آواز میں سنی۔امی جی نے یہ لوری اپنے سارے بیٹوں میں سے صرف میرے لئے گائی۔ماں کی محبت اور دعاؤں سے بھری اس لوری نے مجھے پروان چڑھایا۔امی جی کی وفات سے کوئی سال بھر پہلے مجھے چند ماہ گوجرانوالہ میں گزارنے پڑے۔وہیں ایک روز شام کا کھانا ایک ہوٹل میں کھا رہا تھا۔اچانک یہ لوری کیسٹ پلیئر سے نشر ہونے لگی۔لوری شروع ہوتے ہی میں جیسے بچہ بن گیا اور میں نے دیکھا کہ امی جی نے مجھے۔۔چھ ماہ کے بچے کو۔۔گود میں اٹھایا ہوا ہے اور لوری سنا رہی ہیں لوری ختم ہوگئی۔۔میں بچپن عبور کرکے اپنی اصل عمر تک پہنچا تو دیکھا کہ، میں جو ابھی ماں کی گود میں کھلکھلا رہا تھا، میری آنکھیں بھیگی ہوئیں تھیں۔عجیب سا تجربہ تھا۔کئی بار سوچا امی جی کو اس تجربے سے آگاہ کروں گا مگر پہلی محبت کے اظہار کی طرح اس تجربہ سے امی جی کو آگاہ نہ کر سکا یہاں تک کہ وہ وفات پا گئیں۔پہلی محبت سے یاد آیا کہ میری پہلی محبت بھی میری امی جی ہیں اور آخری محبت بھی امی جی ہیں۔اس اوّل اور آخر کے بیچ میں بہت سی محبتیں آئیں مگر درحقیقت وہ سب میری پہلی اور آخری محبت کا عکس تھیں۔امی جی کا چہرہ کتابی اور گول چہرے کے بین بین تھا۔چنانچہ بیچ میں آنے والی میری ساری محبتیں بھی کتابی چہرے والی تھیں۔اپنی بیوی سے میری گہری دوستی کی وجہ شاید یہی ہے کہ امی جی کی بھتیجی ہونے کے ساتھ امی جی سے کافی مشابہت بھی رکھتی ہے۔ماہرین نفسیات اس کی جو چاہیں توجیہہ کرلیں، مجھے اعترافِ جرم سے عار نہیں۔(حیدر قریشی کے خاکہ **مائے نی میں کنّوں آکھاں** سے اقتباس)

میری محبتیں (خاکے، یادیں)

بیگم وسیم راشد

حیدر قریشی کا نام ادب کے قاری کے لیے نیا نہیں ہے وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی ہیں اور عمدہ لب و لہجے کے شاعر بھی۔ان کے افسانے پڑھیئے تو لگتا ہے کہ یہ شخص مشاہدے کی باریکی بھی رکھتا ہے۔اور اپنے بیانیہ انداز سے قاری یا سامع کو سر دھننے پر مجبور بھی کر دیتا ہے۔زیرنظر کتاب میں تقریباً 20 خاکے ہیں جس میں سے 10 ان کے خون کے رشتوں سے بندھے ہیں اور 10 میں فیض احمد فیض، ڈاکٹر وزیر آغا، میرزا دیب وغیرہ کی شامت آئی ہوئی ہے۔

حیدر قریشی کے یہ 10 خون کے رشتوں کے خاکے ان کے کسی نہ کسی خوبصورت شعر سے شروع ہوتے ہیں اور جس طرح بند لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون سمجھ میں آجاتا ہے اسی طرح ان کے اشعار پڑھ کر ہی مضمون کی اہمیت وافادیت اور رشتوں کی پہچان ہوجاتی ہے۔

ان خاکوں کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر رشتے کو انہوں نے کسی نہ کسی علامت سے مشابہہ کیا ہے جیسے ابا جی کے لیے عنوان ہے "برگد کا پیڑ" حقیقتاً گھر کا سب سے بڑا اور ذمہ دار شخص جو کہ باپ ہوتا ہے۔اور وہ اپنے خانوادہ کے لیے برگد کے پیڑ جیسا ہی ہوتا ہے۔مضبوط، کشادہ اور اپنی لمبی لمبی ڈالیوں سے سائبان کئے ہوئے۔

اپنے ماموں کے لیے "رانجھے کا ماموں" عنوان بھی بہت خوب ہے۔اپنی ماں کے خاکے کی شروعات وہ اس شعر سے کرتے ہیں

ماں! ترے بعد سے سورج ہے سوا نیزے پر

بس تری ممتا کا اک سایہ بچاتا ہے مجھے

میری اپنی رائے میں تو اگر وہ اپنی ماں پر مضمون نہ کہتے اور صرف یہ شعر کہہ دیتے تو بھی ان کی ماں مجسم ہوکر سامنے آجاتی۔

ان کی آپی ان کی سب سے بڑی بہن ان کے لیے "محبت کی نمناک خوشبو" ہے ان کو اپنی آپی میں ماں جیسی ممتا اور سکون ملتا ہے جس طرح ماں اپنے بچے کو زمانے کے سرد و گرم سے بچاتی ہے ویسے ہی حیدر کی آپی ہیں۔ اس خاکے میں بہت ہی خوبصورت نثر کا استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''وہ بڑی ہوتی جا رہی ہے اتنی بڑی کہ صرف میرے چہرے پر بیٹھنے والی
مکھیوں کو ہی نہیں اڑا سکتی بلکہ وہ مجھے کوّوں، چیلوں اور گِدھوں کے
حملوں سے بھی محفوظ رکھ سکتی ہے اسی لمحے مجھے جیسے محسوس ہوتا ہے کہ
میری مری ہوئی ماں دوبارہ جی اٹھی ہے۔''

بیوی کے لیے "پسلی کی ٹیڑھ" عنوان تلمیح لیے ہوئے بہت خوب ہے۔

خون کے رشتوں کے دائروں سے جب حیدر باہر آتے ہیں تو وہ ایک اعلیٰ درجے کے نقاد، ایک ادب دوست اور بڑے پائے کے محقق بن جاتے ہیں۔ ان کے خاکے ڈاکٹر وزیر آغا ،فیض احمد فیض، میرزا ادیب، غلام جیلانی اصغر وغیرہ خاکے ہی نہیں بلکہ تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی ہیں جو ادب کی کسوٹی پر پرکھے جا سکتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادب میں ان خاکوں کی کیا ضرورت ہے اس کا جواب جوگندر پال نے بہت ہی خوبصورتی سے دیا ہے

" آج کے مشینی دور میں سچ مچ کی ملاقاتوں کی گنجائش خطرناک حد تک سکڑتی جا رہی ہے ان حالات میں یہ بھی غنیمت ہے کہ اوروں کے خاکے پڑھ پڑھ کر ہی ہماری ان سے ملنے کی چاہ پوری ہوتی رہے"

حیدر کے یہ خاکے اس لیے بھی اہم ہیں کہ ان میں ہمیں اپنی زندگی کا عکس نظر آ جاتا ہے۔ یہ احساس رہتا ہے کہ یہ سارے اسی کے ہی نہیں ہمارے بھی قرابت دار اور جان پہچان والے ہیں۔ حیدر قریشی نے اپنے والد، والدہ اور بڑی بہن سبھی میں کسی نہ کسی مافوق الفطرات اثر کا ذکر کیا ہے جو پڑھنے میں عجیب سا لگتا ہے۔ کتاب کی طباعت اچھی ہے۔ سرورق گلاب کا پھول لئے ہوئے محبتوں کا پیغام دے رہا ہے۔ زبان سادہ، صاف اور رواں ہے میرے خیال میں اردو میں یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے اور مجھے یقین ہے کہ حیدر قریشی کی محبتوں کی یہ داستان دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

کھٹی میٹھی یادیں ایک مطالعہ

کرشن مہیشوری

جب کبھی ہم اپنی بیتی یادوں کو اپنے ذہن میں دہراتے ہیں تو ایک عجیب احساس ذہن کو معطر کرتا ہے۔ یہی یادیں جب صفحہ قرطاس پر منتقل ہو جائیں تو کبھی اسے سوانح نگاری، تو کبھی خاکہ نگاری کا نام دیا جاتا ہے۔ حیدر قریشی نے اپنی ایسی یادوں کو ''کھٹی میٹھی یادیں'' کا نام دیا ہے اور اسے یاد نگاری کے زمرے میں رکھا ہے۔ حیدر کی کھٹی میٹھی یادیں پڑھ کر میؔر صاحب کا آج سے تقریباً دو صدی قبل کہا گیا یہ شعر یاد آیا۔

سنو سرگزشت اب ہماری زبانی   سنی گر چہ جاتی نہیں یہ کہانی

حیدر کی یہ یادیں پڑھ کر حیدر کے حافظہ اور اندازِ بیان پر حیرت ہوتی ہے اور داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ اکثر روزمرہ کی باتیں ہمیں یاد نہیں رہتیں۔ اکثر یادیں وقت کے ساتھ مدھم نقوش بن کر رہ جاتی ہیں۔ دھندلی دھندلی۔۔۔ مدھم مدھم۔۔۔ اور اگر واضح ہوں بھی تو انہیں حیدر کے انداز میں تحریر کرنا؟۔۔ یہ بھی ایک کمال ہے۔ حیدر کی کھٹی میٹھی یادیں پڑھ کر ایسا تاثر قاری کے ذہن میں ابھرتا ہے کہ وہ اپنے ماضی سے ہمیشہ جڑے رہنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی یادوں کے ساتھ خوش رہنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف انہیں انسانی ترقی پر خوشی ہوتی ہے تو دوسری طرف انسانی دلوں میں وقتاً فوقتاً گھٹتی محبت کا گلہ بھی ہے۔ میؔر کے پانچویں دیوان کا ایک مصرعہ ہے۔

دیکھو جدھر اک باغ لگا ہے اپنے رنگیں خیالوں کا

ان کے اس باغ ''کھٹی میٹھی یادیں'' کو کل ۱۱ عنوانات کے تحت اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ ہر باب کی عنوان ہی سے وضاحت ہو جاتی ہے۔ ۱۔ بزمِ جاں ۲۔ ددھیال کے رشتہ دار، ۳۔ کزنز، ۴۔ پڑھنے سے پڑھانے تک، ۵۔ بندۂ مزدور کی اوقات، ۶۔ گراموفون سے سی ڈی تک، ۷۔ اخلاقی قدریں اور ویا گرا، ۸۔ دعائیں اور قسمت، ۹۔ شوخیاں بچپنا، ۱۰۔ علتیں، علالتیں،

۱۱۔ اِن دیکھے، پر جانے دوست۔

میرؔ کی ''ذکرِ میرؔ''، ہو یا غالبؔ کے خطوط، اختر الایمان کی ''اس آباد خرابے میں'' میں ہو یا آدا جعفری کی ''جو رہی سو بے خبری رہی''۔۔ یا جوشؔ کی ''یادوں کی بارات''۔۔۔ سب نے اپنے اپنے انداز میں اپنی روداد زندگی کو تحریر کیا ہے۔ ندا فاضلی نے تو اپنی دو سوانح ''دیواروں کے باہر'' اور ''دیواروں کے بیچ'' کے ساتھ لفظ ''ناول'' کا اضافہ کر کے اپنے آپ کو کافی حد تک محفوظ کر لیا ہے۔ قاری حقیقت اور فسانے کے بیچ کی باریک لکیر کے بیچ الجھا رہتا ہے۔ جہاں تک حیدر کی ''کھٹی میٹھی یادیں'' کا تعلق ہے اس میں حیدر نے اپنی روداد زندگی کو جوں کا توں سیدھے سادھے انداز میں بیان کرنے کی عمدہ کاوش کی ہے۔ ''کھٹی میٹھی یادیں'' دراصل ان کی ''میری محبتیں'' کا ہی دوسرا حصہ ہے۔ جس میں حیدر نے اپنے حافظہ کی مدد سے احباب و رشتہ داروں کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے آغاز ہی میں لکھ دیا ہے:

''میری محبتیں'' کی اشاعت سے پہلے ہی مجھے احساس تھا کہ اس میں شامل بعض شخصیات ایسی تھیں کہ ان پر مزید لکھا جانا چاہئے تھا۔ بعض لوگ جن کا بیچ بیچ میں کہیں برسبیلِ تذکرہ نام آ گیا ہے، ان کی زندگی کے بعض خوبصورت انسانی رُخ بھی سامنے آنے چاہئیں تھے۔ بہت سارے عزیز اور احباب ایسے ہیں جن کا پورا خاکہ نہیں لکھا جا سکتا لیکن ان کے ذکر کے بغیر میری زندگی کی رُوداد بھی ادھوری رہے گی اور میری محبتیں بھی۔۔۔۔ مزید خاکہ نگاری تو جب بھی ہوئی اپنے وقت پر ہوگی۔ فی الوقت میں اپنی زندگی۔۔۔۔ گزاری ہوئی زندگی کی طرف تو پلٹ کر دیکھ سکتا ہوں۔ اپنے بہت سارے پیاروں، رشتہ داروں، دوستوں۔۔۔ اور ''کرم فرماؤں'' سے تجدیدِ ملاقات تو کر سکتا ہوں۔ سو بکھری ہوئی یادوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

حیدر نے دیگر احباب کے ساتھ ان یادوں میں اپنے والدین، اپنی شریک حیات مبارکہ اور اپنے حقیقی دوست (خدا تعالیٰ) کا ذکر بہت عمدگی سے کیا ہے۔ حیدر کے بیان کی سادگی میں ایک عجیب انداز ملتا ہے۔ ہنستی ہوئی یادوں کے ساتھ کئی جگہ وہ قاری کو رُلانے کی حد تک افسردہ کر دیتے ہیں۔ ان کے کزن شکور نے ان سے وعدہ کیا کہ عید ان کے ہاں (فرینکفرٹ میں) آ کر کرے گا اور اسی عید سے ایک دن پہلے اس کی لاش فرینکفرٹ پہنچ جاتی ہے۔ اس روداد کو لکھنے کے بعد حیدر

کے یہ الفاظ دیکھیں: ''زندگی بھر گپیں ہانکنے والا میرا کزن مرنے کے بعد وعدے کا اتنا پکا نکلے گا، یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا''

حیدر اپنی اس روداد میں اپنی کئی مشکلات اور مسائل سے چھٹکارا پانے کا سبب کسی ماورائی ہستی کو قرار دیتے ہے۔ کہیں کہیں وہ اس کا کھلے دل سے اقرار بھی کرتے ہیں کہ خدا کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ خواب میں دوائی کھانے اور اس کے نتیجہ میں فوراً صحت یاب ہونے والے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''ہو سکتا ہے خواہش کی شدت خواب میں کسی نفسیاتی طریقے سے علاج بھی کر دیتی ہو۔ ایسا ہے تو تب بھی یہ ایک نفسیاتی بھید ہے۔ ویسے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کیا بھید ہے''

وہ سوسائٹی کو آئیڈیل نہ سہی، اس سے قریب ضرور دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہیں وہ انسانی معاشرے کے سدھار کی خواہش میں اپنا آپ بھول جاتے ہیں۔ تو کبھی ان کے اندر کا ننھا حیدر جرمنی میں رہ کر بھی اپنے بچپن کا کھیل ''گلی ڈنڈا'' کھیلنا چاہتا ہے۔ ان کا قرآنی اور مسنون دعاؤں پر بہت اعتقاد ہے۔ انہوں نے اپنی یادوں میں دعاؤں اور وظائف کے بعض طریقے بھی تحریر کئے ہیں۔ ایک زمانہ ایسا بھی حیدر کی زندگی میں آیا تھا جب وہ اپنی زندگی کی مشکلات سے لڑ کر تھک چکے تھے، جو دعا مانگتے اس کا الٹا اثر ہوتا۔ بقول ان کے ؎

جو دعا کرتے تھے الٹا ہی اثر ہوتا تھا   تیری چاہت کی دعا رب سے بچالی ہم نے

پھر۔۔۔؟۔۔۔۔ وہ لکھتے ہیں۔ ''اسی دوران مجھے پھٹی پرانی اور خستہ حالت میں قرآنی اور مسنون دعاؤں کی ایک چھوٹی سی کتاب ملی۔۔۔۔ یہ کتاب کیا ملی، نئی زندگی مل گئی''

ایک اور جگہ لکھتے ہیں ''دعاؤں کے سلسلے میں میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر کوئی دعا بہت زور لگانے کے باوجود بھی قبول نہیں ہوتی تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اس دعا کا قبول نہ ہونا ہی میرے حق میں بہتر ہے''۔۔۔۔۔۔۔۔ حیدر کی یادوں میں ان کی زندگی کے سارے رنگ موجود ہیں۔ آیئے ان سارے رنگوں میں سے چند رنگوں کو براہ راست ان کی تحریر کے ذریعے دیکھیں۔

''میں نے پہلی بار جھجک کے ساتھ بجلی کی سیڑھی پر قدم رکھا، ہلکا سا چکر آیا۔ میں نے لحظہ بھر کے لئے آنکھیں موند لیں، جیسے ہی آنکھیں کھولیں، اُوپر کی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ کسی اناڑی کی طرح سیڑھی کی حد سے باہر آیا تو امی جی کی سنائی ہوئی کئی کہانیاں یاد آنے لگیں۔ کہیں کوئی نیک دل دیو ہے، کہیں

سبز پری اور کہیں کوئی درویش ہے جو مہم جُو شہزادے کو کسی لمبی مسافت کی کوفت سے بچانے کے لئے، اس کی مدد کرتے ہوئے اُسے آنکھیں مُوندنے کے لئے کہتے ہیں، پھر جب شہزادہ آنکھیں کھولتا ہے تو منزلِ مقصود پر پہنچا ہوتا ہے۔ میں اُوپری منزل پر پہنچا تو میرے ساتھ نہ کوئی نیک دل دیو تھا، نہ کوئی درویش اور نہ ہی کوئی سبز پری۔۔۔۔صرف مبارکہ میرے ساتھ تھی۔ اس نے اگر سبز سوٹ پہنا بھی ہوا تھا تو وہ اس کے برقعہ کے کوٹ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں نے مبارکہ کو من ہی من میں سبز پری سمجھا اور خود کو شہزادہ گلفام سمجھ کر خوش ہولیا۔

یہاں کے گھروں میں کھڑکیوں کا شیشہ ایسا ہے کہ آپ اندر بیٹھے ہوئے باہر کی ہر چیز کو دیکھ سکتے ہیں جبکہ باہر کھڑا ہوا کوئی آدمی آپ کو بالکل نہیں دیکھ سکتا۔ جب مجھے پہلے پہل اس کا علم ہوا دھیان فوراً سلیمانی ٹوپی والی کہانی کی طرف چلا گیا۔ مجھے ایسے لگنے لگا جیسے میں امی جی کی سُنائی ہوئی ڈھیر ساری کہانیوں کا جیتا جاگتا کردار بن گیا ہوں۔ ساری کہانیاں جیسے اپنے آپ کو میرے وجود میں دُہرانے لگی ہیں۔ کاش! امی جی زندہ ہوتیں اور میں انہیں اُن کی سنائی ہوئی کہانیوں کا حقیقی رُوپ دکھا سکتا۔ اب تو وہ خود ہی کہانی بن گئی ہیں۔'' (**بزمِ جاں**)

''کوٹ شہباز میں تو صرف وٹے سٹے کا رواج تھا جبکہ باقی سرائیکی علاقے میں وٹے سٹے کا متبادل ٹکا کہلاتا ہے۔ یعنی اگر رشتہ کے بدلے میں رشتہ نہیں ہے تو ایک معقول رقم ادا کر کے لڑکی کا رشتہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وٹہ سٹہ میں ایسے بھی ہوا کہ باپ نے اپنی بیٹی بیاہی اور اس کے بدلہ میں دولہا والوں کی بہن سے اپنی دوسری شادی رچا لی۔ ایسا مفاہمانہ رویّہ بھی دیکھنے میں آیا کہ لڑکی بیاہتے وقت فریق ثانی کے پاس وٹہ نہیں تھا تو اس نے اپنے ہاں ہونے والی پہلی بیٹی وٹہ میں لکھ دی۔ اسے ''پیٹ لکھوالینا'' کہا جاتا ہے۔ ٹکے والی شادی میں صرف رقم بھی چلتی ہے اور رقم کے ساتھ دوسری چیزیں بھی۔۔۔۔۔۔۔۔مثلاً ایک بکری، دو مُرغیاں، ایک سیکنڈ ہینڈ سائیکل اور ۵۰۰ روپے دے کر لڑکی کا رشتہ حاصل کیا گیا۔ تاہم قریشیوں میں صرف وٹہ سٹہ ہی کا رواج تھا، وہ بھی صرف قریشیوں کے ساتھ۔'' (**ددھیال کے رشتہ دار**)

''مبشّر کی ''پھوں پھاں'' اور ''ٹَے کا'' بہت تھا اسی لئے اس کی دوستی سے مجھے فائدہ ہوجاتا تھا۔ ایک بار پتہ نہیں کس بات پر ہمارا جھگڑا ہوگیا۔ مبشّر نے پتری کا ایک ننھا منّا سا چاقو مجھ پر تان لیا۔ میں نے وہیں سے دوڑ لگائی اور نانا جی کو جا کر بتایا کہ مبشّر مجھے چاقو مارنے لگا تھا۔ نانا جی نے

فوری کاروائی کے لئے ماموں سمیع اللہ کو بھیجا۔ ماموں سمیع نے آ کر مبشّر کو ایک چپت رسید کی تو وہ کہنے لگا کہ میں تو صرف ڈرا رہا تھا۔ اس چاقو کی ''خوفناکی'' کا اندازہ اس سے لگالیں کہ ماموں سمیع نے اسی وقت مبشّر سے لے کر، انگلیوں سے مروڑ تروڑ کر اسے دور پھینک دیا تھا۔'' (**کزنز**)

''اختیاری مضامین میں مجھے عربی زیادہ مناسب لگی، چنانچہ میں نے یہ مضمون چھٹی جماعت سے ہی لے لیا۔ لیکن ہمارے عربی ٹیچر علاّمہ عبدالخالق اشرف صاحب اتنے متشدد نکلے کہ میں عربی سے ہی ڈرنے لگا۔ چھٹی جماعت سے آٹھویں جماعت تک مجھے ضَرَبَ ضَرَبَ کی گردان یاد نہیں ہو سکی اور میں تین سال تک علاّمہ صاحب کی ضربِ شدید کا نشانہ بنا رہا۔ ہائی اسکول میں جا کر جیسے ہی پتہ چلا کہ یہاں عربی کا مضمون چھوڑ سکتا ہوں، میں نے فوراً خدا کا شکر ادا کیا۔ بعد میں دیکھا کہ یہاں کے عربی ٹیچر مولوی خدا بخش صاحب بہت ہی نرم دل اور شفیق انسان تھے۔''

(**پڑھنے سے پڑھانے تک**)

''جب مبارکہ اور بچے جرمنی آنے والے تھے چھوٹے بیٹے ٹیپو کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی۔ شعیب نے اس سے پوچھا کہ آپ جرمنی کیسے جائیں گے؟ تو ٹیپو نے بڑی معصومیت کے ساتھ جواب دیا۔ ''یا ہوائی جہاز سے جائیں گے یا تانگے سے جائیں گے'' ٹیپو کی یہ بات اس لئے یہاں یاد آ گئی کہ اس سے ملتا جلتا اپنے مَن کا بھولپن یاد آ گیا ہے۔ دسویں کا رزلٹ آنے سے پہلے میں من ہی من میں ارادہ بنایا کرتا تھا کہ نوکری کے ساتھ پڑھائی کروں گا۔ یا تو گریجوایشن کے بعد مقابلے کے امتحان میں بیٹھوں گا اور ایک دن ڈپٹی کمشنر بنوں گا، یا پھر وٹرنری ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ ڈپٹی کمشنر بننے کی آرزو تو پھر بھی ممکنات میں سے تھی لیکن وٹرنری ڈاکٹر بننا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ دسویں میں میرے مضامین آرٹس گروپ کے تھے۔ اس میں جنرل سائنس کا مضمون بھی میں نے مر مر کر پاس کیا تھا۔ وٹرنری ڈاکٹر بننے کے لئے تو ایف ایس سی کرنا پہلی سیڑھی تھی جو میرے لئے بذریعہ تانگہ جرمنی جانے سے زیادہ مشکل تھی۔ بہر حال شوگر مل کی نوکری کے پہلے دن جب مجھے لیبارٹری کی کھڑکیوں کے شیشوں اور فرش کی صفائی کرنا پڑی تو میرے اندر کے ڈپٹی کمشنر اور وٹرنری ڈاکٹر دونوں کی موت واقع ہوگئی۔ صفائی کرتے ہوئے، اپنے دوسرے ساتھیوں سے منہ چھُپا کر میں ان دونوں کی موت پر باقاعدہ آنسوؤں سے روتا رہا۔'' (**بندۂ مزدور کی اوقات**)

''ایک بار بابا جی گراموفون مشین کے پاس بیٹھے تھے، انہوں نے اپنے سامنے بہت سارے

گراموفون ریکارڈز پھیلا رکھے تھے۔شاید اپنی پسند کے بعض ریکارڈز الگ کر رہے تھے۔اسی دوران پتہ نہیں کسی کام سے وہ تھوڑی دیر کے لئے اٹھے تو میں اُنہیں کے انداز میں انہیں کی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا اور کچھ سمجھے بوجھے بغیر ان ریکارڈز کو باباجی کی طرح غور سے دیکھنے لگا۔پھر گھٹنوں کے بل ایک طرف بڑھا تو چار پانچ ریکارڈز میرے گھٹنوں کے نیچے آ کر ٹوٹ گئے۔اسی دوران باباجی آ گئے۔اس نقصان سے تھوڑا سے پریشان تو دِکھے لیکن مجھے ڈانٹا نہیں---ایک عرصہ بعد باباجی میری اسی غلطی کو یوں مزے سے بتایا کرتے جیسے میں نے کوئی کارنامہ انجام دیا تھا۔زندگی بھر تو مجھ سے ڈھنگ کا کوئی کام نہیں ہو سکا تاہم اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے بچپن میں ہی چار پانچ ریکارڈز توڑ دیئے تھے۔یہ غالباً 58-1957 کا زمانہ تھا۔"

(گراموفون سے سی ڈی تک)

"اپنی جاب پر جاتے ہوئے مجھے بذریعہ ٹرین آدھے گھنٹے کا سفر کرنا ہوتا ہے اوراس عرصہ میں ان ساری دعاؤں کا ورد مکمل کر لیتا ہوں۔ورد کرتے ہوئے ہونٹ تو بہرحال ہلتے ہیں۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ میرے سامنے کوئی گوری بیٹھی ہے اور میرے ہِلتے ہوئے ہونٹوں کو حیرت سے دیکھ رہی ہے۔وِرد کرتے ہوئے میں عموماً غضِّ بصر سے کام لیتا ہوں۔اس کے باوجود کبھی کبھار نظر اُٹھ تو جاتی ہے۔ایک بار عام گوریوں سے کہیں زیادہ خوبصورت گوری میرے سامنے آ بیٹھی اور میرے وِرد پر اس کی حیرت بھی غیر معمولی سی لگی۔مجھے لگا یہ ابھی مجھ سے پوچھ بیٹھے گی کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں؟---اُس نے تو نہیں پوچھا لیکن اپنی اُس وقت کی حالت پر مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا اور وظیفہ کے دوران ہی ایک شریری مسکراہٹ میرے چہرے پر پھیل گئی۔لطیفہ یوں ہے:

ایک صاحب اپنے دوست کے گھر گئے تو دیکھا کہ وہاں ایک پنجرے میں دو طوطے بند ہیں۔ایک طوطا حالتِ سجدہ میں ہے اور ایک طوطا مسلسل تسبیح کر رہا ہے۔وہ صاحب دونوں طوطوں کی شرافت اور نیکی سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے دوست سے کہنے لگے میرے پاس ایک طوطی ہے جو بہت شرارتی ہے۔اگر آپ اجازت دیں تو وہ طوطی دو چار ہفتوں کے لئے آپ کے طوطوں کے پاس چھوڑ جاؤں تاکہ ان کی رفاقت میں طوطی کی بھی تربیت ہو جائے۔دوست راضی ہو گیا تو وہ صاحب اپنی طوطی لے آئے۔جیسے ہی طوطی کو طوطوں والے پنجرے میں ڈالا گیا،تسبیح والے طوطے نے فوراً اپنی تسبیح پرے پھینکی اور سجدہ ریز طوطے کو ہلا کر کہنے لگا: یار! اُٹھ جاؤ،آخر ہماری دعا قبول ہو ہی

گئی۔"**(دعائیں اور قسمت)**

"انہیں دنوں ایک نیم دیوانے قسم کے میاں' کالے خاں بھی آ وارد ہوئے۔یہ ہمارے ننھال کے جاننے والے تھے۔امی جی کو دعا یا آشیرواد دینے کے لئے آئے۔ایک بگل سا ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔اپنا نام اس بگل پر "کالے خاں---امام مہدی" لکھوا رکھا تھا۔لیکن بیعت کسی کی نہیں لی۔ان کے بارے میں پتہ چلا کہ پِیروں کے مزاروں پر چڑھائی جانے والی چادریں اتار کر لے جاتے۔کوئی روکتا تو برہم ہو کر کہتے زندوں کو کپڑا ملتا نہیں اور تم مزاروں پر چڑھاتے پھرتے ہو۔مزاروں والے انہیں بھی کوئی پہنچا ہوا سمجھ کر چُپ کر جاتے۔ہمارے ہاں ایک دن رہے۔صبح اُٹھتے ہی کہنے لگے مجھے خدا نے کہا ہے: "قالو بلیٰ قد جاء نا"---پھر اس کا پنجابی میں ترجمہ بھی کر دیا: کالے خاں توں کدوں جانا ایں؟ (کالے خاں! تم نے کب یہاں سے جانا ہے؟) اور پھر سب کو دعا دیتے ہوئے فقیرانہ شان کے ساتھ رخصت ہو گئے۔جاتے ہوئے بگل بھی بجاتے جاتے تھے۔**(بچپنا،شوخیاں)**

"بواسیر کی تکلیف سے یاد آیا اس کا ایک سادہ سا دیسی علاج یہ ہے کہ مولیوں کے بیج لے کر انہیں تھوڑا سا کُوٹ کر دو چمچ صبح، دوپہر، شام پانی کے ساتھ پھانک لینے سے دو ہفتوں میں تکلیف ختم ہو جاتی ہے۔آپریشن تو نہیں ہوتا لیکن جلن اور تکلیف بھی نہیں ہوتی۔جب میں شوگر مل میں ملازم تھا اس زمانے میں ایک بار میں نے لیبارٹری میں ایک خوراک پھانکی تو ایک دوست نے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ساری تفصیل جاننے کے بعد پھر کہنے لگا اگر یہ بیج اس بیماری کے لئے مفید ہیں تو انہیں کُوٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ثابت بیج بھی تو کھائے جا سکتے ہیں۔تب میں نے اسے کہا تھا کہ بھائی! یہ مُولی کا بیج ہے اس لئے احتیاط کرنا چاہئے۔خدانخواستہ پیٹ میں جا کر بیج سے مُولی اُگ آئی تو بواسیر کا مریض بے چارہ تو بیماری کے بجائے اپنے علاج کے ہاتھوں مارا جائے گا۔"

(علتیں،علالتیں)

حیدر قریشی کی "کھٹی میٹھی یادیں" حکایتِ دراز اور لذیذ تر ہیں۔ایسی دلکش اور فرحت بخش یادیں جو قاری کو مکمل طور پر جکڑنے کے بعد ایک بار پھر مطالعہ کے لئے اکساتی ہیں۔بقول میرؔ ؎

سرگزشتیں نہ مری سن کہ اچٹتی ہے نیند　　　خاصیت یہ ہے مری جان ان افسانوں کی

حیدر قریشی کی خاکہ نگاری اور یادنگاری پر بعض ادباء کے بے ساختہ تاثرات

اشفاق احمد(لاہور) ولایتی زبانوں میں ایسے سکیچ اپنے اپنے انداز میں بہت ملتے ہیں لیکن اردو میں ''میری محبتیں'' اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین: (امریکہ) ''میری محبتیں'' کے ابتدائی پانچ چھ مضامین میں نے پوری طرح پڑھے'بقیہ کو سرسری دیکھا۔دوسرے حصہ میں پہلے چار خاکے نیز آخری مضمون پرانے ادبی دوست پڑھا۔خوب لکھتے ہیں،آپ نے اپنے بزرگوں کے محیر العقول واقعات لکھے ہیں'ان سے میں متاثر ہوا۔تمام مضامین بہت دلچسپ اور دلکش ہیں،

جوگندر پال:(دہلی) ''میری محبتیں'' کا مسودہ اگرچہ تم مجھ سے پہلے بھی پڑھوا چکے تھے،پھر بھی یہ کتاب اتنی دلچسپ اور Engaging لگی کہ اسے دوسری بار بھی فر فر پڑھتا چلا گیا۔

ڈاکٹر رضیہ حامد:(دہلی) ''میری محبتیں'' کئی مرتبہ پڑھ چکی ہوں اور اگر یہی حال رہا تو میں اس کی حافظ ضرور ہو جاؤں گی۔آپ کی تحریر میں بلا کی سادگی اور قاری کو باندھ رکھنے کی طاقت ہے۔درد کی پوشیدہ لہریں دل و دماغ میں اندر تک اتر جاتی ہیں اور قاری اپنے کو قاری نہ سمجھ کر حیدر قریشی بن جاتا ہے۔یہ آپ کی تحریر کا کمال ہے۔

محمد احمد حامی:(انگلینڈ) آپ کے خاکوں نے لطف دیا۔آپ نے جس طرح اپنے قارئین کو اپنے گھر کے اندر لے جا کر اہلِ خانہ سے ملایا ہے اور جس سہولت سے بعض پُل صراطی مقامات سے گزار دیا ہے'اسے ''مہارت'' ہی کہا جا سکتا ہے۔زندہ شخصیتوں کے خاکوں میں تشنگی رہ جانا لازم ہے۔اس لیے کہ بہت سی باتیں ان کے خاک ہو جانے سے منظرِ عام پر نہیں

لائی جا سکتیں اور فوت شدہ کے خاکے میں اُذکرو امواتکم بالخیر کا حجاب در آتا ہے اور مُردے کی خاک اُڑانے سے خواہ مخواہ شرم آتی ہے۔

بہر حال خوب لکھا ہے، اور بھی لکھیں۔یہ مضامین پڑھتے ہوئے مجھے ایک دو جگہ رُکنا پڑا۔پھر یادداشت پر زور دیا تو خیال ہوا کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہی درست ہوگا البتہ جہاں آپ نے ہاشم کو امیہ کا جڑواں (پشت جُڑا) بھائی لکھا ہے وہاں ذہول ہوا ہے۔اسلیے کہ ہاشم امیہ کا چچا تھا۔ہاشم اور عبدالشّمس آپس میں بھائی تھے اور دونوں عبد مناف کے بیٹے تھے۔شجرہ یوں ہے: محمد ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔۔۔۔۔ابوسفیان بن حرب بن امیہ بن عبدالشّمس بن عبد مناف

غلام الثقلین نقوی:(لاہور) حیدر قریشی اب شخصیت نگاری میں پختہ کار ہو گئے ہیں۔'محبت کی نمناک خوشبو'ایک پُر تاثیر خاکہ ہے۔

(مکتوب مطبوعہ ''اوراق'' لاہور،نومبر،دسمبر۱۹۹۲ء)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی:(انڈیا) ابھی ''میری محبتیں'' پڑھ رہا ہوں۔بعض خاکے پڑھ کر آپ کی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔مجھے لگا کہ ذہنی سفر میں میرا آپ کا ساتھ ہو گیا ہے۔لکھنے بیٹھوں گا تب میں اپنے جذبات کو کس طرح سمیٹ پاؤں گا' کہنا مشکل ہے۔ابھی صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کی یہ کتاب شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔بہت بہت مبارک باد!

ڈاکٹر اسلم حنیف: (انڈیا): نرم اسلوب سے جھانکتی ہوئی تصویریں جاذب نظر ہی نہیں قابلِ تقلید بھی بن گئی ہیں۔خاکہ نگاری نہ ہی کارگہ شیشہ گری ہے اور نہ ہی فن بت تراشی یا مصوری اور فوٹو گرافی' بلکہ یہ تو ایک طرح کی کلوننگ ہے۔آپ نے جن ہستیوں کی کلوننگ کی ہے ان میں ہر ہستی اپنے مکمل وجود کے ساتھ اُبھر آئی ہے۔یہی آپ کے اسلوب اور فن کی بڑی کامیابی ہے۔

سعید انجم:(ناروے): خاکوں پر مشتمل آپ کی کتاب ''میری محبتیں'' مجھے ملی۔اس عنائت کے لئے آپ کا بہت بہت شکریہ!

''روشنی کی بشارت'' کے افسانے پڑھنے کے بعد آپ کے ساتھ جو تعارف ہوا تھا'اس کتاب کے

مطالعہ کے بعد اس نے ایک اور منزل طے کر لی ہے۔آپ سے شناسائی کی سمت ''میری محبتیں'' ایک دلگداز پھاٹک کی مانند ہے۔

رؤف خیر: (انڈیا): پچھلے ہفتے ''میری محبتیں'' مجھے مل گئی۔میں نے ساری کتاب پڑھ ڈالی۔طرزِ تحریر دلچسپ ہونے کی وجہ سے کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں کر رہا تھا۔''اول خویش'' والا حصہ سوانحی ہے۔آپ کے نجی حالات سے واقفیت کا موقع ملا۔صفحہ نمبر ۱۴ پر آپ نے اپنی سوتیلی والدہ کی لاوارثیت کا جو ذکر کیا ہے وہ خود اک کہانی کا موضوع ہوسکتا ہے۔اس سلسلے میں میرے ذہن میں ایک کہانی ترتیب پا گئی ہے۔میں انشاء اللہ لکھوں گا۔بہر حال میں نے پورے ۱۶۰ صفحات نہایت دلچسپی سے پڑھے ہیں۔عنقریب تبصرہ کر کے چھپوا دوں گا۔

مقصود الٰہی شیخ:(انگلینڈ): آپ کی کتاب ''میری محبتیں'' دیکھنی شروع کی ہے۔لگتا ہے آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔کہہ سکتے ہیں اور کہنے کا یارا بھی ہے۔میرا دل چاہا کہ آپ کو بتاؤں کہ جو پڑھا ہے' پسند آیا۔آپ نے بڑی مشکل باتیں بڑی آسانی سے لکھ دی ہیں' آپ کو اس کی داد ملے گی۔یوں تو ابا جی' امی جی اور دادا جی پر مضامین ''ودھیا'' ہیں مگر ان میں احترام کا عنصر جھلکتا ہے۔''ڈاچی والیا موڑ مہار وے'' میں آپ کا شریر ریمارک ہونٹوں پر تبسم لاتا ہے' پَر جس بے تکلفی سے آپ نے اپنے نانا جی پر لکھا ہے وہ سب سے زیادہ نمبر لے گیا۔بڑی بے ساختگی ہے' روانی ہے اور گندھی ہوئی خوشگواریت لاجواب ہے۔۔۔۔۔۔مجھے جوگندر پال جی سے مکمل اتفاق ہے کہ یہ کتاب بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔۔۔۔میں کہنا چاہ رہا ہوں شاعری آپ کا شوق ہے۔ٹھیک ہے ورنہ آپ کی نثر میں شاعروں سے اچھی اور زیادہ شعریت ہے۔

ترنم ریاض:(انڈیا): ''میری محبتیں'' تو کمال کی کتاب ہے۔سیدھی سنجیدہ باتیں لکھتے ہوئے آپ جو ہلکا سا مزاحیہ رنگ دے کر جملہ مکمل کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قہوہ پیتے پیتے الائچی کا کوئی دانہ دانت تلے آ کر ذہن ودہن کو معطر کر جائے۔

ناصر نظامی:(ہالینڈ) : آپ کی کتاب ''میری محبتیں'' قابلِ تعریف ہے۔آپ نہایت عمدگی سے کرداروں کے حالات وواقعات کی اور جذبات واحساسات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔آپ کی تحریر میں کمال کا رچاؤ' چٹکیاں' دردمندی' بلند حوصلگی اور گہری محبت کا اظہار پایا جاتا

ہے۔آپ کے اندر محبت کا اتھاہ گہرا سمندر موجزن ہے جو ابھی تک اپنے جیسے کسی اور عمیق سمندر کی تلاش میں سرگرداں ہے۔آپ کی تحریر میں میں نے محبت کی طلسماتی اور ماورائی فضاؤں جیسی کیفیت محسوس کی ہے۔کچھ ایسا جو روحانی دیوتاؤں کا ورثہ ہوتا ہے۔جو روحانیت کے عارفین کا نصیب ہوتا ہے۔مجھے آپ کے ہاں ایک روحانی ولائت کی جھلک دکھائی دی ہے۔

سعید شباب:(خانپور) حیدر قریشی اپنے عزیز واقارب کے بارے میں مسلسل اچھے مضامین پیش کر رہے ہیں۔یہ مضامین خاکہ نگاری میں ایک نئے مزاج اور ذائقے کو متعارف کرا رہے ہیں۔یوں نے انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بعض معاملات میں اقربا پروری بھی اچھی ہوتی ہے۔(مکتوب مطبوعہ اوراق لاہور۔نومبر، دسمبر ۱۹۹۲ء)

نیاز احمد صوفی (پاکستان): آپ کے خاکے ''میری محبتیں'' ماشاء اللہ زبردست ہیں۔یہ نہ صرف آپ کی محبت کی غمازی کرتے ہیں بلکہ اس ثقافتی پس منظر اور روایات کو اجاگر کرتے ہیں جن میں آپ کی تربیت اور ذہنی نشوونما ہوئی ہے۔آپ کے دیکھنے پرکھنے کے انداز کا اچھوتا پن اور یوں ایک مخصوص زاویے سے زندگی کرنے کی دعوت' ان خاکوں کا نمایاں پہلو ہیں۔اپنی خوشگوار تحریروں سے آپ نے ایسی قدروں کا بے نقاب کیا ہے جن سے نئی نسل کے جیالے آشنا نہیں ہیں۔مجھے خاص طور پر آپی اور غلام جیلانی اصغر والا خاکہ بے حد پسند آیا۔دوسرے بھی کسی طرح کم نہیں۔

ثریا شہاب:(جرمنی) ''میری محبتیں'' میں بیس خاکے شامل ہیں دس قریبی رشتہ داروں کے اور دس ادیبوں اور دوستوں کے۔حیدر قریشی نے اپنے والد، والدہ ، دادا، ، نانا، تایا، ماموں، ہمشیرہ، بیوی، بھائی اور پانچوں بچوں کے بڑے دلآویز خاکے لکھے ہیں۔ان خاکوں میں بڑی کھلی کھلی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔حیدر قریشی اپنی محبوب شخصیتوں کے ساتھ اس کتاب میں زندگی بسر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اس کتاب میں شامل جن شخصیات کے ساتھ ہماری دوستانہ ملاقات ہوتی ہے، وہ شخصیات کسی گروہی حوالے کے بجائے اپنے ثقافتی پس منظر سے ابھرتی ہیں اور پورے انسانی حوالے سے سامنے آتی ہیں۔انسانی حوالے سے میری مراد کسی محدود گروہی سطح سے اوپر اٹھ کر سامنے آنا ہے۔ادیبوں میں فیض احمد فیض، میرزا ادیب، وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، اکبر حمیدی، عذرا اصغر اور سعید شباب کے علاوہ دو دوستوں بریگیڈیئر اعجاز

اکبر اور طاہر احمد کے خاکے شامل ہیں۔کہیں کہیں ادبی چھیڑ چھاڑ بھی ملتی ہے۔بعض سلگتے ہوئے
موضوعات کو بھی حیدر قریشی نے چھیڑا ہے لیکن کھل کر اور سامنے آ کر چھیڑا ہے۔رشتے داروں کے
خاکے لکھنے کی روایت اکبر حمیدی اور حیدر قریشی سے شروع ہوئی ہے اور اس میدان میں حیدر قریشی
بہت آگے نکل گئے ہیں۔شاید اسی لئے اشفاق احمد نے لکھا ہے کہ ’’ولایتی زبانوں میں ایسے سکیچ
اپنے اپنے انداز میں بہت ملتے ہیں لیکن اردو میں ’’میری محبتیں‘‘ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے‘‘۔

صفیہ صدیقی (انگلینڈ): آپ کی ’’کھٹی میٹھی یادیں‘‘ بہت پُر لطف ہیں اور میں تو
ادبی دیانت داری کو بہت اہم سمجھتی ہوں۔آپ نے جس طرح صاف صاف سب کچھ جو آپ نے
محسوس کیا وہ لکھ دیا یہ آپ کی خوبی ہے۔اسی طرح ’’میری محبتیں‘‘ بھی آپ کے جذبات اور
احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔’’محبت کی نمناک خوشبو‘‘ میں آپ نے اپنی آپی کا جس طرح
تذکرہ کیا ہے اسے پڑھ کر خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش میری بھی کوئی ایسی محبت کرنے والی بڑی
بہن ہوتی۔’’پسلی کی ٹیڑھ‘‘ میں آپ نے اپنی شریکِ حیات کا جس انداز میں تذکرہ کیا ہے اس
سے بے انتہا مسرت ہوئی۔ورنہ عموماً ہمارے معاشرے میں والدین کے انتخاب کردہ شوہر بیوی
میں زیادہ تر ساری عمر ’’سرد جنگ‘‘ سی جاری رہتی ہے۔وہ شریک سفر تو ہوتے ہیں، شریکِ زندگی
نہیں۔

نسیم سحر:(سعودی عرب) برادرم حیدر قریشی نے مظلوم متشدد کے عنوان سے
اپنے نانا جی کا خاکہ لکھنے میں اپنی نیم مزاحیہ تحریر سے بڑی دلچسپی پیدا کی ہے۔اور نفسیاتی زاویے بھی
روشن کئے ہیں۔کردار نگاری ایسی کمال کی ہے کہ کسی بھی مرحلہ پر قاری کو ان کے نانا جی سے نفرت
نہیں ہوتی۔عنوان خود ان کے کردار کو ظاہر کر دیتا ہے۔بعض مقامات پر نانا جی کی
Frankness بھی قابلِ داد ہے۔انہوں نے برادرم قریشی کو امرت دھارا اور ایٹم بم کے جو
نسخے عنایت فرمائے تھے اس کے مزاحیہ ذکر نے بھی اس خاکے کو اور بھی خاصے کی چیز بنا دیا
ہے۔جیئو حیدر قریشی! ایٹم بم کی جو گولیاں آپ کو ملیں ان میں سے دو تین ادھر بھی روانہ کر
دینا، صرف اسی صورت میں کہ وہ آزمودہ ہوں‘‘

(مکتوب مطبوعہ۔ماہنامہ ’’صریر‘‘ کراچی۔دسمبر۱۹۹۲ء)

عارف فرہاد: تمام خاکے سچے خلوص کے موتیوں کی طرح محبت کے ریشمی دھاگے میں ایسے

پروئے گئے ہیں کہ گزرے ہوئے زمانے میں لوٹ جانے کو اور مذکورہ شخصیات کو ملنے کو جی چاہتا
ہے۔

جاوید خان:(جرمنی): آپ کے خاکے پڑھتے ہوئے کئی بار خود سے ملاقات ہوئی۔کئی
بار یوں لگا کہ آپ کے اندر میں خود بول رہا ہوں۔رحیم یار خاں کی گلیوں میں گھوم رہا ہوں۔شاید یہ
باتیں میری سمجھ میں اپنے حقیقی معنوں میں اس لئے آتی ہیں کہ میں نے غربت کا چہرہ بہت قریب
سے دیکھا ہے۔مجھے حئی سنز شوگر ملز اور پاکستان آرڈیننس فیکٹریز واہ میں کوئی فرق محسوس نہیں
ہوتا۔وہی مزدور یونینز، وہی ان کے مطالبات اور انتظامیہ کے وہی ہتھکنڈے۔کچھ بھی تو مختلف
نہیں۔مسائل، وسائل، محبتیں، نفرتیں، تلخیاں،
خلوص سب کچھ ایک جیسا ہے۔بہت پہلے ایک بار پاکستان گیا تو ٹیلی ویژن پر ایک ڈرامہ سیریل
چل رہی تھی۔گھر والے زبردستی مجھے بھی ساتھ بٹھا لیتے۔اس ڈرامے کی بیک گراؤنڈ میں ایک
گیت کا بول بار بار دہرایا جاتا۔مائے نی میں کنوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال نی۔۔۔۔۔یہ
گیت جیسے میرے اندر سرایت کر گیا تھا۔آپ کا یہ خاکہ پڑھتے ہوئے میری کیفیت بھی مِس
روزلین سے کچھ مختلف نہ تھی۔اماں جان بقیدِ حیات ہیں مگر چراغِ سحری ہیں اور میں اکلوتی اولاد
ہونے کے باوجود انہیں درد وچھوڑا دیئے بیٹھا ہوں۔کیا کروں؟ کچھ بھی تو اپنے اختیار میں
نہیں۔(دُکھاں دی) روٹی پاؤں کی زنجیر بن گئی ہے ورنہ اپنے پیاروں سے دور رہ کر جینا بھی کوئی
جینا ہے!

حیدر صاحب! جو بے ساختگی اور سچائی میں نے آپ کی تحریر میں پائی ہے، بہت کم لوگوں کے ہاں ملتی
ہے۔مجھے ایک خاص سطح سے نیچے کی تحریریں بالکل متاثر نہیں کرتیں۔میں ادب کا ایک حقیر طالب
علم ہوں لیکن سچائی کی تلاش میں رہتا ہوں۔بناوٹ یا بڑے نام میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں
رکھتے۔نہ ہی مجھے کبھی کسی کی دولت مرعوب کرتی ہے۔یہ سب میرے لئے سطحی اور چھوٹی باتیں
ہیں۔خدا آپ کا زورِ قلم اور زیادہ کرے۔جو راہ آپ نے اپنے لئے منتخب کی ہے وہ ’’زگ
زیگ‘‘ سہی۔مگر جاتی بہر طور منزل کی طرف ہے۔اس لئے کہ جذبوں کی صداقت اپنا رستہ خود
متعین کرتی ہے۔لکیروں کے ڈسے مجھ سے لوگوں کے لئے آپ بہر حال خضر راہ ہیں۔

حیدر قریشی کے انشائیے

نذر خلیق

حیدر قریشی کی انشائیہ نگاری کی ابتدا ''اوراق'' کے انشائیہ نمبر (اپریل ،مئی ۱۹۸۵ء) سے ہوئی۔اس میں ان کے دو انشائیے ''خاموشی'' اور ''نقاب'' شامل تھے اور یہی حیدر قریشی کے اوّلین دو انشائیے تھے۔تب سے اب تک انہوں نے صرف دس انشائیے لکھے ہیں۔ان میں سے بیشتر ''اوراق'' میں شائع ہوئے اور دو تین بعض اور رسائل میں شائع ہوئے۔ان کے دس انشائیوں کی فہرست یہ ہے۔۱۔خاموشی، ۲۔نقاب،۳۔وگ،۴۔فاصلے قربتیں،۵۔بڑھاپے کی حمایت میں، ۶۔اطاعت گزاری،۷۔یہ خیروشرّ کے سلسلے،۸۔چشمِ تصور،۹۔اپنا اپنا سچ،۱۰۔تجربہ کاری

یہ انشائیے کتابی صورت میں تو ابھی تک شائع نہیں ہوئے لیکن انٹرنیٹ پر حیدر قریشی کی ویب سائٹ www.haiderqureshi.com پر پوری کتاب ''فاصلے قربتیں'' کے نام سے آن لائن موجود ہے۔

حیدر قریشی کی انشائیہ نگاری میں دو شخصیات کا کردار بہت اہم ہے۔ایک ڈاکٹر وزیر آغا کا اور ایک ان کے تایا ،جنہیں سب بابا جی کہتے تھے۔اپنے انشائیوں کے مجموعے ''فاصلے،قربتیں'' کا انتساب حیدر قریشی نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

ابا جی کے بڑے بھائی

اپنے بابا جی کے نام

جنھوں نے ایک انشائیہ نگار جیسی زندگی بسر کی

اپنے ان بابا جی کے بارے میں حیدر قریشی نے ان کے خاکہ ''مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ'' میں بھی ایک اشارہ دیا ہے۔جو ان الفاظ میں ہے۔

''ابا جی نے زندگی ایک مقالہ نگار کی طرح بسر کی تو بابا جی نے انشائیہ نگار کی طرح زندگی گزاری۔وہ

صراطِ مستقیم کی صداقت کے قائل تھے مگر ٹیڑھی میڑھی اور اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلنا اور ارد گرد بکھرے رنگوں اور خوشبوؤں سے لطف اٹھانا انہیں پسند تھا''

(خاکہ ''مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ''۔کتاب ''**میری محبتیں**''ص۴۳)

وزیر آغا کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

''وزیر آغا نے مجھے انشائیہ کے بارے میں زبانی گفتگو میں بھی سمجھایا،مضامین کے مطالعہ کی طرف لگایا اور پھر انشائیے لکھنے کا شوق پیدا کیا'' (وزیر آغا۔**عہد ساز شخصیت**۔ص۲۱)

یوں کہہ سکتے ہیں کہ وزیر آغا نے انہیں انشائیہ کے خدوخال سمجھائے تو ان کے بابا جی نے اپنی زندگی سے انہیں انشائیہ کے مزاج سے آشنا کیا،اسی لئے حیدر قریشی نے اپنے انشائیوں کے مجموعے کا انتساب اپنے بابا جی کے نام کرنا ضروری سمجھا۔چونکہ میں خود ان کے بابا جی سے بہت قریب رہا ہوں اس لئے حیدر قریشی کی انشائیہ نگاری کے اس پس منظر کو بیان کر دیا ہے۔ممکن ہے آگے چل کر حیدر قریشی پر کام کرنے والوں کو اس سے کوئی معاونت مل جائے۔

جہاں تک حیدر قریشی کے انشائیوں کا تعلق ہے ان میں وہ تمام اوصاف ہیں جن کے لئے ڈاکٹر وزیر آغا ہمیشہ اصرار کرتے رہے ہیں اور حیدر قریشی بھی ایک حد تک اس معاملہ میں ان کے مبلغ کا فرض ادا کرتے رہے ہیں۔لیکن ان سب اوصاف میں سے حیدر قریشی کے ہاں بعض ایسے نمایاں ہیں کہ انہیں خصوصیت کے ساتھ حیدر قریشی کے انشائیوں کی پہچان کہا جا سکتا ہے۔اس سلسلے میں کسی طول کلام کے بغیر میں ان اوصاف کے بیان کے ساتھ ان کی نشاندہی پر اکتفا کروں گا۔

شگفتگی اور تازگی: حیدر قریشی کے انشائیوں میں شگفتگی اور تازگی کا ایسا احساس ملتا ہے جو عام طنز و مزاح سے بالکل الگ زیرِ لب مسکراہٹ کو جنم دیتا ہے۔یہ مسکراہٹ غور کی طرف مائل بھی کرتی ہے۔اس سلسلہ میں یہ چند مثالیں دیکھئے۔شگفتگی اور تازگی کا یہ انداز حیدر قریشی کی نثر کی پہچان بھی ہے۔

''خاموشی کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے۔جب مکمل خاموشی ہو، ہونٹ بھی خاموش ہوں تب دو دھڑکتے دلوں کی جو گفتگو ہوتی ہے اسے اہلِ دل بخوبی جانتے ہیں۔کوئی صوفی جب تک کسی گوشۂ خاموشی میں نہ جائے تب تک اس کے دل کے تار حقیقتِ عظمٰی سے نہیں مل پاتے۔کسی ہنگامہ خیز، پُرشور ماحول نے نہ کبھی دو سچے دلوں کو ملنے دیا ہے اور نہ کبھی کوئی سچا صوفی پیدا کیا ہے۔''

(خاموشی)

''وگ میں یہ سہولت ہے کہ آپ جب چاہیں وگ پہن کر اپنی اصل صورت دیکھ لیں اور جب چاہیں وگ کو اتار کر قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ کرلیں۔''(**وگ**)

''بڑھاپا بزرگی اور متانت عطا کرنے کے ساتھ زندگی کے تجربات کا نچوڑ نکال کر ایک رہنما کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔ بڑھاپے میں گرگِ ظالم بھی پرہیزگار بن جاتا ہے اور یہ پرہیزگاری اسے قویٰ کے اضمحلال اور زندگی کے تجربات کے نچوڑ کے بعد نصیب ہوتی ہے۔(آفرین ہے ان بزرگوں پر جو ستر سال کی عمر کے بعد بھی جوان لڑکیوں سے شادی کرنے کی جرأت رکھتے ہیں اور یوں سرِ عام گرگ ظالم کی پرہیزگاری کو بھی شرمسار کردیتے ہیں۔خواہ ایسے جرأت مندانہ اقدام کے نتیجہ میں جان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑیں)''(**بڑھاپے کی حمایت میں**)

''اطاعت گزاری، فرماں برداری اور وفا شعاری ایک ہی حقیقت کے مختلف چہرے ہیں۔اطاعت کا مادہ انسانی نفس کو سنگسار کرکے اس کی روح اور ذہن کو ہر طرح سے سبکسار کردیتا ہے، گویا اطاعت سے مراحلِ تصوّف کا آغاز ہوتا ہے اور کمال اطاعت تک وہ کامل صوفی بن جاتا ہے۔دنیا کی لعنت ملامت یا اپنے ضمیر کی طعنہ زنی اسے اطاعت سے نہیں روک سکتی۔کوئی عاشق اس وقت تک سچا اور کامیاب عاشق نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنی وفا کے جوہر کو محبوب کی کامل اطاعت کے مقام تک نہ پہنچا دے۔اسی لئے سچا عاشق اطاعت کی ایک ہی جست سے عشق کے سارے مرحلے طے کرکے فارغ ہوجاتا ہے۔''(**اطاعت گزاری**)

''اس دنیا میں اربوں کی تعداد میں انسان موجود ہیں۔سب کے تمام اعضا ایک جیسے ہیں۔اتنی گہری یکسانیت کے باوجود ہر انسان دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہے۔اس کا دوسروں سے کچھ مختلف ہونا اس کی ذاتی شناخت ہے اور یہی اس کا ذاتی سچ ہے۔ پھولوں کو دیکھیں ہزار ہا اقسام کے اور رنگا رنگ پھول ہیں۔ اس کے باوجود ہر پھول ایک قدرِ مشترک رکھنے کے باوجود ہر دوسرے پھول سے مختلف ہے۔ پھولوں، پودوں کو چھوڑیں، پتھروں کو دیکھ لیں۔ پتھروں کو جمع کرنے کا شوق رکھنے والے حضرات اور پتھروں سے سر پھوڑنے والے عشاق بخوبی جانتے ہیں کہ دنیا میں ایک جیسے دو پتھر بھی نہیں ملتے۔گویا اصل سچائی بیک وقت یکسانیت اور اختلاف کے امتزاج سے اُبھرتی ہے۔''(**اپنا اپنا سچ**)

''نقاب ہمیں سکوت اور ٹھہراؤ کی حالت سے اٹھا کر متحرک کرتا ہے۔تجسّس کی آگ ہمارے سینوں میں بھڑکا کر ہمیں سفر پر روانہ کرتا ہے اور پھر سفر بھی چوتھے کھونٹ کا۔چنانچہ انسان کا چاند کی طرف اور پھر اس سے بھی آگے کی طرف کا سفر ہو یا کسی عاشقِ صادق کا آدھے نقاب والے محبوب کے تعاقب میں اس کے گھر کا سفر ہو، سب اسی چوتھے کھونٹ کے سفر کی داستانیں ہیں''۔(**نقاب**)

تلخ سیاسی اور سماجی امور:اردو انشائیہ میں عام طور پر اصلاحی یا سیاسی نوعیت کے موضوعات راہ نہیں پا سکتے۔کیونکہ ان میں بلند آہنگ پیدا ہوجانے کے باعث انشائیہ کا مزاج متاثر ہوتا ہے۔لیکن حیدر قریشی کے انشائیوں میں تلخ سیاسی اور سماجی مسائل نہ صرف بیان ہوئے ہیں بلکہ ان میں ایسا دھیما پن پیدا ہوگیا ہے کہ انشائیہ کا مزاج بھی برقرار رہتا ہے اور ممنوعہ موضوعات بھی انشائیہ میں سرایت کرجاتے ہیں۔اس سلسلہ میں چند مثالیں دیکھئے:

''بعض لوگ خاموشی کو شکست کی آواز سمجھتے ہیں۔ایسے لوگ تاریخ اور مستقبل سے بے خبر''حال مست''ہوتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ خاموشی تو فتح کی پیش خبری ہوتی ہے۔ جب سمندر خاموش ہو یا فضا میں ہوا خاموش ہو تب خاموشی طوفان اور آندھی کی صورت اپنا جلالی روپ دکھاتی ہے۔ سقراط نے زہر پی کر، حسینؑ نے شہید ہوکر اور ابن منصور نے سولی قبول کرکے خاموشی سے صبر کے جو عظیم نمونے دکھائے بظاہر وہ اُس عہد کے جھوٹوں اور جابروں کے سامنے شکست ہی تھی۔لیکن درحقیقت ان مظلوموں اور سچوں کی خاموشی اُن کی فتح کی پیش خبری تھی جسے آنے والے وقت نے سچ ثابت کیا۔مظلوموں کی خاموشی کی یہ سچائی ہمیشہ سے قائم ہے۔''(**خاموشی**)

آج امریکہ بہادر دنیا میں جو کچھ کررہا ہے، اس کے بارے میں حیدر قریشی انشائی انداز سے یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

''یوں تو دنیا کے سارے ڈپلومیٹس تجربہ کاری کے زائیدہ ہیں لیکن دنیا کی واحد سپر پاور کے ڈپلومیٹس نے تجربہ کاری کی انتہاؤں کو چھولیا ہے۔جن مخصوص ممالک سے ان کے مفادات وابستہ ہیں وہاں کسی کو کانٹا بھی چبھ جائے تو واشنگٹن میں ان ڈپلومیٹس کا بچہ بچہ بے تاب ہوجاتا ہے لیکن جن خطّوں سے ان کے مفادات لگّا نہیں کھاتے، وہاں انسانی خون بیدردی کے ساتھ پانی کی طرح بھی بہایا جارہا ہو تو ان کی بےفکری دیدنی ہوتی ہے۔ یہ ڈپلومیٹس دنیا بھر میں جمہوریت کے نفاذ کے علمبردار ہیں لیکن اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لئے بعض ملکوں میں نہ صرف

بادشاہتوں کوتحفظ فراہم کرتے ہیں بلکہ جہاں اپنا فائدہ نظر آئے وہاں جمہوریت کا خاتمہ کر کے فوجی آمریت بھی مسلّط کر دیتے ہیں۔ یہ کھیل تماشہ محض ڈپلومیسی یا سیاست نہیں بلکہ تجربہ کاری کا کمال ہے۔''(**تجربہ اور تجربہ کاری**)

اپنی سوسائٹی کے کھوکھلے کرداروں کوحیدرقریشی اس طرح عریاں کرتے ہیں۔

''بڑے بڑے عظیم لوگ، پہاڑ جیسے عظیم لوگ۔ اکثر محض اس لئے عظیم لگتے ہیں کیونکہ ہم انہیں فاصلے سے دیکھتے ہیں۔ اپنی نام نہاد عظمت کی بلندی سے انہیں اچھے بھلے انسان اور بڑی بڑی چیزیں بھی حقیر سی دکھائی دیتی ہیں۔ فاصلے اور بلندی کے اس تماشے کی حقیقت کو سمجھنے کی بجائے ایسے ''عظیم لوگ'' سچ مچ اپنی عظمت کے خبط میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ انہیں قریب سے دیکھ لیتے ہیں اُن پر اُن کی عظمت سے زیادہ اُن کی شخصیت کے مخفی جوہر کھل جاتے ہیں اس لئے وہ ان کی عظمت کے منکر ہوجاتے ہیں۔ ایسے منکرین کے ساتھ پھر کیا سلوک کیا جاتا ہے یہ ایک الگ داستان ہے بلکہ داستانوں کا ایک سلسلہ ہے جس سے تاریخِ انسانیت بھری پڑی ہے۔
طویل فاصلے سے سورج جیسے چمکتے ہوئے لوگ، اپنے اندر سورج سے بھی زیادہ بڑا جہنم آباد کئے بیٹھے ہوتے ہیں یہ الگ بات کہ فاصلے پر بٹھائے ہوئے لوگوں کے لئے جنت کی بشارتیں نشر کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی بشارتوں پر شک کرنے لگے تو اس کی زندگی کو ہی جہنم بنا دیا جاتا ہے۔''

(**فاصلے، قربتیں**)

نکتہ آفرینی:

حیدر قریشی کے انشائیوں میں نکتہ آفرینی کا عنصر فراوانی سے ملتا ہے۔ ان کی نکتہ آفرینی ایک دو جملوں سے بہت کم ظاہر ہوتی ہے۔ اگر چہ ایسا بھی ہوتا ہے لیکن عموماً ایک پوری فضا کے بعد ان کی بات کا بھید کھلتا ہے۔ اور ان کی نکتہ آفرینی سے لطف لینے کے لئے اس سطح تک جانا ضروری ہوجاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی صاحب کو ''کیرلین پراسیس'' کا علم نہیں ہے تو شاید وہ اس اقتباس سے پورا لطف نہ اٹھا سکیں۔ لیکن جنہیں اس پراسیس کا علم ہے ان کے لئے اس اقتباس کی نکتہ آفرینی فکری مسرت کا باعث بنے گی۔

''وِگ کیرلین پراسیس کے بیان کردہ گم شدہ حصے کی دریافت میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ وِگ کا جہان بہروپیوں سے یکسر مختلف ہے۔ وِگ پر بہروپ کا الزام عائد کرنے والے حقیقتاً خود

بہروپیے ہیں جو اپنے بہروپ کا بھرم قائم رکھنے کے لئے وِگ کی اہانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وِگ پہننا اپنے گم شدہ حصے کی بازیافت کا عمل ہے جس کے بغیر اپنی پہچان اور اپنے عرفان کے مرحلے طے نہیں ہوسکتے۔''(**وگ**)

عام نوعیت کے فکری معاملات میں حیدر قریشی کا نکتہ نظر یوں سامنے آتا ہے۔

''نقاب کے بارے میں غور کیا تو مجھ پر منکشف ہوا کہ نقاب نہ صرف حسن کو مزید نکھارتا ہے بلکہ عیوب کو ڈھانپ کر ان میں بھی ایک حسن پیدا کر دیتا ہے۔''(**نقاب**)

''ہر سچ میں کچھ نہ کچھ جھوٹ اور ہر جھوٹ میں کچھ نہ کچھ سچ ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص تاروں بھرا آسمان دیکھ کر کہے کہ میں اس وقت آسمان پر موجود اتنے سارے ستارے دیکھ رہا ہوں، تو یہ بات بالکل سچ ہوگی۔ اس کے باوجود اس میں غیر ارادی جھوٹ بھی شامل ہوگا۔ کیونکہ حقیقتاً جن ستاروں کی روشنی ہم تک پہنچ رہی ہوتی ہے وہ اس وقت کی نہیں ہزاروں برس پہلے کی ہوتی ہے۔
-------------- مکمل سچائی تو صرف خدا تعالیٰ کی ہستی ہے۔ باقی سب جزوی سچائیاں ہیں۔''(**اپنا اپنا سچ**)

عصرِ حاضر کے سائنسی انکشافات اور اقبالی فلسفہ کے اثرات اس طرح حیدر قریشی کے انشائیہ کا حصہ بنتے دکھائی دیتے ہیں۔

''قربت کی انتہا یکتائی ہے جبکہ فاصلے کی ابتدا سے فرقِ من و تو پیدا ہوتا ہے۔ قربت محبت اور عقیدت کا ثمر ہے اس لئے دل کے زیرِ اثر ہے۔ عقل وشعور سے اس کا معاملہ بس واجبی سا ہوتا ہے۔ فرقِ من و تو، شعور و آگہی کا پہلا سبق ہے (باقی کے سارے سبق اسی فرق کی تشریح اور تفسیر ہیں) اس لئے فاصلے کو عقل و شعور کے زیرِ اثر سمجھا جاسکتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قربت آتشِ نمرود یا آتشِ محبت میں بے خطر کود پڑنے کا نام ہے جبکہ فاصلہ ہمیشہ محو تماشائے لبِ بام رہتا ہے بلکہ بعض اوقات لبِ بام سے بھی پرے کھڑا ہوتا ہے۔ اگر فاصلہ بھی اس آتش میں کود پڑے تو پھر فرقِ من و تو ختم ہوجائے گا، فاصلہ ختم ہوجائے گا بس قربت ہوگی، یکتائی کا عالم ہوگا۔ اسے نیستی یا فنا بھی کہہ سکتے ہیں۔
تخلیق کے امکانات کو قربت یکجا کرتی ہے اور فاصلہ تخلیقات کے انبار لگاتا چلا جاتا ہے۔ موجودہ کائنات کی تخلیق کا جو سائنسی نظریہ مقبول ہے۔ اس کے مطابق پہلے سارا کائناتی مادہ یک جا تھا گویا

قربت کی انتہا تھی۔ یہ مادہ ایک بہت بڑے گولے کی صورت میں تھا جس کے اندر تخلیق کے سارے امکانات موجود تھے۔ بڑے دھماکے (BIG BANG) کے نتیجہ میں جب یہ گولا پھٹا تو فاصلہ پیدا ہونے لگا۔فرقِ من وتو پیدا ہونے لگا۔ یہ کہکشاں ہے، یہ سورج ہے، یہ سیارے ہیں، انہیں سیاروں میں یہ زمین ہے اور یہ ہماری زمین کا چاند ہے۔قربت نے ان ساری رونقوں کو اپنے اندر سمیٹ رکھا تھا فاصلے نے انہیں محبت کے زخموں کی نمائش کی طرح باہر لا کر سجادیا۔''
(**فاصلے،قربتیں**)

نظریاتی حوالے سے حیدر قریشی کا متوازن اندازِ نظر اس طرح ظاہر ہوتا ہے۔
''جب کوئی خود کو سچا کہتا ہے تو گویا اپنے خوبصورت ہونے کا اعلان کرتا ہے لیکن پھر ساتھ ہی دوسروں کو بدصورت بھی قرار دیتا ہے۔اصولاً کسی کو اپنی خوبصورتی کے ثبوت کے لئے دوسروں کی بدصورتی کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔اگر آپ خوبصورت ہیں تو کسی کی بدصورتی کی نشاندہی کئے بغیر بھی آپ خوبصورت ہیں، لیکن اگر آپ بدصورت ہیں تو بے شک سارے جہان کی بدصورتی ثابت کر دیجئے اس سے آپ کا خوبصورت ہونا ثابت نہیں ہو سکے گا۔''
(**اپنا اپنا سچ**)

ذاتی زندگی کا عکس: حیدر قریشی ایسے ادیب ہیں جن کی تخلیقات میں ان کی ذاتی زندگی کے رنگ بہت گہرے ہیں۔ان کے انشائیوں میں بھی ان کی ذاتی زندگی کا عکس بہت واضح ہے۔انشائیہ ''وگ'' کے آغاز اور اختتام میں ان کی ذاتی زندگی براہ راست سامنے آتی ہے،اور تجربے کی نوعیت ''انکشافِ ذات'' کے عمومی انشائی تجربوں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔یہ دو اقتباس قدرے طویل ہیں لیکن ان سے،انشائیہ ''وگ'' میں ان کی ذاتی زندگی کا عکس بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

''جب سے میں نے ہوش سنبھالا تب سے ہی دیکھا کہ اباجی کے سر پر بال نہیں تھے۔بچپن سے ہی میری شدید خواہش رہی کہ اباجی کے سر پر بال سجے ہوئے دیکھوں۔اس کی دو ممکنہ صورتیں تھیں یا تو کوئی ایسی دوا مل جائے جس سے بال دوبارہ اُگ آئیں یا پھر وِگ سجالی جائے۔تب وگ خریدنے کے وسائل میسّر نہیں تھے پھر بھی میں نے ایک بار اباجی سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ مسکرا کر رہ گئے۔اور بس!

وسائل میسّر آنے سے پہلے اباجی فوت ہو گئے۔ان کی وفات کے ساتھ ہی یہ انوکھا سا واقعہ رونما ہوا کہ دنیائے فانی سے کوچ کرنے کے بعد اباجی میرے اندر آن بسے۔دل میں،لہو میں، روم روم میں بس گئے یہاں تک کہ میرے سر پر بھی پوری طرح نمودار ہو گئے۔تب مجھے اندازہ ہوا کہ واقعی ہمارا باہر بھی ہمارے اندر کا ایک حصہ ہے۔اباجی کی محبت نے جب میرے اندر اور باہر پر پوری طرح غلبہ کر کے مجھے تصوف کے مقامِ فنائیت تک پہنچا دیا تب میں، میں نہ رہا۔میں نے آئینہ دیکھا تو ایسے لگا جیسے بیس برس پہلے کے اباجی کو دیکھ رہا ہوں۔''(**وگ**)

''یہاں تک لکھنے کے بعد میں نے ایک بار پھر آئینے میں خود کو دیکھا تو مجھے ایسے لگا کہ اباجی میرے سامنے کھڑے ہیں۔اُن کے سر پر گھنے اور خوبصورت بال سجے ہوئے ہیں جنہیں سلیقے سے سیٹ کیا گیا ہے۔اسی لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میری بچپن کی وہ آرزو پوری ہو گئی ہے کہ کبھی اباجی کے سر پر بھی بال سجے ہوئے دیکھ سکوں۔تب ہی مجھ پر منکشف ہوا کہ اباجی میرے اندر کی طرح باہر بھی اسی طرح موجود ہیں جیسے وِگ سے پہلے موجود تھے،اس فرق کے ساتھ کہ میں ان کی عمر کا جو زمانہ نہیں دیکھ سکا تھا اب مجھے وہ زمانہ بھی دکھائی دے رہا ہے۔میں آئینے میں اباجی کو دیکھ کر مسکرایا تو وہ بھی مسکرا دیئے۔انکشافِ ذات کا یہ نظارہ وِگ سے سرافراز ہوئے بغیر کہاں ممکن تھا!''(**وگ**)

ایک اور انشائیہ ''چشمِ تصور'' میں ذاتی زندگی کا ایک رنگ یوں دکھائی دیتا ہے۔
''مجھے پانچ چھ سال کی عمر میں ہی خدا اور قیامت کے بارے میں ڈھیر ساری باتیں بتادی گئی تھیں، جن میں سے بہت کم باتیں میری سمجھ میں آسکیں۔تاہم ان تمام باتوں کا مجموعی تاثر ایک خوف کی صورت مجھ پر مسلّط ہو گیا۔مکمل فنا(قیامت) کا تصوّر مجھ پر گھبراہٹ طاری کر دیتا۔میں چشمِ تصوّر سے دیکھتا کہ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے کہیں کچھ نہیں ہے۔اس کے ساتھ ہی ایک ہولناک خلا کا تصوّر میرے ذہن میں آتا اور میرا دل جیسے اس خلا میں ڈوبنے لگتا۔پھر کبھی میں چشمِ تصوّر سے دیکھتا کہ ساری کائنات تو موجود ہے لیکن انسان کا وجود نہیں ہے اور اس خیال کے ساتھ ہی مجھ پر ایک عجیب سا اضطراب طاری ہو جاتا ہے اور میں خدا سے دعا کرنے لگتا کہ مولا!۔۔میں بے شک نہ رہوں مگر یہ دنیا اور اس دنیا میں انسانی زندگی کو کبھی ختم نہ کرنا۔دعا کرنے کے باوجود میں خدا کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں سوچ پاتا تھا۔''(**چشمِ تصوّر**)

دنیا میں مختلف نظریات اور عقائد کو باہمی ٹکراؤ کے بجائے ایک دوسرے کے قریب لانے کا فریضہ

حیدر قریشی اس طرح ادا کرتے ہیں کہ ان سے متفق نہ ہو کر بھی ان کی بات کو، ان کے اندازِ نظر کو غلط کہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ''فاصلے، قربتیں'' میں حیدر قریشی رقمطراز ہیں۔

''فاصلے کے معاملے میں جیومیٹری کے کئی زاویے بھی آڑے آتے ہیں۔ میدانی یا صحرائی علاقے میں آپ ایک خاص حد تک صاف اور پھر مدھم مدھم دیکھ سکتے ہیں۔ بڑے شہروں میں بیس پچیس منزلہ عمارتوں سے دیکھیں تو اردگرد کا منظر کسی اور ہی روپ میں سامنے آتا ہے پہاڑی علاقے میں بل کھاتے ہوئے، مڑتے ہوئے اونچے نیچے رستے تو قدم قدم پر چونکاتے ہیں۔ ۴۰ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا آدمی جس منظر کو صاف طور پر دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ۲۰ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا آدمی محض قریبی موڑ آڑے آنے کی وجہ سے اس منظر کو نہیں دیکھ سکتا۔ کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا ہے جیسے سارے نظریات ایسے ہی بل کھاتے ہوئے رستوں کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ ۲۰ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا جس منظر کا انکار کر رہا ہے بظاہر اس کا انکار درست ہے اور ۴۰ فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہوا جس منظر کی موجودگی پر اصرار کر رہا ہے اس کا اصرار بھی سچ ہے۔ مسئلہ تو صرف اتنا ہے کہ دونوں فریق یہ نہیں کرتے کہ اپنی اپنی جگہ پر جم کر دوسرے کو جھوٹا قرار دینے کی بجائے خود دوسرے کی جگہ پر جا کر بھی اُس منظر پر ایک نظر ڈال کر دیکھ لیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو نظریاتی سطح پر صرف اپنے گروہ کو سچا اور دوسرے گروہوں کو جھوٹا قرار دینے کا منفی رویہ ختم ہو جائے۔''

(فاصلے قربتیں)

ان چند انشائیوں کے تعارف سے جہاں حیدر قریشی کے ذہنی میلان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی انشائیہ نگاری غزل کی ریزہ خیالی کے اثر سے چھٹک کر ان کی تخلیقی نثر میں ان کی پہچان بن گئی ہے۔ ان کے گنتی کے دس انشائیے اپنی ادبی اہمیت کے لحاظ سے اتنے اہم ہیں کہ اگر کوئی نقاد بہت زیادہ بددیانتی کا مرتکب نہ ہو تو انہیں نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

''میری انشائیہ نگاری میں ڈاکٹر وزیر آغا کا بہت بڑا حصہ ہے۔ باقی انشائیہ نگاروں میں غلام جیلانی اصغر، انور سدید، مشتاق قمر اور اکبر حمیدی مجھے اچھے لگتے ہیں۔ شاید ان کے اثرات بھی میرے انشائیوں میں ملتے ہوں۔ **(حیدر قریشی سے ایک مکالمہ**

بحوالہ کتاب **حیدر قریشی فکر و فن**۔ از محمد وسیم انجم۔ ص۔ ۴۵)

سوئے حجاز۔۔۔ ایک سفرنامہ

شارق جمال

جناب حیدر قریشی صاحب (حال مقیم جرمنی) اردو زبان کے ایک معروف و مقبول زود گو قادر الکلام شاعر ہیں، اور صاحبِ طرز نثر نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ کئی شعری اور نثری کتب کے مصنف ہیں۔ ۲۰۰۰ء میں اس کتابوں کی فہرست میں اضافہ کرنے والی سو صفحات کی اور کتاب ''سوئے حجاز'' کے نام سے پیش کی ہے۔ یہ کتاب ایک سفرنامے کی صورت میں ہے۔ یہ سفرنامہ جرمنی سے مکہ مکرمہ، مکہ مکرمہ سے مدینۂ منورہ۔۔ اور پھر مدینۂ منورہ سے مکۂ مکرمہ اور یہیں سے واپس جرمنی تک کے حالات پر مبنی ہے۔ اس سفر میں ان کی اہلیہ محترمہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔

''حجاز'' عرب کا وہ علاقہ ہے جو جدہ سے ستّر کلومیٹر دور مکّۂ معظّمہ سے مدینے تک کا ہے۔ اس کی حد میں طائف کا علاقہ بھی آتا ہے۔ یہی مکّۂ مکرمہ، طائف اور مدینۂ منورہ کا علاقہ حجاز کہلاتا ہے۔

جناب حیدر قریشی اور ان کی اہلیہ کا یہ سفرِ حجاز، عمرہ کے مقصد سے دسمبر ۱۹۹۶ء میں ہوا ہے۔ اس سفر کے کئی سال بعد یہ سفرنامۂ حجاز کتابی صورت میں منظرِ عام پر آیا ہے۔

کتاب کے ابتدائیہ میں تاریخی واقعات بھی اجمالاً پیش کئے ہیں اور کئی طرح کی جاہلانہ اور بے رحمانہ رسموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً۔۔۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں رہبانیت پسند افراد خود کو مجرد رکھنے کو بہتر سمجھتے تھے۔ اور جو لوگ زیادہ ہی انتہا پسند ہوتے تھے وہ عضوِ مخصوص کو ہی کٹوا لیتے تھے۔ اسی دورِ جاہلانہ میں کسی اہم قربانی کے تعلق سے اپنے بڑے صاحب زادے کو ذبح کرنا یا اس کی قربانی پیش کرنا ایک رسمِ بے رحمانہ تھی۔ اس ذیل میں جناب حیدر قریشی نے بہت عمدہ اپنی رائے یا اپنا خیال تحریر کیا ہے۔ بہر حال جناب حیدر قریشی کا یہ سفرِ حجاز بغرضِ عمرہ یکم دسمبر ۱۹۹۶ء سے ۱۲ دسمبر ۱۹۹۶ء تک کا ہوا ہے۔ اس سفر کی پوری پوری تفصیلات پر نظر رکھی گئی ہے اور انہیں احسن طریقے سے قرطاس پر لایا گیا ہے۔ خاص طور سے مکّۂ معظّمہ میں اور مدینۂ منورہ

میں گزرے ہوئے شب وروز کی پوری تفصیل کتاب میں درج ہے۔

''عمرہ'' ایک دینی اور اسلامی عمل کا نام ہے۔اس کے کچھ قاعدے اور ارکان ہیں۔ان ارکان کی ادائیگی جو لازمی ہے کچھ اس طرح ہوتی ہے:

مقامِ میقات سے غسل کرنے کے بعد دو رکعت نفل نماز پڑھی جاتی ہے۔عمرے کی نیت کی جاتی ہے۔اور پھر حجرِ اسود کو بوسہ دے کر وہیں مقام تنعیم سے طواف کعبے کا چکر مخصوص دعاؤں کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے۔طواف کے وقت دائیں ☆ جانب خانۂ کعبہ ہوتا ہے۔طواف کے وقت کی بھی دعا ہے۔طواف جہاں سے شروع کیا جاتا ہے وہیں آ کر ختم ہوتا ہے۔اسی طرح سات چکر پورے کئے جاتے ہیں۔طواف پورا ہوجانے کے بعد آبِ زم زم پیا جاتا ہے۔دو رکعت نماز ملتزم کے سامنے ادا کی جاتی ہے۔ہر چکر میں حجرِ اسود کو بوسہ دیا جاتا ہے۔پھر یہیں سے نیت کر کے (سعی کی نیت) کوہِ صفا سے تہلیل وتکبیر کے ساتھ سعی کی جاتی ہے۔درمیان میں ایک مخصوص مقام سے دوڑنا بھی پڑتا ہے۔کوہِ صفا سے کوہِ مَروا تک پہنچنے پر ایک چکر شمار کیا جاتا ہے۔واپسی میں اسی طرح کوہِ صفا تک آنے پر دو چکر شمار کیا جاتا ہے۔ساتواں چکر کوہِ مروا پر ختم ہوتا ہے۔اس طرح عمرہ پورا ہوتا ہے۔اور یہیں باہر آ کر سر منڈوایا جاتا ہے۔مذکورہ طواف خانۂ کعبہ کے گرد ہوتا ہے۔وہ کعبہ شریف جسے دیکھنے کی، جہاں پہنچنے کی ہر مسلمان کے دل میں آرزو ہوتی ہے۔مکۂ معظّمہ جہاں ہر مسلمان زندگی میں کم از کم ایک بار پہنچنے کی خواہش اور آرزو رکھتا ہے۔یہ عمرہ جو پہلا ہوتا ہے، اپنے لئے ہوتا ہے۔اسی طرح ہر انسان دوسرا عمرہ، تیسرا عمرہ اپنے خاندان کے افراد کے لئے بھی کرسکتا ہے۔

حیدر قریشی صاحب نے قیامِ مکۂ مکرمہ میں چھ عمرہ کیا۔پھر مدینۂ منورہ کا سفر کیا۔وہاں سے لوٹنے کے بعد ساتواں عمرہ بھی آپ نے کیا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ مزید عمرہ آپ نے اپنے خاندان کے افراد کے لئے کیا ہوگا ☆۔یہیں مکہ مکرمہ سے واپس آپ جرمنی چلے آئے۔

مدینۂ منورہ، جہاں محسنِ اعظم، ہادیٔ برحق حضور پاک ﷺ نے ۱۳ رسال تک دین کی تبلیغ کی ہے۔

مدینۂ منورہ، جہاں قیام فرما کر دنیا کے بیشتر مقامات تک اسلام کی دعوت پہنچائی ہے۔

مدینۂ منورہ، جہاں مسجد نبوی کی بنیاد رکھ کر نماز کے لئے اذان دینے کا طریقہ اور کلمات وجود میں آئے۔

مدینۂ منورہ، ہجرت کے بعد جہاں پوری دنیا کے لئے دینی مرکز قائم ہوا۔

مدینۂ منورہ، جہاں کی حاضری کی تمنا ہر مسلمان کے دل میں ہوتی ہے۔

مدینۂ منورہ، جہاں حضور اکرم ﷺ کی آخری آرام گاہ ہے۔

اسی مبارک اور مقدس مقام، مدینۂ منورہ کے قیام کے دوران آپ نے اور آپ کی اہلیہ نے کئی بار روضۂ نبویؐ پر حاضری کا شرف حاصل کیا۔صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔خاص خاص مقامات پر نفل نمازیں پڑھیں۔تاریخی اور مقدس مقامات کی زیارت کی۔تمام مساجد دیکھیں۔جنّت البقیع پہنچ کر جہاں حضرت میمونہؓ، حضرت خاتون جنت فاطمۃ الزہراؓ۔۔۔۔حضورؐ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم، حضرت عباسؓ۔۔۔آپ کے نواسے حضرت حسنؓ، حضرت حلیمہ سعدیہؓ، حضرت عثمانؓ خلیفۂ سوم، مع دونوں ازواج مطہرات۔حضرت عقیلؓ بن طالب۔۔۔۔اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی والدۂ محترمہ حضرت فاطمہ اور بہت سے صحابۂ کرام رضوان اللہ۔۔آرام فرما ہیں۔۔۔سب کے لئے دعائیں پڑھیں۔

اس سفر میں وہ مقام بھی دیکھا جہاں حضورِ اکرمؐ کے چچا حضرت امیر حمزہ، دو اور صحابہ کے ساتھ جو جنگِ احد ہی میں شہید ہوئے تھے، مدفون ہیں۔اسی جنگ کے اور شہیدوں کے جہاں مزارات ہیں آپ دونوں نے وہ مقام بھی دیکھا۔

اس سفرِ حجاز میں حیدر قریشی نے اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ اس خانۂ کعبہ کی زیارت کی جسے بتایا جاتا ہے کہ سب سے پہلے فرشتوں نے تعمیر کیا۔اس کے بعد بابا آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا۔اور آپ کے بیٹے شیث علیہ السلام نے بھی اس تعمیرِ ثانی میں حصہ لیا۔اس کے بعد جبکہ اس مقدس ومحترم اللہ کے گھر، خانۂ کعبہ کے ابتدائی آثار تقریباً مفقود تھے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے عزیز ترین فرزند، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر نئے سرے سے تعمیر کیا تھا۔

ان تمام مذکورہ زیارتوں کے حال کو، سفر میں دیکھے ہوئے تمام محترم مقامات کو تفصیل سے حیدر قریشی صاحب نے قرطاس کے حوالے کیا ہے۔ساتھ ہی جگہ جگہ اپنے انداز میں ان پر تبصرہ بھی فرمایا ہے اور قرآن حکیم کے اپنے وسیع ترین مطالعے کو بھی سامنے رکھ کر متعلقہ آیتوں کو بھی ترجمے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ساتھ ہی اپنے نظریات کو بھی بر سبیلِ تذکرہ بیان میں لے آیا گیا ہے۔

لیکن پھر بھی ان سے متعلق تحریر کیا ہے کہ: ''سوئے حجاز۔۔۔میں میرے نظریات اور تصوّرات

جس انداز میں آئے ہیں، ان سے اتفاق کرنا قطعاً ضروری نہیں ہے''

یہ سفر نامہ ہر سفرِ حجاز کرنے والے کے لئے ایک رہبر کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں تمام ضروری باتیں، ارکان، دعاؤں کے مقام جو عمرے سے متعلق ہیں احاطۂ تحریر میں آ گئی ہیں۔ کن ارکان کو کیسے ادا کرنا ہے؟ کہاں کہاں نفل نمازیں پڑھنا ہے؟ کہاں کہاں دعا مانگنا ہے؟ کس طرح مانگنا ہے؟ تفصیل کے ساتھ جنابِ حیدر قریشی نے تحریر فرمایا ہے۔

طواف اور سعی سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مبارکہ کو بتایا کہ حطیم میں ہم پہلے بھی نوافل ادا کر چکے ہیں لیکن آج ہم ایک سنّت پر عمل کرنے کا ثواب بھی حاصل کریں گے پھر میں نے اسے بتایا کہ ایک بار حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ کی خدمت میں خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھنا چاہتی ہیں تب حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ کا ہاتھ پکڑا اور انہیں حطیم میں لاتے ہوئے ارشاد فرمایا: یہاں نماز پڑھ لیں کیونکہ حطیم بھی کعبہ کا حصہ ہے۔ یہ بات کہہ کر حضورؐ نے پھر ارشاد فرمایا: نیا نیا ایمان لانے کے باعث اگر مجھے اپنی قوم کے ابتلا کا ڈر نہ ہوتا تو میں کعبہ کی عمارت کو گرا کے پھر سے ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کراتا۔ یہ بتا کر میں نے سنتِ رسولؐ کی پیروی میں مبارکہ کا ہاتھ پکڑا اور اسی طرح اسے لے کر حطیم میں داخل ہوا، یہاں ہم نے نوافل ادا کئے۔ خدا کے احسانات کی شکر گذاری کی، دلی دعائیں کیں حطیم والی طرف خانہ کعبہ کی جو دیوار ہے اس سے بہت سارے لوگ چمٹے ہوئے تھے۔ یکایک مجھ پر منکشف ہوا کہ۔۔۔ یہ سامنے والی دیوار تو صرف ظاہری پردہ ہے ورنہ میں جو حطیم میں بیٹھا ہوا ہوں درحقیقت خانہ کعبہ کے اندر ہی بیٹھا ہوا ہوں۔ عجیب لذّت آفریں اسرار تھا کہ میں بیک وقت کعبہ کے اندر بھی تھا اور باہر بھی۔۔۔۔۔۔ یہ داخلیت اور خارجیت کی بحث تو بس ایسے ہی ہے۔ اس انوکھے تجربے نے مجھے احساس دلایا کہ ہمارا باہر بھی ہمارے اندر کا ایک حصہ ہے۔ لیکن پھر اسی بھید کا ایک اور مرحلہ بھی مجھ پر منکشف ہوا۔

ظاہر، باطن عین ایانی، ہُو ہُو پیا سنیوے ہُو

سلطان باہو کے اس عارفانہ تجربے جیسی ہی کوئی بات تھی لیکن میرے لئے ناقابلِ بیان ہے۔

(حیدر قریشی کے سفر نامہ **سوئے حجاز** کے صفحہ نمبر ۳۶ سے اقتباس)

حیدر قریشی بحیثیت کالم نگار

نذر خلیق

حیدر قریشی بنیادی طور پر شاعر اور ادیب ہیں۔ سیاسی کالم نگاری ان کا میدان نہیں ہے۔ اس کے باوجود گزشتہ چند مہینوں سے انہوں نے ''منظر اور پس منظر'' کے نام سے حالاتِ حاضرہ پر ایک کالم لکھنا شروع کیا ہے۔ یہ کالم ویسے تو ماہنامہ ''آسٹرین ٹائمز'' آسٹریا سے لے کر ترکی میں قائم ویب سائٹ ''سچ بات ڈاٹ کام'' تک مختلف ویب سائٹس پر جزوی طور پر دستیاب ہیں۔ ''القمر آن لائن ڈاٹ کام'' نے بھی زیادہ تر یہ کالم اپنی سائٹ پر لگا رکھے ہیں۔ لیکن ان کالموں کی مکمل فائل امریکہ میں قائم ''اردو ستان ڈاٹ کام'' پر موجود ہے۔ اور ہر نیا کالم وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔

حیدر قریشی کا اصل میدان ادب ہے، صحافت نہیں۔ پھر وہ کالم نگاری کی طرف کیوں مائل ہوئے؟ اس سوال کا بہتر جواب حیدر قریشی ہی دے سکتے ہیں۔ مجھے اتنی بات سمجھ میں آتی ہے کہ امریکہ بہادر نے ''دہشت گردی'' کے خلاف مہم کے نام پر یکایک دنیا میں جو کاروائیاں شروع کی ہیں، ان کے نتیجہ میں ان کے اندر اضطراب پیدا ہوا اور اسی اضطراب کی وجہ سے انہوں نے ایک ادیب کی حیثیت سے عالمی صورتحال پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ ادبی لحاظ سے بھی دیکھیں تو حیدر قریشی کی نظم ''قیامت'' امریکہ کی عراق کے خلاف جارحیت پر ایک بہترین احتجاجی نظم ہے۔ اسی طرح ایٹمی جنگ کے مسئلہ پر حیدر قریشی نے تین افسانے لکھے ہوئے ہیں۔ ''حوا کی تلاش''۔ ''گلاب شہزادے کی کہانی'' اور ''کاکروچ''۔ بحیثیت ادیب حیدر قریشی نے اگر ان مسائل کے بہت زیادہ سامنے آنے سے پہلے اپنے خیالات کا ادبی انداز میں اظہار کر دیا تھا تو آج جب انسانیت کو ''طاقت کے گھمنڈ'' سے شدید خطرات لاحق ہو چکے ہیں حیدر قریشی نے خاموش رہنے کی بجائے عالمی حالات کے پیش منظر اور پس منظر پر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ حیدر قریشی کا کالم

''منظر اور پس منظر'' پڑھتے ہوئے مجھے ان کی چند اہم خصوصیات کا احساس ہوا ہے۔
ایک خصوصیت یہ کہ انہوں نے جن موضوعات کو چھوا ہے ان کی ایک حیثیت وقتی ہونے کے باوجود انسانیت کی تاریخ میں ایک مستقل حیثیت بنتی ہے۔اس طرح سے ان کے موضوعات محض ہنگامی اور وقتی موضوعات نہیں رہ جاتے۔ان کے کالم ''منظر اور پس منظر'' کے چند ذیلی عناوین سے ان کے موضوعات کے بارے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔
ہماری اجتماعی غلطیاں۔۔اختلاف عقیدہ کی بنیاد پر نفرت کیوں؟۔۔مغرب،مشرق اور افغانستان۔۔تہذیبوں کا ٹکراؤ۔۔تاریخی تسلسل پر ایک سرسری نظر۔۔تاریخ سے فرار کیوں؟۔۔ٹریڈ سنٹر پر اصل حملہ آور کون؟۔۔اتنا ظلم مت کیجئے۔۔فلسطینیوں کے لئے جانوروں جتنے حقوق کی اپیل۔۔امریکہ،ایشیا اور جنوبی ایشیا۔۔انڈو پاک،مسائل اور مستقبل۔۔جنرل پرویز مشرف اور پاکستان۔۔جنرل مشرف،بے نظیر اور شریف فیملی۔۔جہاد اور بعض اہم مذاہب کی تعلیمات۔۔عمران خان سے عالمِ اسلام تک۔۔امریکہ اور ہم۔۔متحدہ مجلس عمل،امریکہ اور افغانستان۔۔امریکی رویوں میں تبدیلی کے آثار۔۔انتہائی خطرے کی گھنٹی۔۔اور آیئے ہم سب مل کر مختاراں بی بی کے لئے روئیں۔۔۔
ان میں سے موخر الذکر کالم اپنے عنوان ہی سے پاکستان کے موضع میر والا سانحہ کی روداد معلوم ہوتا ہے۔لیکن اس روداد کا اختتام ان الفاظ میں ہوتا ہے:
''اس ایک لمحے میں میرے سامنے وہ سارے مظالم چھوٹے ہو گئے ہیں جو فلسطین،کشمیر،عراق اور افغانستان پر ایک منظّم سازش کے تحت ڈھائے جا رہے ہیں کیونکہ ان مظالم کو ڈھانے والے دشمن ہیں اور ان سب کے مقابلہ میں مختاراں بی بی کے ساتھ اپنے ہی مسلمانوں کے ہاتھوں روا رکھے جانے والا ظلم بہت بڑا ہو گیا ہے۔
مجھے ایسے لگا ہے جیسے مختاراں بی بی ہی فلسطین اور عراق ہے،اور مختاراں بی بی ہی کشمیر اور افغانستان ہے۔۔۔امریکہ اور اس کے سارے حلیفوں نے،اسرائیل اور ہندوستان نے۔۔۔سب نے مل کر چاروں اطراف سے مختاراں بی بی پر حملہ کر دیا ہے۔فلسطین،عراق،کشمیر،افغانستان سب لٹ گئے ہیں۔۔۔مختاراں بی بی لٹ گئی ہے۔
آیئے ہم سب مل کر مختاراں بی بی کے لئے روئیں!''

میرا خیال ہے کہ یہ واحد کالم ہے جس میں حیدر قریشی بہت زیادہ جذباتی ہوئے ہیں،لیکن اس کے باوجود انہوں نے سانحہ کی سنگینی کو مسلمانوں کی مجموعی اخلاقی حالت کے پس منظر میں پیش کرتے ہوئے اسے ایسے بیان کیا ہے کہ درپیش عالمی مسائل بھی نظر کے سامنے رہتے ہیں۔
اپنے عقائد کے لحاظ سے حیدر قریشی اور طالبان کی فکر میں زمین،آسمان اور آگ اور پانی جیسا فرق ہے اس کے باوجود انہوں نے طالبان کے کیس کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ ان کی بہت سی کمزوریوں کے باوجود افغانستان کے خلاف امریکی ظلم بے نقاب ہو جاتا ہے۔اس کے باوصف انہوں نے امریکہ کے بارے میں بھی اپنی سوچ کو بڑی حد تک متوازن رکھا ہے۔امریکی عوام اور امریکی حکومت کو دو حصوں میں الگ الگ کر کے انہوں نے امریکی حکومت کی غلط پالیسیوں کو ہدف تنقید بنایا ہے۔سابقہ روسی ریاستوں سے تیل کے ذخیرے لانے کے لئے امریکہ کے برسر اقتدار آئل مافیا کے سارے کھیل کو اور یہودی عزائم کو حیدر قریشی نے محض الزام تراشی والے انداز سے نہیں بلکہ ٹھوس حقائق کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس سلسلہ میں امریکہ اور یورپ میں موجود ہم آہنگی کے باوجود دونوں میں جو داخلی تصادم موجود ہے اسے بھی انہوں نے مناسب طور پر اور باریک بینی سے بیان کیا ہے۔خاص طور پر فرانس اور جرمنی کی قیادت میں یورپ کے ایک بڑے حلقے کی امریکہ بیزاری کو گہری نظر سے دیکھا ہے۔
اسلامی عقیدہ جہاد کی آڑ لے کر جس طرح اسلام کے نام کو بدنام کرنے کی سازش کی جارہی ہے،اس حوالے سے حیدر قریشی نے یہودی مذہب اور ہندو دھرم کی تعلیمات کو عمدگی سے پیش کر کے واضح اور بڑا مدلل جواب دیا ہے۔
عالمِ اسلام کے مسائل کو حیدر قریشی نے نہ صرف سمجھا ہے بلکہ انہیں بڑے اچھے انداز سے بیان کر کے مسلمان حکمرانوں کو توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔گزشتہ نصف صدی سے مسلمان حکمرانوں کی سنگین سیاسی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ انہوں نے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو بھی ایک سنگین مسئلہ قرار دیا ہے اور واضح کیا ہے کہ جب تک مسلم امہ متحد نہیں ہوگی اس کی مصیبتوں میں کمی نہیں آئے گی۔اور پھر زمینی حقائق کا ادراک بھی از خود کر لیا ہے کہ مسلمانوں کے سارے دکھوں کا علاج ان کے کامل اتحاد میں ہے اور وہ اس دوا کو استعمال کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔
تہذیبوں کے ٹکراؤ اور تاریخ سے امریکی دانشوروں کے فرار کی داستان کو حیدر قریشی نے بہت اچھے

انداز میں اجاگر کیا ہے اور اسے شاید کوئی ادیب ہی اس انداز میں پیش کر سکتا تھا۔ اپنے کالم ''تہذیبوں کا ٹکراؤ'' میں حیدر قریشی یوں رقمطراز ہیں:

''اگر یہ تہذیبی ٹکراؤ ہے اور صلیبی جنگ ہے تو اپنی تمام تر تباہ کاریوں کے ارتکاب کے باوجود امریکہ کے لئے یہ جنگ ہارنے کا امکان زیادہ ہے۔

اگر عام نظر سے دیکھا جائے تو تہذیبی سطح پر مغربی دنیا بالخصوص امریکہ اور برطانیہ کی سیٹلائٹ تہذیب صرف اسلامی دنیا پر ہی نہیں مشرق کے ایک بڑے حصے پر غالب آ چکی تھی اور مزید غالب آتی چلی جا رہی تھی۔اس سلسلے میں سامنے کی مثالیں یہ ہیں کہ سیٹلائٹ کے اس دور میں امریکی اور برطانوی میڈیا ہمارے اسلامی اور مشرقی ممالک میں ایک خاص اہمیت کر چکا تھا۔اس کے اثرات ہماری فلموں، ٹی پروگرامز سے لے کر ہماری عام زندگی تک گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ہم اپنے میڈیا کی اطلاعات کے مقابلہ میں امریکی اور برطانوی میڈیا کی اطلاعات پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے اور غیر محسوس طریقے سے مغربی تہذیب کی چکا چوند کے زیر اثر آتے چلے جا رہے تھے۔گلوبل کلچر کی ایک نامکمل سی شکل بھی بننے لگی تھی۔ پورے انسان کی بات کرنے والے نیک نیتی سے خوش تھے کہ اس کرۂ ارض پر سارے انسان کسی نسلی، قومی، مذہبی، رنگت کے فرق یا کسی اور فرق کی بنیاد پر نہیں بلکہ انسان ہونے کی بنیاد پر پہچانے جائیں گے۔اس طریقے سے اگر دیکھا جائے تو خود امریکی اور اس سے منسلک دوسرے ممالک کی تہذیب ہی غالب آتی جا رہی تھی۔امریکہ واضح طور پر کسی خون خرابہ کے بغیر تہذیبی جنگ میں فتح یابی کی طرف گامزن تھا۔ایک ایسی امریکی تہذیب فتح حاصل کر رہی تھی جس کے خود اپنے تہذیبی خدوخال ''تہذیب'' کے کسی بڑے پیمانے پر پورے نہیں اترتے تھے۔

لیکن جیسے ہی امریکہ نے افغانستان پر اسامہ بن لادن کے بہانے سے شدید حملہ کیا، خون خرابہ کرنے کے باوجود امریکہ تہذیبوں کی جنگ میں بہت پیچھے آ گیا ہے۔فلسطینیوں پر یہودی حکومت کے وحشیانہ حملوں نے اس تہذیبی جنگ میں امریکی شکست کے امکانات کو مزید واضح کر دیا ہے۔اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ اسرائیل جو کچھ فلسطینیوں کے ساتھ کر رہا ہے، وہ مکمل طور پر امریکی حمایت کے بعد کر رہا ہے۔پھر بھارت کے صوبہ گجرات کے انتہا پسند ہندوؤں کے عام اور مظلوم مسلمانوں پر وحشیانہ حملوں کے بارے میں امریکی حکومت کا ڈپلومیٹک انداز۔۔یہ

سب شاید اسی تہذیبی ٹکراؤ کا حصہ ہیں۔اسی کے نتیجہ میں پوری اسلامی دنیا کے عوام میں اسلامی تہذیب کے تحفظ کا وہ احساس بیدار ہونے کی امید ہے جو ایک عرصہ سے خود مغربی میڈیا کی سحر کاری میں کہیں سو کر رہ گیا ہے۔اسی لئے میں نے لکھا ہے کہ اگر امریکہ نے تہذیبی ٹکراؤ شروع کیا ہے تو اس نے خود اپنی اس جیت کو شکست کی راہ پر ڈال دیا ہے۔اسلامی تہذیب اور مشرقی تہذیب کی وسعت اور پھیلاؤ کے سامنے امریکی تہذیب جو اپنے تہذیبی عقب میں کسی قدیم ثقافت کے ثمرات سے بھی محروم ہے، کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔خیال رہے کہ بات ملکوں کی نہیں تہذیبوں کی ہو رہی ہے۔''

برصغیر پاک و ہند میں جو سنگین کشیدگی چلی آ رہی ہے: اس سلسلے میں حیدر قریشی نے ایک تجویز پیش کی ہے۔میری ذاتی رائے ہے کہ برصغیر کے عوام اور لیڈرز سبھی یورپ سے دو، تین صدیاں پیچھے ہیں۔ان کی تجویز پر عملدرآمد کے لئے اتنی صدیاں انتظار کرنا پڑے گا۔پھر بھی ان کی تجویز یا ان کا خواب دیکھ لیں:

''جنرل صدر ایوب خان نے ایک زمانے میں جواہر لال نہرو کو دوستی کی ایک ایسی پیش کش کی تھی جس کے نتیجہ میں انڈو پاک کی ایک طرح سے ڈھیلی ڈھالی کنفیڈریشن وجود میں آ سکتی تھی۔اس کے نتیجہ میں دونوں ممالک اپنی افواج میں بہت زیادہ کمی کر کے اپنے ملک کے غریب عوام کے حالات کو بہتر بنا سکتے تھے۔افسوس کہ نیک نیتی کے ساتھ کی جانے والی صدر ایوب خان کی ایک بہت اچھی پیش کش کو جواہر لال نہرو جیسے زیرک سیاستدان نے رد کر کے اپنی سیاسی بے بصیرتی کا ثبوت دیا۔اگر صدر ایوب خان کی اُس پیش کش کو خلوص دل سے قبول کر لیا گیا ہوتا تو آج برصغیر کے غریب عوام بہت خوشحال نہ سہی لیکن اچھی زندگی بسر کر رہے ہوتے۔

اب جو ایل کے ایڈوانی اور ان کے بعض ہمنوا گاہے بگاہے ''اکھنڈ بھارت'' کی بات کرتے ہیں، ان کی دھونس جمانے والی زبان کے باعث کشیدگی میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن ان کا خواب اس انداز سے کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔اگر ایل کے ایڈوانی نیک نیت کے ساتھ اور بھائیوں والی زبان میں صدر ایوب والی پیش کش کو اس بار اپنی طرف سے دہراتے تو اس سے نہ صرف کشمیر کا مسئلہ بھی باعزت طور پر اور برادرانہ طور پر حل ہو جاتا بلکہ انڈیا اور پاکستان کے بہت سارے مشترکہ مسائل کا مشترکہ حل تلاش کرنے میں مدد مل سکتی۔

میرے ذہن میں یورپی یونین کی طرز پر سارے سارک ممالک کے درمیان اشتراک کا منظر ایک خواب کی طرح آتا ہے۔ یورپ نے ایک عرصہ تک شدید نفرتوں کا بازار گرم کئے رکھا۔ کئی باہمی لڑائیوں کے ساتھ دو عالمی جنگیں بھی ہوگئیں۔ اتنا لڑنے مرنے کے بعد آخر سب کو جو بات سمجھ آئی اس کے نتیجہ میں یورپی یونین کا اتفاق اور اتحاد قائم ہو چکا ہے۔ اب صورتحال یہ ہے کہ کسی ملک کی سرحدوں کی سلامتی کو کسی سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ کسی ملک کی سرحدوں کے کسی حصہ پر کسی کا کوئی غاصبانہ قبضہ نہیں ہے۔ کسی کی طرف سے کوئی ایسا دعویٰ نہیں ہے۔ ہر ملک اپنی مکمل خودمختاری اور سلامتی کے ساتھ قائم ہے۔ اس کے باوجود حالت یہ ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں داخل ہوتے وقت یہی پتہ نہیں چلتا کہ ہم اب دوسرے ملک میں آ گئے ہیں۔

میرے نزدیک اس وقت انڈو پاک کا خاص طور پر اور سارے سارک ممالک کا عمومی طور پر اتحاد ہو جانا اس خطے کے لئے بابرکت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے کشمیر کے مسئلے کو منصفانہ طور پر حل کیا جائے، پھر ''اکھنڈ بھارت'' کی بڑکیں مارنے کے بجائے دوستانہ طور پر اور نیک نیت کے ساتھ پورے خطے میں پیار اور محبت کو فروغ دیتے ہوئے اتحاد کا کام شروع کیا جائے۔ انڈو پاک کے درمیان اعتماد کی بحالی اور جملہ نفرتوں کے خاتمہ کے لئے دونوں اطراف سے موثر اقدامات کئے جائیں تو سارک ممالک کا اتحاد محض خواب نہیں ایک حقیقت بن سکتا ہے۔ ایسی حقیقت جس سے اس خطے کے غریب عوام کی قسمت بدل سکتی ہے۔ لیکن اگر انڈیا اور پاکستان کے درمیان کشیدگی برقرار رہی اور فرقہ پرست قوتیں اپنی انانیت کا شکار رہیں تو پھر ان ممالک کو یورپی ممالک کی طرح زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں ملے گی۔ اگر ان کی اگلی جنگ ہوئی تو پھر دونوں ممالک کی مکمل تباہی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ کیونکہ دونوں ممالک ہی ایٹمی قوت رکھتے ہیں۔ لیکن یہ کیسی نفرت ہوگی جو دونوں ممالک کی تباہی کے بعد گواہی دے گی کہ انڈیا اور پاکستان کا جینا، مرنا ساتھ ساتھ تھا۔ محبت کے ایسے مقام پر ہوتے ہوئے دونوں ملک نفرت کی ایٹمی آگ میں جل گئے۔ بہتر ہوگا کہ ایسے وقت کے آنے سے پہلے ہی حقائق کا ادراک کر لیا جائے۔ اسی میں ہم سب کی، اس خطے کے تمام عوام کی بہتری اور بھلائی ہے۔''

درحقیقت حیدر قریشی کے سارے کالم پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں ان کے ایک انتہائی اہم اور فکر انگیز کالم ''انتہائی خطرے کی گھنٹی'' کا ایک حصہ پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ امریکہ کے ایک

تھنک ٹینک نے جب سعودی عرب کو ''بدی کا محور'' قرار دیا تو اس رپورٹ کا اہم حصہ پیش کرنے کے بعد حیدر قریشی نے اس کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ اہم نکتہ بھی پیش کر دیا۔

''امریکہ اب یہودی ایجنڈے پر عمل کرنے کے فائنل راؤنڈ میں داخل ہونے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں نے اپنے کالم زیرِ ذیلی عنوان ''تاریخ سے فرار کیوں؟'' میں واضح کیا تھا کہ گریٹر اسرائیل کے لگ بھگ نصف صدی پرانے نقشہ کے مطابق یہودیوں نے مکہ اور مدینہ کو بھی گریٹر اسرائیل کا حصہ بنا رکھا ہے۔ اور یہی امریکی تھنک ٹینک کی رپورٹ ریلیز کرنے کا دوسرا اور اہم مقصد ہے۔ عراق اور ایران سے نمٹنے کے بعد امریکہ اندازہ لگائے گا کہ اب وہ قلب اسلام پر حملہ کر دے یا نہیں؟

بہانہ تو اب امریکہ کے پاس گھڑا گھڑایا موجود ہے۔ جس ملک میں گھسنا ہو وہاں القاعدہ اور طالبان کو داخل ہوتے دیکھنے کا اعلان کر دیجئے اور پھر ان کے تعاقب میں اس ملک میں گھس جایئے۔ کون مائی کا لال آپ کو اس ''نیک کام'' سے روک سکتا ہے۔ یہ رویہ کسی بھی ملک کی خودمختاری کے خلاف براہ راست حملہ ہے اور بے شک امریکہ کو ایسے حملے کرنے کی عادت ہو چکی ہے۔ لیکن اگر امریکہ نے مستقبل کے یہودی عزائم کی تکمیل کے لئے درپردہ عملی اقدامات شروع کر دیئے ہیں تو پھر ''واشنگٹن پوسٹ'' کی مذکورہ بالا رپورٹ کو اس تناظر میں انتہائی خطرے کی گھنٹی سمجھ لینا چاہئے۔ لیکن یہ خطرے کی گھنٹی خود امریکہ اور اسرائیل کے لئے بھی تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔۔ خطرے کی گھنٹی آگے چل کر طبل جنگ بن سکتی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو امریکہ کی اپنی توقعات کے مطابق ہو سکتا ہے کہ وہ جیسے ساری دنیا میں دندناتا پھرتا ہے ویسے ہی عالم اسلام کے مقدس ترین مقامات کو بھی یہودی عزائم کے مطابق کر دے۔ لیکن اس کا دوسرا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ پورے عالم اسلام کی حکومتیں بے بس ہو جائیں اور پورا عالم اسلام ''ناقابل تسخیر'' سمجھے جانے والوں کی تاریخ اور جغرافیہ سب کچھ تبدیل کر کے رکھ دے۔

ابابیلوں کا ایک واقعہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ امریکہ کے جن ساٹھ دانشوروں نے بڑے پیمانے پر صدر بش کی جارحانہ پالیسیوں کی شدید الفاظ میں مذمت کی تھی وہ اس سے بھی زیادہ سخت لفظوں میں امریکی حکومت کو اس کے مستقبل کے ان مذموم عزائم سے روکنے کے لئے آواز بلند کرے گی تا کہ امریکی حکمران

مزید ایسے اقدامات نہ کریں جن سے دنیا کی مکمل تباہی کا خطرہ حقیقت بن جائے۔''

ساری عالمی صورت حال کے منظر اور پس منظر کو دیکھنے کے بعد حیدر قریشی عالمِ اسلام کے مستقبل کے طرزِ عمل کے سلسلے میں دو واضح راستے بیان کرتے ہیں۔ذاتی طور پر وہ مکمل زوال کے بجائے نئے سرے سے آغاز کرنا مناسب سمجھتے ہیں ان کی رائے ان کے الفاظ میں دیکھتے ہیں۔رقمطراز ہیں:

''عالمی امریکی کردار کے باعث مجھے ہمیشہ سوویت یونین روس کے ٹوٹنے کا افسوس رہے گا۔چند اسلامی ممالک کے سوا سارے اسلامی ممالک ہمیشہ سے امریکہ نواز رہے۔بے شک اس میں امریکہ کے بعض مثبت اقدامات اور دوستانہ رویوں نے بھی بنیادی کردار ادا کیا۔امریکہ سے دوستی اور محبت کا سلسلہ چلنا چاہئے تھا لیکن اتنا نہیں کہ اس دوستی میں اسلامی ممالک ''یک طرفہ عشق'' کے مقام تک پہنچ کر سوویت یونین سے مکمل بگاڑ پیدا کر لیتے۔گزشتہ نصف صدی میں سوویت یونین اور امریکہ کی سرد جنگ میں اسلامی ممالک نے نفسیاتی طور پر ہراول دستے کا کام کیا۔سوویت یونین کو خدا کا منکر کہہ کر اس کے خلاف مسلمانوں میں شدید نفرت پیدا کر دی گئی۔اتنی نفرت تو خود امریکی بھی سوویت یونین سے نہیں کرتے تھے۔پھر افغانستان کے مسئلہ پر جس طرح سارا عالم اسلام امریکہ کی سرپرستی میں متحد ہوا،ویسا اتحاد تو اب شاید ہی کبھی دیکھنے میں آسکے۔میرا خیال ہے کہ سوویت یونین قائم رہتا تو دنیا کے مختلف خطوں میں چھوٹی موٹی گڑ بڑ تو ہوتی رہتی لیکن دو بڑی طاقتوں کے درمیان کشمکش سے دوسرے ممالک نسبتاً محفوظ و مامون رہتے۔کم از کم اتنے برے حالات کبھی نہ ہوتے جیسے اب امریکہ کے ہاتھوں ہوتے جا رہے ہیں۔

اب عالم اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کے تمام مصائب اور دکھوں کا علاج اس کے مکمل اتحاد میں ہے لیکن یہ قوم ''اتحاد عالم اسلام'' کی دوا پینے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہے۔بڑی سطح کے اتحاد کو تو چھوڑیں۔۔۔۔ہر مقامی سطح پر بھی مسلمان اتنے تقسیم در تقسیم ہو چکے ہیں کہ ایک موثر علاج موجود ہونے کے باوجود بیماری کا علاج ممکن ہی نہیں ہے۔ایسے حالات میں کیا اسلامی ممالک باری باری امریکہ کا نشانہ بن کر ''افغانستان'' بنتے رہیں؟میرا خیال ہے کہ اگر سارے اسلامی ممالک نے افغانستان بننا ہے تو ایک ہی بار بن لیا جائے۔ورنہ مصلحت اور حکمت سے کام لے کر امریکہ سے کسی بھی الجھاوے سے بچنے کی کوشش کی جائے۔اور یہ جان لیا جائے کہ خصوصی طور پر گزشتہ نصف

صدی میں اسلامی ممالک کے حکمرانوں نے جو سنگین قائدانہ غلطیاں کی ہیں اب اگلی نصف صدی تک ان سب غلطیوں کا ادراک کرتے ہوئے ان کی موثر تلافی کی جائے۔اسلام کے آفاقی اصولوں کے مطابق اپنے شہریوں کو جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم کی سہولتوں سے لے کر علاج معالجہ اور بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی تک کو اپنی ترجیحات میں شامل کریں۔(بیشتر مغربی ممالک انہیں ''اسلامی اصولوں'' پر از خود عمل کر رہے ہیں)۔''

مسلمانوں کو امریکہ سے براہ راست الجھنے سے اجتناب کا مشورہ دینے کے ساتھ اسلامی ملکوں کے شہریوں کو بنیادی ضروریات اور سہولیات کی فراہمی پر توجہ مرکوز کرنے کا کہہ کر حیدر قریشی اسی کالم میں یہ بھی بتاتے ہیں کہ اگر اسلامی دنیا مصلحت آمیز خاموشی اختیار کر لے تو اس کے بعد امریکہ کا اصل ٹکراؤ یورپ کے ساتھ ہوگا اس بارے میں انہوں نے امریکہ،برطانیہ تعلقات،امریکہ،جرمنی تعلقات،امریکہ فرانس تعلقات کا تاریخی حوالوں سے تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

''امریکہ کو اب اصل چیلنج یورپ سے ملے گا اور امریکہ کا مقابلہ بھی یورپ ہی کر سکے گا۔اقتصادی میدان میں ''یورو'' نے پہلے ہی ڈالر کو زد پر لے رکھا ہے۔ڈپلومیٹک سطح پر امریکہ اب اپنے رویے میں بہتری لائے گا یا چڑ کر مزید جارحانہ انداز اختیار کر لے گا؟اس کا اندازہ جلد ہی ہو جائے گا۔وقتی طور پر اگر عالم اسلام اب خاموشی اختیار کر لے تو آنے والے وقت میں امریکہ اور یورپ کا ٹکراؤ ہی برابر کی ٹکر والا ہوگا۔لیکن کتنا اچھا ہو کہ امریکی دانشور اور عوام اپنی حکومت کو امن،محبت،عدل و انصاف اور بھائی چارے کی عالمی فضا قائم کرنے والا کردار ادا کرنے کے لئے زور دیں۔امریکہ دنیا کا بڑا بھائی یا باپ بننا چاہتا ہے تو اب کسی کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔اعتراض صرف اس بات پر ہوگا کہ اس بڑے بھائی یا باپ کو انصاف کرنا نہیں آتا۔اور بڑے کا جتنا ظرف بڑا ہونا چاہئے وہ اس کے بالکل برعکس ظرف کا مظاہرہ کر رہا ہے۔''

حیدر قریشی کی کالم نگاری اپنے عہد کے تکلیف دہ عالمی حالات کو اس کے تاریخی پس منظر سے سمجھنے کی ایک کاوش ہیں،ایسی کاوش جس میں انسانیت کے بہتر مستقبل کے لئے نئی راہوں کے لئے اشارے بھی دیئے گئے ہیں۔حیدر قریشی نے اپنے کالموں سے اپنی سیاسی بصیرت کا ثبوت دینے کے ساتھ یہ باور کرایا ہے کہ ادیب اپنے سماج سے لاتعلق نہیں ہوتا اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ خالص ادب اور صحافت ایک دوسرے سے قریب تو ہیں لیکن دونوں الگ الگ میدان ہیں۔

''اردو میں ماہیا نگاری''
اور حیدر قریشی

اختر رضا کیکوٹی

یوں تو حیدر قریشی نے غزل، نظم، انشائیہ اور افسانہ میں بھی طبع آزمائی کی اور اپنی صلاحیتوں کا بھرپور لوہا منوایا جس پر ان کی (تمام اصناف سخن میں) مطبوعہ کتب اور ان میں شامل مشاہیر ادب کی آراء شاہد ہیں لیکن (میرے نزدیک) ان کی صلاحیتوں کے اصل جوہر (ماہیے) میں کھلے۔ یہی وجہ ہے کہ اب ماہیے کے حوالے سے ہونیوالے مباحث ان کے ذکر کے بغیر ادھورے ہیں۔ حیدر قریشی ۱۹۹۰ء سے اب تک ماہیے کے حوالے سے اتنی خدمات سرانجام دے چکے ہیں کہ اب اگر آئندہ وہ ماہیے پر ایک لفظ بھی نہ لکھیں تو بھی مستقبل میں ماہیے پر قلم اٹھانے والا حیدر قریشی کی ماہیے سے متعلق ان خدمات کو کسی طور نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

اردو میں ماہیا نگاری کا آغاز ۳۰ء کی دھائی میں چراغ حسن حسرت اور ہمت رائے شرما کے ذریعے ہوا۔ اوّل الذکر نے تین ہم وزن مصرعوں کے ثلاثی نما ماہیے پیش کئے جبکہ موخر الذکر نے اصل پنجابی دھن کے مطابق دوسرے مصرعے میں ایک سبب کی کمی کا التزام کرتے ہوئے ماہیے تخلیق کئے۔

چراغ حسن حسرت اور ہمت رائے شرما کے بعد ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک کے عرصے میں استاد قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی نے ہمت رائے شرما کی طرح درست وزن کے مطابق جب کہ بشیر منذر، عبدالمجید بھٹی، منیر عشرت اور ثاقب زیروی نے چراغ حسن حسرت کی تقلید میں تین ہم وزن مصرعوں پر مشتمل ثلاثی نما ماہیے تخلیق کئے تاہم اس وقت نہ تو کسی نے ماہیے کے وزن کی بحث چھیڑی اور نہ ہی ماہیا نگاری کو تحریک کی صورت مل سکی۔

ماہیے کی تجدید کا آغاز ۱۹۸۳ء میں علی محمد فرشی کے تین ہم وزن مصرعوں پر مشتمل ثلاثی نما ماہیوں سے ہوا ان کے بعد نصیر احمد ناصر اور سیدہ حنا نے بھی اسی طرز کے ثلاثی نما ماہیے تخلیق کئے۔ پھر کیا تھا جو بھی آیا اپنی ثلاثیات کو ماہیے کے نام پر پیش کرنے لگا۔ نہ تو کسی نے ماہیے کے وزن کی طرف توجہ دی اور نہ ہی ان میں سے کسی کا خیال استاد قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی جیسے مشاہیر شعراء کے ماہیوں کی طرف گیا۔

ماہیے کی اصل تحریک کا آغاز ۱۹۹۰ء میں اس وقت ہوا جب ممتاز عارف نے "اوراق" میں ایک خط کے ذریعے ماہیے کے اصل وزن کی نشاندہی کی۔ یہیں سے حیدر قریشی نے ماہیے کے اصل مزاج ہیئت اور وزن کی تحریک کا بیڑہ اٹھایا اور شعراء کو مشورہ دینا شروع کیا کہ تین ہم وزن مصرعوں کے ثلاثی نما ماہیے تخلیق کرنے کی بجائے درست وزن یعنی دوسرے مصرعے میں ایک سبب کی کمی کا التزام کرتے ہوئے ماہیے تخلیق کریں۔ ابتداء میں تو ان کے مشورے کی طرف کسی نے بھی توجہ نہ دی اور اگر کسی نے توجہ دی بھی تو "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" کے مصداق حیدر قریشی کو ہی مطعون کیا۔ لیکن حیدر قریشی بھی ہار ماننے والے کب تھے۔ انہوں نے ابتداء ہی میں پتھر کھانے کے باوجود ماہیے کے درست وزن کو اجاگر کرنا شروع کر دیا چنانچہ ملک بھر کے ادبی رسائل میں انہوں نے ماہیے کے وزن کی بحث سے متعلق مضامین تواتر سے لکھنا شروع کر دیئے۔ ان کا موقف چونکہ حق پر مبنی تھا اس لئے انہیں یقین تھا کہ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں ایک نہ ایک دن ان کے موقف کی ضرور پذیرائی ہوگی چنانچہ تھوڑے عرصے بعد مختلف شعراء نے ماہیے کی ہیئت، مزاج اور وزن پر تحقیق کرنا شروع کر دی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اور تحقیق ہوتی گئی حیدر قریشی کے ہم خیال شعراء کی فہرست میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور آج حیدر قریشی اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
ہمسفر ملتے گئے اور کارواں بنتا گیا

آج ان کے موقف کو اس قدر پذیرائی مل چکی ہے کہ ماہیا نگار شعراء میں سے اسّی فیصد سے زائد شعراء نہ صرف ان کے ہم خیال ہیں بلکہ انہیں ماہیے میں بطور اتھارٹی تسلیم کرتے ہیں۔

حیدرقریشی نے ماہیے پر تخلیقی وتنقیدی ہر دو سطح پر کام کیا۔انہوں نے جہاں ماہیے پڑھنے والوں کو "محبت کے پھول" کا گلدستہ پیش کیا وہاں ماہیے کی ہیئت،مزاج اور وزن کو جانچنے،سمجھنے اور پرکھنے والوں کو "اردو میں ماہیا نگاری" جیسی تہلکہ خیز کتاب کا تحفہ دیا جو نئے ماہیا نگار حضرات کے لیے مشعل راہ کا کام دے رہی ہے۔حال ہی میں انہوں نے راقم کے نام ایک خط میں ماہیے کے حوالے سے ایک اور کتاب "اردو ماہیے کی تحریک" کی نوید سنائی (خط حیدرقریشی بنام اختر رضا کیکوٹی۔۲۹ اپریل ۱۹۹۸ء)۔ ہماری دعا ہے کہ خدائے ذوالجلال انہیں یہ کتاب جلد منظر عام پر لانے کی توفیق دے۔امید ہے کہ حیدرقریشی کی یہ کتاب اردو ماہیے کی تحریک کو مزید تقویت بخشے گی اور اردو ماہیے کے درست وزن کو مزید نکھار کر سامنے لائے گی۔

ماہیا ’’کتابِ دل‘‘ ہے۔اس کتاب میں ماہیے کی۔۔پنجابی اور اردو ماہیے کی مختصر سی کہانی کے ساتھ اس ’’کتابِ دل‘‘ کی چھوٹی سی تفسیر بھی کی گئی ہے،اس امید کے ساتھ کہ لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت۔۔۔ماہیے کے وزن اور مزاج کے سلسلے میں ایک واضح موقف رکھنے کے باوجود میں نے اپنے ذہن اور دل کے دروازے کو کھلا رکھا ہوا ہے، علمی اور ادبی سطح پر کوئی نئی بات مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کی جائے تو میں اسے قبول کرنے میں دیر نہیں کروں گا۔اسی طرح میں توقع رکھتا ہوں کہ اگر میرے موقف میں جان ہے تو علمی،ادبی مزاج رکھنے والے احباب اسے خوشدلی سے قبول کریں گے۔

(حیدرقریشی کی کتاب **اردو میں ماہیا نگاری** کے ابتدائیہ سے اقتباس)

’’اردو میں ماہیا نگاری‘‘ کا یہ اختتامیہ ماہیے کی بحث کا اختتام نہیں ہے بلکہ علمی،ادبی اور تحقیقی زبان میں بات کرنے والوں کے لئے ایک بڑی سطح پر یہ نقطۂ آغاز ہے۔مجھے امید ہے کہ ماہیے کے کدو کال کو نکھارنے اور سنوارنے کے لئے تخلیقی اور تحقیقی دونوں لحاظ سے مزید پیشرفت ہوگی۔پنجابی کا لوک گیت ماہیا اردو شاعری میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے ساتھ اردو کی ایک مقبول،توانا اور میٹھی شعری صنف کے طور پر نمایاں ہوگا۔

(حیدرقریشی کی کتاب **اردو میں ماہیا نگاری** کے اختتامیہ سے اقتباس)

اردو ماہیے کی تحریک

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

اردو ماہیا کو صحیح وزن دینے والی اوّلین اور سب سے زیادہ فعال شخصیت حیدرقریشی،کی یہ دوسری کتاب ہے جو مکمل طور پر ماہیا کے خدوخال واضح کرتی ہے اور بہت سے مباحث کا احاطہ کرتے ہوئے بعض یتیم اور عقل سے پیدل ناقدین اور حاسدین کو آئینہ دکھاتی ہے۔اس کتاب میں تنقیدی مضامین اور بعض خطوط کے جو عنوانات قائم کئے گئے ہیں ان سے کتاب کی اہمیت اور دلچسپی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

’’ماہیا اور اس کا دوسرا مصرعہ‘‘۔۔۔’’ماہیے کے وزن کا مسئلہ‘‘۔۔۔’’ماہیے کے بارے میں چند باتیں‘‘۔۔۔’’اردو میں ماہیا نگاری‘‘۔۔۔’’محبت کے پھول‘‘(پیش لفظ)۔۔۔’’خط بنام ایڈیٹر ’تجدید نو‘ لاہور‘‘۔۔۔’’خط بنام ایڈیٹر ماہنامہ ’صریر‘ کراچی‘‘۔۔۔’’اردو ماہیا ۱۹۹۶ء میں‘‘۔۔۔’’مدیران ’بھنگڑا‘ کے نام‘‘۔۔۔’’ماہیا اور چن ماہی‘‘۔۔۔’’اردو ماہیا ۱۹۹۷ء میں‘‘۔۔۔’’ماہیے کی کہانی‘‘۔۔۔’’ماہیا پابندِ لَے ہے‘‘۔۔۔’’حنائیے اور ماہیے‘‘۔۔۔’’خط بنام ایڈیٹر ’اوراق‘ لاہور‘‘۔۔۔’’اردو ماہیے کے بانی۔ہمت رائے شرما‘‘۔۔۔’’اردو ماہیے کی تحریک‘‘۔۔۔’’ایڈیٹر ’ایوان اردو‘ کے نام‘‘۔۔۔’’اردو ماہیا ۱۹۹۸ء میں‘‘۔۔۔اور ’’پنجابی لوک گیت ماہیے کی تحریری ہئیت‘‘

تخلیقی اور تحقیقی لحاظ سے ماہیے کی پیش رفت پر یہ کتاب نئے حقائق کو سامنے لاتی ہے۔عروضی اور تیکنیکی دریافت کے اصول بتاتی ہے۔اور اصولی موقف کی معقولیت کو تسلیم کراتی ہے۔

اردو ماہیے کی تحریک

اسماعیل گوہر

معروف نقاد،افسانہ نگاراور شاعر حیدر قریشی کی ۱۶۶صفحات کی یہ کتاب ماہیے سے متعلق تنقیدی مضامین اوران مطبوعہ وغیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے جو ماہیے کے وزن پر اپنا موقف واضح کرنے کے لئے مختلف جرائد کے مدیروں کے نام لکھے گئے ہیں۔کتاب میں سترہ مضامین اور پانچ خطوط شامل ہیں۔یہ خطوط اپنی نوعیت اور تنقیدی مواد کے لحاظ سے تنقیدی مضامین ہی کا درجہ رکھتے ہیں۔
انتساب ہمت رائے شرما کے نام ہے جو مناظر عاشق ہرگانوی کی تحقیق کی رُو سے اردو ماہیے کے بانی ہیں۔مگر یہ امر ابھی تحقیق طلب ہے کہ ہمت رائے شرما نے فلم ’’خاموشی‘‘ کے لئے اردو ماہیے پہلے لکھے تھے یا چراغ حسن حسرت نے فلم باغباں کے لئے ان سے پہلے ہی ماہیے لکھ چکے تھے۔
جب ہمت رائے شرما خود یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ فلم ’’خاموشی‘‘ ۱۹۳۹ء میں آئی جبکہ ’’باغباں‘‘ میں حسرت کے ماہیے ۱۹۳۷ء میں آ چکے تھے تو پھر دیگر ثبوت فراہم کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟ بظاہر ضرورت محسوس نہ بھی ہو مگر حیدر قریشی کا موقف بھی آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔کیونکہ بقول ان کے ’’اصل حقائق تو اپنی جگہ موجود ہیں‘‘۔اوران کا یہ بھی دعویٰ ☆ ہے کہ وہ اس سلسلے میں ٹھوس شواہد جمع کر چکے ہیں۔ٹھوس شواہد کے آنے پر ہی اوّلیت کا فیصلہ ہو سکے گا۔
کتاب کے مختلف مضامین میں ماہیا نگاری میں اوّلیت کے علاوہ لفظ ماہیا کے معانی، ماہیے کی دھن،اور وزن پر مختلف نقادوں کی آراء اور تحقیق سے حیدر قریشی نے بحث کی ہے۔جس طرح بعض نقادوں نے حیدر قریشی کی آراء سے اپنی مرضی کے معانی و مفاہیم برآمد کرنے کی کوشش کی ہے،خود حیدر قریشی بھی کہیں کہیں اس رویے سے مکمل طور پر اپنے آپ کو بچا نہیں سکے۔اس طرح ماہیے کی تحریک کو آگے بڑھاتے ہوئے ذاتیات کی ایک رو بھی ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔
دوسرے مصرعے میں ایک سبب کم کو اصل ماہیا تسلیم کرنے والے دوسرے کسی بھی وزن کے ماہیے کو

سرے سے ماہیا ہی ماننے پر تیار نظر نہیں آ رہے۔ایک حلقہ مساوی الوزن مصرعوں کو درست قرار دے رہا ہے۔نقادوں کا ایک حلقہ ہر دو وزن کو ماہیا قرار دے رہا ہے۔کیونکہ ان کے خیال میں مساوی الوزن مصرعوں کے ماہیے بھی اصل پنجابی ماہیے کی دھن پر گائے جا سکتے ہیں اور گائے گئے ہیں۔ان ہی نقادوں کا موقف آگے چل کر مفاہمت اور اردو ماہیے کے لئے کھلے موسموں کی بشارت بھی دے سکتا ہے۔کتاب میں شامل مضامین تینوں آراء کے جائزے اور تجزیے پر مشتمل ہیں۔
حیدر قریشی نے تخلیقی وتنقیدی دونوں لحاظ سے ماہیے کی تحریک کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔وہ اپنے موقف کو ہر فورم پر مضبوط ثابت کرنے کی انفرادی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اپنے موقف کے حامی ماہیا نگاروں اور نقادوں کو منظّم رکھنے میں بھی بڑے سرگرم رہے ہیں اور ناوک حمزہ پوری نے انہیں بجا طور پر ماہیے کا پیر دستگیر کہا ہے۔

☆**نوٹ از مرتب:**
مذکورہ ٹھوس شواہد حیدر قریشی کے بعد کے ان مضامین میں شائع ہو چکے ہیں
ا۔پیش لفظ کتاب ’’اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما‘‘ از حیدر قریشی
۲۔’’مرزا صاحب کے جواب میں‘‘ مطبوعہ ’’جدید ادب‘‘ جرمنی، شمارہ مئی ۲۰۰۰ء

اگر ہمارا موقف مضبوط ہے تو سنجیدہ اختلاف رائے رکھنے والوں سے لے کر حاسدین تک۔۔۔ہر ایک کے لب و لہجے کے مطابق،اسی انداز میں اپنے موقف کی وضاحت کرتے رہیں گے۔اس مجموعے میں بھی ایسی مدلل وضاحتیں موجود ہیں۔۔میں اپنے موقف کو پورے اعتماد کے ساتھ ادبی دنیا کے سامنے پیش کرتا ہوں اور ادبی تاریخ کے سپرد کرتا ہوں۔
(حیدر قریشی کی کتاب **اردو ماہیے کی تحریک** کے حرف اوّل سے اقتباس)

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما

بیگم وسیم راشد

حیدر قریشی کا نام ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں وہ ایک کامیاب افسانہ نگار، ایک حساس شاعر، ایک منفرد طرز کے خاکہ نگار اور کامیاب محقق ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب اگر ادبی زاویے سے پرکھی جائے تو ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں انہوں نے ہمت رائے شرما کو اردو ماہئے کا بانی قرار دیا ہے۔ اور مختلف دلائل سے انہوں نے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی بھی ہے۔ ان کی اس کتاب میں جو ترنم ریاض کے خوبصورت ماہئے سے شروع ہوتی ہے تقریباً 6 مضمون ہیں جس میں ہمت رائے شرما کی 4 کتابوں پر حیدر قریشی نے تعارفی مضمون لکھے ہیں۔ اپنے پہلے مضمون میں جو حقیقتاً ایک نیا انکشاف ہے انہوں نے صاف طور پر یہ واضح کر دیا ہے کہ ابھی تک تحقیق کے حساب سے قمر جلال آبادی اردو ماہیے کے بانی تھے لیکن ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تازہ تحقیق تمام شواہد اور حقائق کی بنیاد پر یہ حقیقت ظاہر کرتی ہے کہ قمر جلال آبادی اور ساحر لدھیانوی سے پہلے اردو ماہیے کے درست وزن کا اولین اظہار ہمت رائے شرما نے 1936ء میں کیا تھا جو فلم ''خاموشی'' کے لیے لکھے گئے تھے۔ فلم ''خاموشی'' کی بک لیٹ پر مئی 1936ء کا اندراج بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ ماہیے پہلی بار 1936ء میں فلم خاموشی کے لیے لکھے گئے تھے خود ہمت رائے شرما نے حیدر قریشی کے نام اپنے خط میں لکھا ہے۔

"یہ سبھی ماہیے فلم خاموشی کے لیے ہی لکھے گئے تھے اور یہ سب کے سب میری کتاب شہاب ثاقب کے صفحہ نمبر 85 اور 86 پر درج ہیں۔

1- اشکوں میں روانی ہے
آنسو پی پی کر
مدہوش جوانی ہے

2- سرمست فضائیں ہیں
پیتم پریم بھری
پھاگن کی ہوائیں ہیں

3- کچھ کھو کر پاتے ہیں
یاد میں ساجن کی
یوں دل بہلاتے ہیں

میاں آزاد کا سفر نامہ، شرما کی ''فسانۂ آزاد'' کی بہت کامیاب پیروڈی ہے۔ جس میں شرما نے پنڈت رتن ناتھ سرشار کے اسلوب کو نئے زمانے کے لحاظ سے بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔ یہ پیروڈی ہمت رائے شرما کو ایک کامیاب مزاح نگار اور زبان پر قدرت رکھنے والا کامیاب ادیب بناتی ہے اس پیروڈی کی ایک جھلک دیکھئے۔

" میاں وہ نازک اندام و گلفام۔ تو نامراد و ناکام۔ وہ اپنے حسن و جمال پر مغرور تو شراب عاشقی کے نشے میں چور"

''ہمت رائے شرما کی شاعری ایک تعارف'' میں حیدر قریشی نے شرما کے شعری مجموعہ شہاب ثاقب پر بہت ہی معلوماتی مضمون دیا ہے اس مجموعہ میں ان کی غزلیں، نظمیں، گیت، ماہیے اور ان کا فارسی کلام بھی شامل ہے۔ مجھے ایک بات بڑی عجیب لگی کہ ہمت رائے شرما نے حالانکہ بڑی خوبصورت شاعری کی ہے لیکن عام آدمی تک ان کا نام نہیں پہنچا حیدر قریشی انہیں کئی شاعروں سے معتبر اور اہم مانتے ہیں۔

ہمت رائے شرما کی دو کتابوں ''ہندو، مسلمان'' اور ''نکات زباندانی'' کا بھی حیدر قریشی نے تعارف کرایا ہے جس میں سے ایک ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے اور دوسری لسانیات کے موضوع پر ہے ان کے افسانوں کا محور ہندو مسلم اتحاد اور بھائی چارہ ہے اور دونوں کے بیچ نفرت ختم کر کے محبت کو فروغ دینا ان کا مقصد ہے۔

اس کتاب کی طباعت بے حد عمدہ و پرکشش ہے کاغذ بہت نفیس استعمال ہوا ہے۔ کتاب کی قیمت بہت مناسب ہے ادب میں یہ کتاب ایک قابل قدر اضافہ ہے حیدر قریشی کے بارے میں تو خود ہمت رائے نے ماہیے کے ذریعے بہت خوبصورت خراج تحسین پیش کیا ہے۔

فن میں لاثانی ہیں
حیدرؔ ''ماہیے کی
تحریک'' کے بانی ہیں

حمید نسیم نے اپنی کتاب ''ناممکن کی جستجو'' کے صفحہ ۴۴ اور ۴۶ پر جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ ڈاکٹر تاثیر جنوری ۱۹۳۶ء میں ایم اے او کالج امرتسر میں پرنسپل بن کر آئے۔ انہوں نے آتے ہی ایک مشاعرہ برپا کرایا جس میں صوفی تبسم، پنڈت ہری چند اختر، مولانا سالک اور چراغ حسن حسرت کو لاہور سے مدعو کیا گیا۔ اسی مشاعرہ میں حسرتؔ نے اپنے مشہور مبینہ ''ماہیے'' پہلی بار سنائے۔ اس بیان کے مطابق حسرتؔ نے اگر جنوری ۱۹۳۶ء میں ''ماہیے'' سنائے ہیں تو ان کا سالِ تخلیق بھی کم از کم جنوری ۱۹۳۶ء بنتا ہے۔ یوں انہیں زمانی طور پر شر ماجی پر فوقیت مل سکتی ہے۔ لیکن ایک اور حوالہ ملنے سے حسرتؔ کا سالِ تخلیق تو ۱۹۳۶ء رہتا ہے لیکن انہیں شر ماجی پر زمانی فوقیت نہیں رہتی۔ ہر لحاظ سے شر ماجی کو ان پر فوقیت رہتی ہے۔ اور وہ حوالہ ''مسلم انڈینز آف بائیوگرافیکل ڈکشنری'' از احمد سعید ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری، ایم اے او کالج لاہور کا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ نمبر ۳۲۷ پر ڈاکٹر تاثیر کے جو کوائف درج کئے گئے ہیں ان میں یہ واضح طور پر درج ہے کہ ڈاکٹر تاثیر نے ایم اے او کالج امرتسر کے پرنسپل کی حیثیت سے ۲۰ مئی ۱۹۳۶ء کو کام شروع کیا۔ سو اگر انہوں نے آتے ہی مشاعرہ کرایا اور اس سلسلے میں آٹھ دس دن لگ گئے تو مشاعرہ کا مہینہ جون بنے گا۔ اگر حسرتؔ نے جون ۱۹۳۶ء میں ماہیے سنائے تو یہ ''خاموشی'' کے گیت تخلیق ہونے اور بک لیٹ چھپنے کے بعد کی بات ہو جاتی ہے۔ تاہم اس سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ حسرتؔ نے اپنے ''ماہیے'' ۱۹۳۶ء میں تخلیق کئے تھے اور یہ ۱۹۳۷ء میں فلم 'باغباں' میں شامل بھی کر لئے گئے تھے۔

(حیدر قریشی کے مضمون **مرزا صاحب کے جواب میں** سے اقتباس
مطبوعہ ''**جدید ادب**'' جرمنی۔ شمارہ مئی ۲۰۰۰ء۔ صفحہ نمبر ۴۷)

''وزیر آغا۔۔۔عہد ساز شخصیت''

صفدر رضا صفی

شخصیات کے عہد ساز ہونے یا نہ ہونے کا قطعی فیصلہ یقیناً وقت ہی کے ہاتھوں میں ہے لیکن ہر گزرتا ہوا لمحہ اپنے تئیں شخصیات سے متعلق کچھ مواد تاریخ کے سپرد کرتا رہتا ہے تاکہ آنے والے وقت کو فیصلہ کرنے میں دقت اور دشواری محسوس نہ ہو۔ اس گزرتے ہوئے لمحے کے فطری نظام کار میں بعض اوقات ارد گرد سے اڑائی جانے والی غیر مصدقہ افواہیں اور عدم واقفیت پر مبنی بیانات عارضی تعطل پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن اس زمانے کے فہیم اور زیرک اہلِ نظر فوراً تاریخ کے قدرتی بہاؤ میں پیدا ہونے والے اس غیر ضروری اور گمراہ کن بھنور کا ادراک کر لیتے ہیں اور اپنا فریضہ ادا کرتے ہوئے تاریخ دانوں اور دوسرے اہل علم تک اصل حقائق پہنچاتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ہر سطح پر بالعموم اور ادبی منظر نامے پر بالخصوص کم و بیش یہی صورت حال رہی ہے۔ ہر دور کسی ادیب یا شاعر کی تکذیب اور تعریف کے دوراہے پر کھڑا نظر آتا ہے۔ عہدِ حاضر میں ڈاکٹر وزیر آغا کو اسی صورت حال کا سامنا ہے۔ ان کی موافقت اور مخالفت میں جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اس بات کو تو یقینی بناتا ہے کہ ان کی شخصیت نظر انداز ہرگز نہیں کی جا سکتی لیکن پھر بھی مخالفین کی طرف سے اڑائی جانے والی گرد کو صاف کرنے اور حقیقتِ حال کو اجاگر کرنے کے لئے دستاویزی ثبوت پیش کرنا ضروری ہو جاتے ہیں۔

حیدر قریشی صاحب کی تازہ کتاب ''وزیر آغا۔ عہد ساز شخصیت'' بھی ایک ایسے ہی دستاویزی ثبوت کی حیثیت رکھتی ہے، جسے نہ صرف آنے والا وقت ایک حوالے کے طور پر استعمال کرے گا بلکہ نسلِ نو بھی بعض شخصیات کے علمی و ادبی قد کو متعین کرتے ہوئے اس کتاب سے مدد لے گی۔ حیدر قریشی صاحب نے کتاب کے عنوان کو بیان ہرگز نہیں بننے دیا۔ بلکہ اپنے عالمانہ مضامین سے یہ اثبات مہیا کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ادبی کام کے تناظر میں انہیں عہد ساز شخصیت قرار

دینا بالکل درست ہے۔

قریشی صاحب نے وزیر آغا کی خود نوشت سوانح ''شام کی منڈیر سے'' سے لے کران کی نظموں کے تجزیاتی مطالعات، شعری کلیات، تنقید اور آغا صاحب کی غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے جس اعلیٰ قرأت کا ثبوت دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کتاب کا سب سے اہم مضمون ''اردو انشائیہ اور اس کے بانی کی انشائیہ نگاری'' ہے۔ اس لئے کہ اس مضمون میں حیدر قریشی صاحب نے اردو انشائیہ کو اس صنف کے رائج کرنے والی اوّلین شخصیت کی ذاتی تخلیقات کی روشنی میں دیکھا ہے۔ اور یہ زاویہ نگاہ یقیناً لائقِ تحسین ہے۔ کیونکہ آغا صاحب نے بذاتِ خود جس سطح پر انشائیہ کے مزاج کو مس کیا ہے اسے منظر عام پر لایا جانا چاہئے تھا، تاکہ نئے انشائیہ نگار یا قارئین انشائیہ اس صنف کے محاسن کا صحیح ادراک کر سکیں۔

''وزیر آغا۔ عہد ساز شخصیت'' پڑھنے کے بعد قاری۔۔۔حیدر قریشی صاحب سے ایک نیا تعارف حاصل کرتا ہے اور قریشی صاحب کا یہ تعارف ایک منجھے ہوئے اور متوازن ادبی نقاد کا تعارف ہے۔ امید کی جانی چاہئے کہ قریشی صاحب دیگر ادباء کے مطالعات سے بھی قارئین کو نوازیں گے۔

ساختیاتی فکر کے حوالے سے اور اردو تنقید کے وسیلے سے ڈاکٹر وزیر آغا کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ انہوں نے دوسرے ساختیاتی دانشوروں کی طرح مغربی لکیر کی فقیری نہیں کی، اور اس کی دانشورانہ چکاچوند سے مرعوب نہیں ہوئے۔۔ بلکہ اس کا سنجیدگی سے جائزہ لیا ہے اور اس کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ اس کے اس عیب کو بھی واضح کیا ہے کہ اس ڈسپلن نے تخلیق کار کو یکسر نظر انداز کر کے انتہا پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ ساختیاتی فکر سے مناسب حد تک استفادہ کے باوجود وزیر آغا۔۔ مصنّف، تصنیف اور قاری کے رشتوں میں توازن قائم کرتے ہیں۔ جدید اردو تنقید ایک عرصہ تک وزیر آغا کی فکر اور تنقید سے رہنمائی حاصل کرتی رہے گی۔

(حیدر قریشی کی کتاب **وزیر آغا عہد ساز شخصیت** کے صفحہ نمبر ۱۵۲، پر انکے مضمون **ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید نگاری کا اجمالی جائزہ** سے اقتباس)

حیدر قریشی کی ادبی زندگی کے بالکل ابتدائی ایام میں

انتظار حسین کے دو دلچسپ کالم

لاہور نامہ: انتظار حسین

ایک شہر اور تیرہ ادبی انجمنیں

تقریبِ تعزیت کے بعد نئی زندگی اور نئی تقریبیں

حلقہ اربابِ ذوق خانپور کے سیکرٹری نشر و اشاعت اے کے ماجد صاحب نے ہمیں طعن و تشنیع سے بھرا خط بھیجا ہے اور پوچھا ہے کہ آخر لاہور اور پنڈی کے حلقوں کو مشرق کے ادبی صفحہ پر اتنا کیوں اچھالا جا رہا ہے اور خانپور کو کیوں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ موصوف نے جب خانپور کی ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ "خانپور ادبی لحاظ سے ضرورت سے زیادہ زرخیز ہوا ہے۔ یہاں مجموعی طور پر تیرہ ادبی تنظیمیں ہیں" تو ہم شرمندہ ہوئے اور سوچنے لگے کہ پنڈی کجا لاہور بھی خانپور کے آگے کیا بیچتا ہے۔ اے کے ماجد صاحب نے مزید لکھا ہے کہ "اس مہینے کا سب سے اہم فنکشن وہ خصوصی شعری نشست تھی جو "نئی قدریں" کے مدیر اور سندھ کے بابائے اردو جناب اختر انصاری اکبرآبادی کے اعزاز میں دی گئی تھی۔ سیکرٹری کے فرائض حلقہ کے سیکرٹری حیدر قریشی نے انجام دیئے۔ انہوں نے مشاعرے سے پہلے جناب اختر انصاری اکبرآبادی کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہا۔ جملہ شعرائے کرام کے اسماء درج ذیل ہیں۔ اختر انصاری اکبرآبادی، پروفیسر سید نردوش ترابی، فیض احمد فیض (سرائیکی)۔۔۔۔۔۔۔"

اس تقریب کی اہمیت سے جو انکار کرے وہ کافر۔ بابائے اردو اختر انصاری اکبرآبادی ان ادیبوں میں سے ہیں جو اپنے اعزاز میں تقریبیں منعقد کرانے سے کبھی نہیں تھکتے۔ ایک زمانہ ایسا آیا تھا جب ان کے اعزاز میں ہر قسم کی تقریب منعقد ہو چکی۔ بس ایک تقریب تعزیت باقی رہ گئی تھی، انہوں نے آخر وہ بھی منوالی۔ کسی اخبار میں ان کے انتقال کی خبر نکلی۔ سندھ کے کئی شہروں میں تعزیتی جلسے ہوئے۔ جب سارے تعزیتی جلسے ہو چکے اور سندھ کے شہر شہر بابائے سندھ کو خراج

عقیدت پیش کیا جا چکا تو خبر آئی کہ بابائے سندھ زندہ ہیں۔ آدمی مر کر زندہ ہو تو یہ خود ایک بڑی تقریب ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ پھر تقریبیں شروع ہو گئیں۔ ہم نے بھی اس تقریب سے کالم لکھا۔ پہلے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کی۔ پھر مر کر زندہ ہو جانے پر مرحوم کی خدمت میں ہدیہ تہنیت پیش کیا۔ یہ سب کچھ ہو چکا ہے اور موت و زندگی دونوں حوالوں سے ہم بابائے سندھ کا ذکر خیر کر چکے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اب ہم کیا کریں۔ ادیب کو خراج تحسین پیش کرنے کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔ آدمی داد کے ڈونگرے کہاں تک برسائے اور عقیدت کے پھول کتنے نچھاور کرے۔ اختر انصاری اکبر آبادی کے اتنے یوم منائے گئے ہیں۔ کہ انہیں اکٹھا کر کے دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہم موصوف کا سال منا چکے ہیں۔ اب بتائیے کہ اس سے آگے کیا ہو سکتا ہے۔

اختر انصاری اکبر آبادی کے خانپوری یوم میں تو فیض احمد فیض نے بھی شرکت کر لی۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ فیض احمد فیض اردو والے نہیں بلکہ سرائیکی والے ہیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کونسی زبان کے فیض احمد فیض ہیں اور ہم میں لسانی تعصب تو ہے نہیں کہ ہم سرائیکی کے فیض احمد فیض کو اردو کے فیض احمد فیض سے کمتر سمجھیں۔

(روزنامہ **"مشرق" لاہور مورخہ ۹/دسمبر ۱۹۷۶ء**)

لاہور نامہ: انتظار حسین

شاعر کے مداح ہم سے خفا ہو گئے

شام مناؤ اور خوش رہو

خانپور کے حلقہ ارباب ذوق نے ابھی تک ہمیں بخشا نہیں ہے۔ حالانکہ اس کے سیکرٹری صاحب کے افکار عالیہ بھی مشرق کے ادبی صفحہ پر شائع ہو چکے ہیں☆ اور ہم نے بصد خلوص اس شام پر بھی اپنے تاثرات قلم بند کر دیئے ہیں جو اختر انصاری اکبر آبادی کے ساتھ منائی گئی۔ اب دیکھئے سیکرٹری صاحب حلقہ ارباب ذوق خانپور اپنے مکتوب میں کیا فرماتے ہیں۔

محترم انتظار حسین صاحب! السلام علیکم اے کے ماجد کے خط کے جواب میں آپ کا کالم پڑھا۔ آپ نے اے کے ماجد کے خط پر **طعن و تشیع کا الزام لگایا ہے میں اس پر جوابی** طعن و تشنیع کا الزام لگانے کی بجائے اسے آپ کے مخصوص انداز

نگارش کی کرشمہ سازی قرار دوں گا۔ اے کے ماجد کا مقصد صرف اتنا تھا کہ چھوٹے شہروں کی ادبی تنظیموں کی رپورٹیں بھی مشرق کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہونی چاہئیں۔ جہاں تک خانپور کی تیرہ ادبی انجمنوں کا ذکر ہے میرے خیال میں انہوں نے خود بھی طنزیہ انداز میں اس کا ذکر کیا تھا مگر اس حصے کو حذف کر کے آپ نے طنزیہ ذکر کو اپنے کھاتے میں ڈال دیا۔ یہ بات تو ہم بھی کہتے ہیں کہ تیرہ میں سے ایک دو کے سوا باقی سب کی حالت یہ ہے کہ "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے"۔ اختر انصاری اکبر آبادی کا آپ نے جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ آپ کا اور اختر انصاری کا آپس کا معاملہ ہے مگر انتظار صاحب! یقین کیجئے لاہور کے دانشور بھی پیچھے نہیں ہیں۔ میں نام نہیں بتانا چاہتا آپ کے لاہور کے بعض ادیب و شاعر بھی دوسرے شہروں میں اپنے ساتھ شامیں منوانے کے لئے بے چین ہیں۔ اس سلسلے میں بڑے خوبصورت انداز میں لکھے گئے کچھ خطوط میرے پاس بھی آئے ہیں۔ میرے خیال میں ہر ادیب و شاعر کو پبلسٹی کا شوق ہوتا ہے اب اگر وہ اس کے اظہار میں بڑے ''ادبی بتوں'' کی طرح سلیقہ سے کام نہیں لیتے تو آپ کو ناراض نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ویسے ماجد نے ایک اور بات کا بھی ذکر کیا تھا جسے آپ بالکل گول کر گئے "ادب نئے ذرائع ابلاغ کے نرغے میں" کے سلسلے میں اعجاز بٹالوی کا مضمون چھپتے ہی میں نے جوابی مضمون بھجوایا تھا جو ابھی تک بڑے شہر کے بڑے ناموں کی بھینٹ چڑھا ہوا ہے۔ ماجد صاحب نے اس سلسلے میں بھی کچھ لکھا تھا مگر میرا خیال ہے کہ یہ مضمون بڑے شاعروں اور ادیبوں کے نرغے میں رہے گا۔☆ فیض احمد فیض (سرائیکی) کے بارے میں پڑھ کر خاصا مزہ آیا۔ آپ کی اطلاع کے لئے تحریر ہے کہ یہاں "جگر" بھی رہتے ہیں۔ "حسرت" بھی تشریف فرما ہیں اور "خلیل قیصر" بھی قیام پذیر ہیں مگر یقین کیجئے کہ "حلقہ ارباب ذوق خانپور" کا ان سے کوئی تعلق نہیں بلکہ بیشتر ادبی انجمنیں حلقہ کو تسلیم ہی نہیں کرتیں اب یہ الگ بات ہے کہ سال میں ان ادبی انجمنوں کا ایک فنکشن بھی نہیں ہوتا۔ خط ختم کرنے سے پہلے آپ کا کالم ایک بار پھر پڑھنے بیٹھ گیا تھا اور اب مجھے اتنی گستاخی کی اجازت ضرور دیجئے کہ آپ نے اے کے ماجد کے حوالے سے خانپور کا ذکر صرف اس لئے کیا ہے کہ اختر انصاری کے بارے میں اپنے مخلصانہ جذبات کا اظہار کر سکیں۔

والسلام نیاز مند حیدر قریشی سیکرٹری حلقہ اربابِ ذوق خانپور

خانپور کے حلقہ کے سیکرٹری صاحب نے ہمارے خلوص کی قدر نہیں کی۔ ہم نے کس

خلوص سے اختر انصاری اکبر آبادی کی شام پر اپنے تاثرات نچھاور کئے تھے۔موصوف نے ہمارے خلوص میں طنز نکال لیا۔خیر ان کی کیا شکایت، اپنے شہر میں بھی یہی ہوتا ہے ہم بصد خلوص خراج تحسین پیش کرتے ہیں یار لوگ اس میں طنز ڈھونڈ نکالتے ہیں۔حیدر قریشی صاحب نے یہ جانا کہ اختر انصاری اکبر آبادی کی شام ہماری نظروں میں کھٹک رہی ہے اور پھر ہمیں طعنہ دیا ہے کہ تمہارے شہر لاہور کے کتنے ہی ممتاز ادیب اپنے منہ سے اپنی شام منوانے کی خواہش کا اظہار کر چکے ہیں۔انہوں نے ہمیں دھمکی دی ہے یا اکسایا ہے کہ اگر اس مسئلہ کو کالم کا موضوع بنانا چاہتے ہو تو ہم ان ادیبوں کے اسمائے گرامی کا انکشاف کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔حیدر قریشی صاحب شاید حلقہ کے نئے نئے سیکرٹری ہوئے ہیں۔انہیں شاید اس عہدے کی نزاکتوں کا احساس نہیں ہے۔ادبی جماعت کا سیکرٹری اور ادبی رسالہ کا ایڈیٹر ان دو کو ادیبوں کی ایسی چٹھیاں پہنچا ہی کرتی ہیں لیکن جماعت کا اچھا سیکرٹری وہ ہوتا ہے اور رسالہ کا بھلا ایڈیٹر وہ ہوتا ہے جو ایسی چٹھیاں اور ایسی التجائیں پی جانے کا ظرف رکھتا ہے۔

حیدر قریشی صاحب سے ہماری گذارش ہے کہ بے شک وہ اختر انصاری اکبر آبادی کی ایک اور شام منالیں لیکن لاہور کے ادیبوں کو جھنڈے پر نہ چڑھائیں۔شام منوانے کی خواہش ایک معصومانہ خواہش ہے ہم نے اختر انصاری اکبر آبادی کے سلسلہ میں ہمیشہ اس خواہش کی قدر کی ہے۔زیادہ سے زیادہ تھوڑا سا مسکرا لئے۔لاہور کے یاروں نے اگر ایسی خواہش کا اظہار کیا ہے تو اس خواہش کو پورا کیا جائے یا نہ کیا جائے مگر اس کا احترام ضرور کیا جائے۔

(روزنامہ مشرق لاہور مورخہ ۲۳دسمبر ۱۹۷۶ء)

☆ **نوٹ از مرتب:** انتظار حسین نے حیدر قریشی کا خط چھاپنے سے پہلے ان کا مذکورہ جوابی مضمون ''ادب نئے ذرائع ابلاغ کے نرغے میں'' اسی خط کے نتیجہ میں مشرق کے ادبی ایڈیشن میں چھاپ دیا اور اپنے کالم میں اس مضمون کا چھاپنا بھی جتا دیا۔مذکورہ مضمون ۹ردسمبر سے ۲۳ دسمبر ۱۹۷۶ء کے درمیان کی کسی تاریخ میں ''مشرق'' لاہور کے رنگین ادبی صفحہ پر شائع کیا گیا تھا۔تب میں بھی حلقہ خانپور کے اراکین میں شامل تھا۔ہم سب ان کالموں سے بہت لطف اندوز ہوئے تھے۔انہیں شامل کرتے ہوئے مجھے ربع صدی پہلے کا وہ زمانہ پھر یاد آ گیا ہے۔نذر خلیق)

بعض ادبی کتب میں حیدر قریشی کا ذکر

غالب کے نئے خطوط: ڈاکٹر انور سدید

☆☆☆☆ ''پاکستان میں ایک مقام دور افتادہ ہے۔اسم گرامی اس کا خانپور ہے۔اس شہر پر گذشتہ برس ایک آفت طوفانِ بادو باراں نے ڈھا دی تھی۔ وہاں میرا ایک جلیسِ سخن حیدر قریشی رہتا ہے ۔اگر آفت سماوی سے محفوظ ہو تو اس کا حال دریافت کر کے لکھو۔ ایک پرچہ الموسوم بہ "جدید ادب" اس نے چھاپا تھا تمہارا ہم مزاج، ہم کار اور ہم مشرب نظر آیا کہ شاعرات کو بخط جلی چھاپتا ہے۔اخبار امروز میں لکھا تھا کہ اس نے ایک مشاعرہ شاعرات کا مرتب کیا صدارت اس کی وزیر آغا سے کرائی موصوف تمام عرصہ گردن جھکائے بیٹھے رہے گویا قیامت کے سامنے رہے ۔اے میاں حیدر قریشی تم اس مشاعرے میں غالب کو مدعو کرتے۔حبیب لبیب اظہر جاوید کو بلاتے پھر مشاعرے کی بہار دیکھتے۔سنا ہے کہ "جدید ادب" کی ہیئت اور معنویت میں اب تبدیلی آ گئی ہے۔ مجھے اس کی تفصیل لکھو اور بہ تعجیل ۔ بھائی یہ فرحت نواز کون ہے غزل اس کی مرغوب خاطر ہے''۔(صفحہ نمبر ۴۷)

☆☆☆☆ ''سنا ہے کہ میرزا ادیب کی اہلیہ محترمہ نے قید حیات سے نجات حاصل کر لی۔میرزا صاحب نے سوئم تک گہرا غم کھینچا۔اس کے بعد بساط غم سمیٹی اور کالم نگاری کا شغل دوبارہ اختیار کیا کہ غم کٹے دکھ مٹے۔اے میاں چالیس پچاس برس کے رفیق کا چھننا کوئی معمولی بات ہے؟ شراب وہ نہیں پیتے گنجفے کا انہیں شوق نہیں محفل آرائی سے وہ گریزاں۔کالم نہ لکھیں گے تو اور کیا کریں گے ؟ اس پہاڑ ایسے غم کو کیسے کاٹیں گے؟ میرزا ادیب سے ہمدردی بجا لیکن اس عفیفہ کا حوصلہ بھی تو دیکھو جس نے پچاس برس تک میرزا صاحب کے ساتھ نباہ کیا۔ان کی صحرانوردیوں کو قبول کیا۔ان کے شوق تصنیف وتالیف کو گوارا کیا۔ جب کچھ نہ بن پڑا تو زاد حیات سمیٹے بغیر دنیا سے منہ موڑ لیا۔ فریدہ میرزا کیا حال ہوگا سوچتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔اے بھائی میرزا صاحب کو کالم نگاری میں مصروف رکھو۔حیدر قریشی آمادۂ شر ہے اور انہیں حقیقی صحرا کے مشاہدے کے لیے چولستان کی

سیر کی دعوت دے رہا ہے۔صحرا نورد کے خطوط لکھنے کے بعد بھلا مشاہدہ صحرا کی ضرورت باقی ہے''۔(صفحہ نمبر۱۲۰۔۱۲۱)

☆☆☆☆''حضرت یہاں مشہور ہے کہ میرزا ادیب نے اپنی آپ بیتی "مٹی کا دیا" چھاپ دی ہے۔گویا زندگی کی گرہ نیم باز کا قرض اپنے ناخن سے اتار دیا ہے۔مزید مشہور ہے کہ عہد آئندہ کے ادب کی تاریخ اسی کتاب سے مرتب ہوگی میں نے یہ کتاب نہیں دیکھی میرزا صاحب نے ایک نسخے پر میرا نام لکھا تھا لیکن پھر اسے مٹا دیا اور کتاب کسی مہ جبین کی نذر کر دی۔یہ اطلاع مجھے حیدر قریشی نے خان پور سے دی ہے۔بھلا بتاؤ تو میرزا ادیب کی بیگم کو فوت ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں اور جو یہ کتاب آپ کو تخلیق میں تبصرے کے لیے موصول ہوئی ہو تو مجھے بھیجو۔''(صفحہ نمبر۱۳۶)

رابطہ: جوگندر پال

اب بھی مجھے یہی لگ رہا تھا کہ لاہور کے ریلوے پلیٹ فارم میں داخل ہوتے ہی میں ایک بار پھر پیدا ہو جاؤں گا۔حیدر قریشی اپنی شناخت کے لئے ''اوراق'' کا تازہ شمارہ بہت ہی نمایاں انداز میں ہاتھ میں لئے ہوئے یہاں میرا انتظار کر رہے تھے۔مجھے انہیں پہچاننے میں کچھ وقت لگا کیونکہ میرے ذہن میں ان کی ایک الگ تصویر بنی ہوئی تھی۔کوئی بڑا ایکا اور سنجیدہ شخص، جس کے بال حصول علم میں سفید پڑ چکے ہیں۔لیکن وہ تو کوئی اور ہی نکلے۔ایک ہنس مکھ نوجوان، جو علم کو اسی طرح اٹھائے ہوئے تھا جیسے کوئی اپنے شریر بچے کو۔حیدر قریشی خانپور سے مجھ سے ملنے آئے تھے جو لاہور سے خاصی دوری پر واقع ہے۔(صفحہ نمبر۱۴۲)

تم کو دیکھیں (سفرنامہ پاکستان): ہرچرن چاولہ

(۲۲رفروری۱۹۸۸ء)

حیدر قریشی بہت اچھے شاعر، افسانہ نگار، تنقید کار اور کچھ کتابوں کے مصنف ہیں ۔۔۔۔۔۔میرے ''البم'' (یادنگاری) کے مداح رہے ہیں "اوراق" میں مدیر کے نام اپنے خطوط میں اکثر اس کی تعریف کرتے رہے ہیں اور ان ہی بے لوث تعریفوں کی وجہ سے یہ اتنے طویل عرصہ تک چلتا رہا ہے۔۔۔قریشی صاحب میرے قلمی دوست بھی ہیں۔

نماز کا وقت ہے اس لیے راستے میں پڑتی ان کی میڈیکل فرم اسے وقت بند ہے چلیے گھر دیکھ لیتے ہیں۔

میری خوش قسمتی سے وہ گھر پر ہی مل جاتے ہیں۔پگڑیوں کی جگہ ایک عجیب سی ٹوپی صوبہ سرحد کے پہاڑوں سے اتر کر سارے پنجاب کے سروں پر بیٹھ گئی ہے بھئی معاف کیجئے ہم تو اس مایا لگی چمکتی دمکتی، طرے دار پگڑی کے دیوانے تھے۔ہم نے اس میں اپنے استاد محمد خاں، مولوی مبارک علی صاحب، اپنے والد بابو کیول رام چاولہ، چچاؤں نواب کالا باغ اور سیٹھ رام سرن شاہ آف کالا باغ کو دیکھا ہے اور خلوص دل سے عاشق ہوتے ہیں۔کوئی ویسی پگڑی کسی جوان کے سر پر نظر نہیں آئی کہ بڑھ کر گلے لگائیں، بزرگ ہو تو جھک کر سلام کریں۔

مگر میں نے بڑھ کر حیدر قریشی کو گلے لگا لیا ہے۔اس کے سر پر اردو ادب کی شاندار پگڑی جو بندھی ہے۔اس کا طرّہ دوسری چمکتی دمکتی پگڑیوں سے کم اونچا نہیں۔یہی عظمت مجھے وزیر آغا کی سلیمانی ٹوپی میں نظر آتی ہے۔سر کا پہناوا اور اس کی قسم بھی ایک انسان کی عظمت کی علامت ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔

کچھ دیر حیدر قریشی کے گھر پر رک کر کوکا کولا پی کر اور حیدر قریشی، مسز قریشی، ان کی بہن، آغا صاحب، میری اور پورنیا کی دو دو فوٹو لے کر ہم واپس کار کی طرف آئے ہیں۔مختصر ملاقات کی تشنگی کل وزیر کوٹ سے سرگودھا اور میانوالی تک کی ہم سفری سے بجھائی جائے گی میں نے حیدر قریشی سے اس بات وعدہ لے لیا ہے۔(صفحہ نمبر۳۰،۳۱)

جست بھر زندگی: اکبر حمیدی

حیدر قریشی بھی میرا ایسا ہی جی دار دوست اور عزیز دوست ہے۔اس سے بھی پہلی ملاقات ربوہ میں ہوئی۔وہ خانپور میں تھا۔میری طرح وہ بھی اپنی ملازمت سے تنگ آیا ہوا تھا۔اس کے مزاج میں خوب سے خوب تر کی تلاش کا بے پناہ جذبہ کارفرما ہے۔کئی ملازمتوں میں گھستا ہوا اور پھر ان سے نکلتا ہوا۔۔آخر کار وہ پاکستان سے نکل گیا۔۔۔اور ایک دن جرمنی سے اس کا خط آ گیا۔تب معلوم ہوا کہ وہ اپنی منزلِ مراد پر جا پہنچا۔وہاں پہنچ کر سب سے پہلے اس نے اپنی برسوں پرانی داڑھی صاف کروائی۔پھر لباس تبدیل کر کے سوٹ بوٹ پہنا اور یوں زندگی کا سراپا تبدیل کر لیا۔حیدر

قریشی کی دوستی کسی بھی انسان کے لئے سرمایہ حیات ہوسکتی ہے۔وہ بغیر کسی ریزرویشن کے دوستی کرتا ہےاور جواب میں ایسی ہی دوستی کی توقع رکھتا ہے۔اس نے میری سبھی کتابوں پر مضامین لکھے اور رسائل میں شائع کروائے۔عاشق مزاج ہے اور دل پھینک بھی مگر صاف باطن اور مخلص بھی۔مخلص اتنا کہ ابھی وہاں شہرت نہیں ملی ہے اور خود پاؤں جمارہا ہے مگر مجھے تحائف پر تحائف بھیجے چلا جارہا ہے۔وہ دوستی نہیں عشق کرتا ہے۔ایسے دوست کی جدائی کس کو دکھ نہیں دیتی۔میں تو اس کے بغیر اداس ہورہا ہوں!حیدر قریشی کیا تم سُن رہے ہو!!اب وہ باتیں مجھ سے کوئی نہیں کرتا جو تم کیا کرتے تھے۔

اس کے خلوص اور تمنائے رفاقت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جو کچھ وہ خود ہوتا ہے وہی کچھ مجھے بھی بنانا چاہتا ہے۔(صفحہ نمبر ۲۴۳،۲۴۴)

یادخزانہ:جمیل زبیری

ریفرنڈم سے کچھ روز پہلے میرے پاس حیدر قریشی کا خط آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ میں سولہ دسمبر کو کراچی آرہا ہوں حیدر قریشی ملک کے جانے پہچانے ادیب ہیں اور اُس زمانے میں رحیم یار خان میں سکونت پذیر تھے وہ جدید ادب کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکالا کرتے تھے۔اتنے چھوٹے اور عام دھارے سے الگ شہر میں بیٹھ کر ادب کی آبیاری کرنا اور نہایت معیاری رسالہ نکالنا انہی کا کام تھا۔ان سے کچھ عرصہ سے میری خط و کتابت تھی۔ان کے خطوط سے ہی میں نے ان کے خلوص کا اندازہ لگا لیا تھا انہیں لکھا بھی تھا کہ وہ کراچی آئیں اور مجھے اپنی میزبانی کا شرف بخشیں مگر انہوں نے اپنے آنے کی ایک ایسی تاریخ لکھی جو شاید میری زندگی کے سب سے مصروف دن تھے۔میں نے انہیں خط لکھ دیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی آمد کی تاریخ بدل لیں۔مگر شاید انہیں کراچی میں انہی تاریخوں میں کچھ اور کام بھی تھا اور وہ تاریخ نہیں بدل سکے۔

میں اپنے کام میں ہمہ تن مشغول تھا ہر منٹ پر ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔پروڈیوسر دوڑ رہے تھے اسی دوران میں میری نظر اٹھی تو میں دیکھا کہ ایک صاحب جنہیں میں نے کبھی پہلے نہیں دیکھا تھا

ایک کرسی پر بیٹھے تھے۔فون رکھ کر میں ان کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا،''جی فرمائیے'' وہ بڑی خوبصورتی سے مسکرائے اور آہستہ سے بولے،''حیدر قریشی'' میں بالکل سٹ پٹا گیا۔کھڑے ہو کر ان سے گلے ملا۔ان کے لئے چائے منگوائی۔وہ چائے پیتے رہے میں کام میں مشغول رہا۔سلطان جمیل نسیم کو اپنی مصروفیت کا حال بتا کر ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے گھر پر حیدر قریشی کے ساتھ ایک ادبی نشست کا بندوبست کر لیں اور ٹیلیفون کر کے کچھ دوستوں کو مدعو کر لیں انہوں نے میری لاج رکھ لی جب مغرب ہوگئی اور کام کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں سلطان جمیل کے گھر کا ٹیلیفون نمبر اپنے پروڈیوسر کو دے کر اور حیدر قریشی کو ساتھ لے کر ان کے گھر چلا گیا۔میں کہہ گیا تھا کہ کہیں سے بھی فون آئے تو وہ نمبر دے دینا اور کہنا کہ ذرا دیر کے لئے ایک ضروری کام سے گئے ہیں۔

سلطان جمیل نسیم کے گھر کچھ ادیب جمع ہوگئے تھے میں نے حیدر قریشی کا تعارف کرایا کچھ ادیبوں سے جدید ادب کے حوالے سے خطوط کے ذریعہ ان کے روابط پہلے سے تھے ابھی میں تعارف کرا ہی رہا تھا کہ پہلے ملتان سے پھر بہاول پور سے پھر کسی اور اسٹیشن سے فون آنے لگے اور سب سے آخر میں ڈائریکٹر جنرل سلیم گیلانی کا فون آ گیا۔حسب دستور انہوں نے پہلے تو ذرا غصہ دکھایا اور پوچھا تم اس وقت وہاں کیا کر رہے ہو تمہیں تو ریڈیو پر ہونا چاہیے تھا میں نے کہا کہ بس میں ابھی جا رہا ہوں پھر انہوں نے کہا''لو بھئی تمہارا کام ہوگیا ہے تم ابھی جا کر چارج لے لو سی پی یو میں ہی ڈپٹی کنٹرولر کی پوسٹ جو کچھ عرصے سے التوا میں تھی بحال کر دی ہے۔'' میں نے ان کا بہت شکریہ ادا کیا۔

اس وقت حیدر قریشی اپنا افسانہ سنا رہے تھے ان سے اجازت لی اور ٹیکسی لے کر روانہ ہوا اور جیسا کہ اس قسم کے مواقع پر ہوتا ہے ٹیکسی قائداعظم کے مزار کے پاس پہنچ کر بند ہوگئی کوشش کے باوجود وہ اسٹارٹ نہ ہوئی۔میں اتر گیا کوئی دوسری ٹیکسی نہ ملی دیر پر دیر ہورہی تھی مجھے ایک کار میں ایک شریف صورت گزرتے ہوئے نظر آئے میں نے ہاتھ دے کر انہیں روکا اپنی پریشانی اور ریڈیو کے بارے میں بتایا انہوں نے نیکی کی اور مجھے ریڈیو پہنچا دیا۔میں ریفرنڈم کی اس ہڑبونگ میں اپنے پروموشن کی خوشی کا پورا احساس تک نہ کر پایا۔

ریفرنڈم کے اگلے دن میں نے حیدر قریشی کو اپنے گھر مدعو کیا اور ایک اور ادبی نشست ہوئی۔

حیدر قریشی نہایت مخلص اور بہت مہمان نواز انسان ہیں۔مجھے ان کی مہمان نوازی کا اندازہ تو اس

وقت ہوا جب کچھ عرصہ بعد میں ان کی دعوت پر ان کے گھر گیا۔ وہ افسانہ نگار ہیں اور ساتھ ہی ایک اچھے شاعر بھی ہیں ان کے افسانوں کا مجموعہ تو شائع نہیں ہوا مگر میں نے ان کے چند افسانے سنے اور پڑھے ہیں وہ بڑی سادہ زبان میں کچھ بیانیہ اور کچھ علامتی انداز کے افسانے لکھتے ہیں اور ان کا زیادہ تر موضوع فرقہ واریت اور ایک فرقے کا دوسرے پر ظلم و جبر ہوتا ہے انہوں نے ایک بڑا کام یہ کیا ہے کہ اپنے علاقے کے شعراء کا کلام جمع کر کے اس کے دو انتخاب، شفق رنگ اور کرنیں، کے نام سے شائع کئے ہیں میں نے ان کی ایک غزل ریڈیو کے لئے ریکارڈ بھی کرادی تھی۔

وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ان کی علامتیں نئی نہیں ہیں لیکن ان میں ایک خاص طرح کی گھلاوٹ ہے۔ خان پور کی شہری اور دیہاتی عناصر سے مرکب زندگی ان کے کلام میں جا بجا جھلکتی ہے۔ حیدر قریشی کی شعری لغت، ان کی تمثیل اور علامتیں جدید شاعری کے ہم عصر رویوں کو پیش کرتی ہیں ان کی شاعری میں آج کی زندگی کے مسائل اور ان مسائل کا کرب، احساس کی پوری توانائی کے ساتھ موجود ہے اور ان رویوں کا اظہار خوبصورت پیرائے میں کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں تازگئ فکر، ندرتِ فکر اور اسلوبِ فکر موجود ہے۔

نمونہ کلام:

تھی کتنے موسموں کی مہک اس کے جسم میں
سانسوں کی تیز آنچ میں ہم بھیگتے رہے

نئی رتوں کے جو منتظر تھے اجڑ گئے وہ گلاب چہرے
عذاب کی ایسی آندھیاں تھیں کہ بجھ گئے آفتاب چہرے

سعید شباب، حفیظ شاہد اور فرحت نواز سے میرا تعارف انہی کے ذریعہ ہوا۔ پھر ایک دفعہ میں ان لوگوں سے ملنے خانپور چلا گیا خانپور میں میری بہت پذیرائی ہوئی اور مجھے اس بات پر حیرت اور خوشی ہوئی کہ اتنے چھوٹے سے دور دراز شہر میں لوگ کس طرح ادب کی ترویج میں حصہ لے رہے ہیں۔'' (صفحہ نمبر ۳۴۳ تا ۳۴۶)

پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ: ڈاکٹر انور سدید

ماہنامہ "جدید ادب" کے نام سے ایک دور افتادہ شہر خان پور سے حیدر قریشی نے ایک

فعال اور ادبی لحاظ سے سرگرم جریدہ جاری کیا، تو اہل ادب نے اس پرچے کی طرف حیرت سے دیکھا اور بہت تھوڑے عرصے میں "جدید ادب" کو اہمیت کا مقام مل گیا۔

"جدید ادب" نے ادب کے تازہ مسائل کو اہمیت دی، افسانہ، نئی نظم، ہائیکو، آزاد غزل کے موضوعات پر معنی خیز مباحث پیدا کئے، پاکستانی ادب اور موضوع پر ڈاکٹر سید عبداللہ، شمیم احمد اور وزیر آغا کے مضامین پیش کئے "فن اور شخصیت" اس کا ایک مخصوص حصہ تھا۔ جس کے تحت ممتاز مفتی، جیلانی کامران، مظہر امام، شمیم احمد، جمیل جالبی، اور متعدد دوسرے ادیبوں پر گوشے پیش کئے گئے۔ ممتاز افسانہ نگار جوگندر پال پر ایک خصوصی اشاعت چھاپی گئی، خصوصی مطالعے کے تحت احمد ظفر، اظہر ادیب، مناظر عاشق ہرگانوی، فرحت نواز، ثمینہ راجہ اور متعدد دوسرے شعرا اور شاعرات کی پانچ یا چھ غزلیں اور نظمیں اور ان پر تعارفی مضامین پیش کئے گئے۔ "جدید ادب" کا رجحان واضح طور پر وزیر آغا کے دبستان سرگودھا کی طرف تھا اس لئے اس نے طغیانِ فکر و نظر پیدا کیا اور اس کی صدائے بازگشت پورے برصغیر میں سنی گئی حیدر قریشی نے خانپور چھوڑا تو یہ پرچہ بھی بند ہو گیا۔

سفر ہم سفر: راغب شکیب

خانپور کا حلقہ ادب

خیالات کا سلسلہ ٹوٹا تو چلتی گاڑی نے بہاولپور کو پیچھے چھوڑ دیا تھا اور اب گاڑی خانپور کی طرف لپک رہی تھی۔ نہ جانے میں اس مانوس سی خوشبو کو کیوں تلاش کرنے لگا جو "جدید ادب" کے صفحے صفحے پر پھیلی ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا حیدر قریشی نے خانپور سے ایک دبلے پتلے سے ادبی پرچے "جدید ادب" کی بنیاد رکھی تھی اس پرچے کو دیکھ کر لاہور، راولپنڈی، اسلام آباد اور پشاور جیسے بڑے بڑے شہروں کے لحیم شحیم اور ضخیم پرچوں نے اس کا مذاق اڑایا اور بانگِ دہل کہا کہ یہ بھی کوئی پرچہ ہے اور خانپور کون سا ادبی مقام ہے جو کسی ادبی پرچے کا کفیل ہو سکتا ہے۔ لیکن حیدر قریشی نے بڑے شہروں کے اس چیلنج کو قبول کیا اور ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وزیر آغا، ممتاز مفتی، ڈاکٹر انور سدید، شمیم احمد، آغا بابر اور میرزا ادیب وغیرہ کا تعاون حاصل کر کے ثابت کر دیا کہ اچھا ادب قید مقام سے ماورا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب لاہور کا معاصر ادب اپنی پناہ فربہی میں تلاش کر رہا

تھا حیدر قریشی نے مختصر ضخامت میں "جدید ادب" کو شائع کر کے خانپور کو ادبی دنیا میں ایک مقام عطا کر دیا۔

یہ تو "جدید ادب" کی بات تھی خانپور نے تو ایک مخصوص حلقہ ادب بھی پیدا کیا ہے گزشتہ سال اس حلقے کی پہلی کتاب "شفق رنگ" شائع ہوئی تھی اس کتاب کی پیشانی کے لئے الفاظ ڈاکٹر انور سدید، ذوالفقار احمد تابش اور مرزا ادیب نے لکھے تھے اور اس کوشش کو بے حد سراہا تھا۔۔۔۔۔ جدید ادب پبلی کیشنز خانپور اور ممتاز اکیڈمی بھٹہ داہن کے تعاون سے سرائیکی کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی منتخب نظموں کے سرائیکی تراجم پر مشتمل ایک کتاب "چونڑدیاں" نظماں کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ کرشن چندر سے رشید امجد تک اہم افسانہ نگاروں کے افسانوں کے تراجم "منزلاں تے پندھیڑے" کے نام سے شائع کی ہے۔ افسانوں کے تراجم فرحت نواز نے کئے ہیں۔ "سرائیکی غزل" ایک تنقیدی بحث کے ساتھ اہم سرائیکی غزلوں کے انتخاب پر مبنی ہے۔ اسے حیدر قریشی نے مرتب کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ بہاولپور ڈویژن کے نئی نسل کے نمائندہ شعراء کے تعارف اور منتخب کلام کا مجموعہ " کرنیں " کے نام سے شائع ہوا ہے جسے حیدر قریشی اور اظہر ادیب نے مرتب کیا ہے "جدید ادب" نے جو طرح ڈالی تھی اس کی تقلید رحیم یار خان میں ہوئی اور "ادب جہاں" کے نام سے ایک نیا رسالہ طلوع ہوا۔ ادھر بہاولپور سے اب "اسلوب" شائع کرنے کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے اور اس کے کرتا دھرتا اظہر ادیب ہیں۔

خانپور کے اسٹیشن پر میں چلتی گاڑی سے حیدر قریشی کو نہ دیکھ سکا۔ مجھے یقین ہے اگر اسے اطلاع ہو جاتی تو وہ رات گئے تک گاڑی کا انتظار کرتا اور ہوا میں ہاتھ لہرا کر سلام خلوص مجھ تک پہنچاتا۔ لیکن میں نے تو لمحے کو متحرک رکھنے کی کوشش کی تھی۔ گاڑی میں خانپور کے ایک باسی نے جس محبت اور خلوص اور اپنائیت سے مجھے چائے کی گرم پیالی اور رس دار کیک کا میٹھا ٹکڑا پیش کیا اس سے میں یہ اندازہ کر سکتا ہوں کہ حیدر قریشی کی روح میرے قریب ہی کہیں پھر رہی تھی۔ میرے کانوں میں میٹھی سرائیکی کا رس انڈیل رہی تھی۔ میں نے اس بھولی بھالی زبان میں جب اردو کی آمیزش کی تو یوں محسوس ہوا جیسے لکھنو اور خانپور آپس میں گلے مل رہے ہیں۔ سندھ اور پنجاب کے پانیوں نے ایک دوسرے کے ساتھ معانقہ کیا ہے اور ایک نئی بولی جنم لے رہی ہے جس

میں خانپور کی لطافت، لکھنو کی نزاکت، لاہور کی تماشہ پسندی اور فقرہ بازی، دلی کی معنویت اور سرگودھا کا خلوص سب کچھ شامل ہیں اور یہ سب مل کر اردو کے قافلے کو کامرانی کی نئی منزلوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (صفحہ نمبر ۴۲ تا ۴۴)

☆☆☆☆ پھر یوں محسوس ہوا کہ اس محفل میں میں اور جوگندر پال ہی تھے اور باتیں ہو رہی تھیں سرگودھا کی، اوراق کی، وزیر آغا کی، اردو زبان کی، خانپور کے جدید ادب اور حیدر قریشی کی۔ انجم اعظمی اور شبنم رومانی ہم دونوں کے بے حد صابر سامع تھے جوگندر پال نے بتایا۔

"وہ کراچی سے خانپور جائیں گے، حیدر قریشی کے ساتھ طے ہوا ہے کہ وہ اور ان کے احباب خانپور سے لاہور تک ہمارے ساتھ سفر کریں گے۔ یوں وزیر آغا صاحب کے پاس ٹھہرنے کے لئے ایک دن زیادہ مل جائے گا۔ سالار قافلہ حیدر قریشی ہوں گے۔ (صفحہ نمبر ۱۸۲)

چونڑویاں نظماں: فرحت نواز

حیدر قریشی کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔ شاعر، افسانہ نگار، نقاد، دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا بھی دوست۔ ایک اشاعتی ادارے کا بانی اور بڑے شہروں کی ادبی اجارہ داری کے خلاف ایک موثر آواز--- جس کی صحت مند ادبی سرگرمیوں کو ڈاکٹر سید عبداللہ، سید ضمیر جعفری، ڈاکٹر وزیر آغا، ممتاز مفتی، ڈاکٹر انور سدید، شمیم احمد، اعجاز فاروقی اور دیگر بہت سارے بڑے ادبا نے زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔

ملک کے تمام اہم اور قابل ذکر معیاری ادبی پرچوں میں ان کی تخلیقات شامل ہوتی ہیں۔ سرائیکی زبان میں شاعری، افسانہ اور تنقید۔ تینوں اصناف کو انہوں نے برتا ہے لیکن اس زبان میں انہوں نے اتنا کم لکھا ہے کہ ابھی تک تبرک کا درجہ رکھتا ہے۔ صرف اپنی نیک خواہشات کی بنیاد پر ہی نہیں بلکہ حیدر قریشی کی بھرپور تخلیقی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ آنے والے وقت میں یہ نام۔ ادب کا ایک اہم نام ہوگا۔ میرے اس یقین کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حیدر قریشی نے ہمیشہ اپنی صلاحیتوں کو خدا کے فضل کا نتیجہ قرار دیا ہے اور ہمیشہ انکساری سے کام لیا ہے۔ ایسی سوچ بہت کم ادیبوں میں پائی جاتی ہے۔'' (صفحہ نمبر ۴۷)

محبت نامے

ممتاز مفتی بنام حیدر قریشی

مکرمی حیدر قریشی !سلام علیکم

آپ کے بہت سے خط موصول ہوئے۔موصول ہوتے رہے۔

گزشتہ دو ماہ سے میں نے کسی کو خط نہیں لکھا نہ سوالاً نہ جواباً۔ پتہ نہیں کیوں۔کوئی خاص وجہ نہ تھی زندگی میں کئی باتیں ایسی وقوع پذیر ہوجاتی ہیں جن کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

سکرپٹ تو مجبوراً لکھنے پڑتے ہیں۔ادبی چیزیں لکھنے پر لوگ مجبور کرتے ہی۔خط تو اپنی مرضی سے لکھے جاتے ہیں لہذا خط لکھنے سے منکر ہوگیا۔دراصل ہر وقت لکھتے رہنا نہ کہیں آنا نہ جانا نہ ملنا نہ ملانا نہ کھیل نہ فلم نہ ہوٹل بازی۔خالی لکھنا، دل اکتا گیا تھا۔ابھی تک اکتاہٹ دور نہیں ہوئی، یہ تو اک کوشش ہے کہ شاید بات چل نکلے۔ چھ دن ایک ہندی کہانی میں پھنسا رہا۔فرمائش تھی انہوں نے زچ کر دیا تھا۔ابھی ابھی ختم کی، جان چھڑائی۔اس وقت لکھنے کا عمل ایسے لگ رہا ہے جیسے ہتھکڑی پڑ گئی ہو۔

آپ نے پرچے کی شکل بدلنے کی بات لکھی تھی بات بہت عمدہ ہے لیکن یہ پتہ نہیں کہ قابل عمل ہے یا نہیں لیکن یہ بھی تو ہے کہ آپ جیسے جن کیا نہیں کر سکتے۔ادب جدید یوں چالو کر دینا یہ بھی تو نا قابل عمل تھا--- کرو۔ جو ہو سکتا ہے کرو۔ کر گزرو۔ پیشتر اس کے کہ لکھنا کوفت بن جائے۔

مفتی--۷۹۔۹۔۲۶

حیدر قریشی ! تم ٹھیک کہتے ہو تم سچے نکلے میں جھوٹا نکلا۔لیکن اس کے باوجود تمہیں اپنی سچائی کا کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔

پچھتر برس کی عمر میں انسان کو احمقانہ باتیں کرنے۔خواہ مخواہ غصے میں آنے اور اپنی بزرگی کا ناجائز فائدہ حاصل کرنے کا حق ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے تم فراخدلی سے مجھے یہ حق دے دو گے۔میں خط لکھنے کا چور ہوں۔

مفتی

میں لکھ کر تھک جاتا ہوں۔

اللہ نہ کرے بڑھاپے میں مانگ بڑھے۔اس وقت کوئی افسانہ ہے نہیں۔حمیدی نے جدید ادب کی کتاب حال ہی میں پہنچادی۔بہر حال پہنچادی۔

مفتی۸۱۔۳۔۳

حیدر قریشی !تو بہت تنگ کرتا ہے۔

اب میں اتنا لمبا چوڑا خط کیسے لکھوں۔

کیا اس سے بہتر نہیں کہ ایک افسانہ لکھ لوں۔

پینتالیس سال سے لکھ لکھ کر انگوٹھا مضروب ہو چکا ہے۔ڈاکٹر رائٹرز کریمپ بتاتا ہے۔تیرے اس لمبے چوڑے خط کا ایک جواب ہے۔''علی پور کا ایلی'' میری داستان حیات ہے۔۱۹۴۷ء تک کی۔ اس میں قطعاً جھوٹ نہیں بولا گیا۔مقصد صرف ایک تھا کہ سچ سچ کہہ دو۔بس صرف ادبی پہلو حذف کر دیا تھا باقی سب کچھ لکھ دیا۔دوسرا حصہ لکھنا تھا لیکن میرے ساتھی نہیں مانتے۔انہیں بھید رکھنے کا حکم ہے۔کھولنے کا نہیں۔لہٰذا دوسرا حصہ کبھی نہیں لکھا جائے گا۔

مفتی--۸۱۔۴۔۱۱

جناب حیدر قریشی صاحب!

غلطی یہ ہوئی کہ اوراق میں میں نے آپ کی تصویر دیکھ لی۔آج تک میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ میرے ہم عمر ہیں۔چونکہ میں مینٹل اتج میں سترہ سال سے آگے نہیں گیا اس لئے میں حیدر سے خط شروع کرتا تھا اور مفتی پر ختم کر دیتا تھا۔تصویر دیکھ کر مجھے پتہ چلا کہ آپ تو بڑے معزز آدمی ہیں۔اب خط و کتابت میں مزید مشکل پیدا ہوگئی ہے۔بہر حال حالت یہ ہے کہ اس وقت میرے

پاس کوئی کہانی نہیں ۔ نہ ہی مستقبل قریب میں احتمال ہے اب یا تو انتظار کریں اور یا پتہ نہیں کیا کریں۔

مفتی --۸۱۔۴۔۲۷

حیدر قریشی

آج خط ملا

سکھر گیا تھا۔ایک بابا کو سلام کرنے۔

جاتے اور آتے خان پور کے سٹیشن پر تجھے پاس بٹھائے رکھا۔ بہت کچھ کہا سنا۔اب جو کہتے ہو تو کہانی بھیج دیتا ہوں لیکن پسندیدہ نہیں۔اس کے علاوہ دوسری موجود نہیں مجبوری۔وہ چھپی ہوئی پسندیدہ ہے۔سندرتا کا راکشش، چلو ایک دال ایک چاول کھچڑی کی کوئی بری چیز نہیں۔کہانی ہفتے کے روز پوسٹ کردوں گا۔

جب بھی میں نے تم سے ضد کی۔میں ہارا تم جیتے۔

اللہ کسی شریف آدمی کا پالا وکیل سے نہ ڈالے چاہے وہ داڑھی والا کیوں نہ ہو یاران وطن بھجوا رہے ہیں۔ملتا ہے یا نہیں۔

مفتی--۸۱۔۶۔۲۲

(خطوط مطبوعہ "**جدید ادب**"خان پور شمارہ ستمبر ۱۹۸۱ء)

حیدر۔سب سے پہلے وزیر آغا بولا۔خط میں کہا۔حیدر قریشی نے جدید ادب میں آپ کا ایک کونہ سجایا ہے۔ پھر کسی نے کہا ناصر زیدی تمہارا جدید ادب لئے پھرتا ہے۔ پھر خط آیا پرچہ فلاں صاحب کو دیا کہ آپ کو پہنچائے۔فلاں صاحب کو بھی دیا کہ پہنچائے۔پہنچا یا نہیں۔ پھر ایک پیکٹ ملا جس میں پرچہ ملفوف تھا۔

بے شک تم نے رنگا رنگ بتیاں سجائیں۔دیگیں کھڑکیں۔شہنائی بجی، سہرے لگے۔گھوڑے پر چڑھایا لیکن دلہن کہاں ہے۔اس کی شکل نظر نہیں آئی بس اتنی سی کسر رہ گئی ہے۔باقی دھوم دھڑ کا موجود ہے۔تم نے لکھا ہے کتنی کاپیاں بھیجوں بس ایک اور بھیج دو تو کام بن جائے گا۔ بہت سے

لوگ ایسے ہیں جو مجھے نہیں مانتے اگر ان کو بھیجو تو شاید ان کے دل پسیج جائیں۔مثلاً ایک قدرت اللہ شہاب ہے اس نے کبھی درخور اعتناء نہیں سمجھا۔ایک اشفاق احمد ہے اسے کبھی خود سے فرصت نہیں ملی کہ کسی اور کو جانے۔ایک احمد بشیر ہے۔احمد ندیم قاسمی کو نہ بھیجنا اس کا دل دکھے گا۔کراچی والوں کو بھی نہ بھیجنا چونکہ میں نے ان کی اردو کا سواستیاناس کیا ہے تم بھی اپنے لکھنے والوں سے کہو کہ اردو میں سرائیکی کے لفظ برتیں۔جان بوجھ کر التزاماً ہمیں صرف وہ اردو قبول ہوگی جس میں صوبائی زبانوں کے الفاظ اور محاورے سجے ہوں۔

دیکھو کتنا لمبا خط لکھا ہے میں نے۔

ممتاز مفتی

(مطبوعہ "**جدید ادب**"خان پور شمارہ فروری ۱۹۸۲ء)

شیر افضل جعفری بنام حیدر قریشی

من بھانونے حیدر جی !سونہا سلام

کل آپ کا موتیوں ورگا خط ملا تھا۔آج چنن جیسا "جدید ادب" ملا ہے، بقامت کہتر بقیمت بہتر۔میں اسے قومی زبان کا" کوہ طور" کہوں گا۔اگرچہ الف سے لے کری تک سارے مندرجات خوشبودار ہیں لیکن جناب انور سدید کا مضمون ید بیضا کی مثل ہے۔میں اس شخص کو موسائے اردو کہوں گا۔آپ نے رسالہ جاری کر کے خانپور کو قلمدان پور بنا دیا ہے اگر آپ اپنی اس چاند سورج کوشش کو ادبی کرامت قرار دے کر ادبی ولایت کا دعویٰ کریں تو کوئی عمل پرست ادیب آپ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔میری طرف سے آپ ہزاروں شاباشیں اور لاکھوں دعائیں قبول کیجئے۔ماشاءاللہ

درویش دل دلیش

شیر افضل جعفری

(مطبوعہ "**جدیدادب**"خانپور شمارہ ستمبر ۱۹۷۹ء)

میجراظہرعلی بنام حیدرقریشی

ایبٹ آباد

۱۰_۲_۱۹۴

محترم حیدرقریشی صاحب --السلام علیکم

آپ کی طرح آپ کا جیتا جاگتا خط ملا۔آپ کی جو کمی اتنے عرصے سے محسوس ہو رہی تھی وہ چند دنوں کے لئے دور ہوگئی اور بہت خوشی ہوئی کہ آپ "ٹھکانے" لگے۔ میں آپ کو اتنی باتیں سنایا کرتا تھا۔ مجھے اس وقت بھی اندازہ تھا کہ آپ ان کو صحیح طرح Enjoy نہیں کر پا رہے تھے کیونکہ ان کی مکانیت سے آپ اچھی طرح آشنا نہیں تھے۔اب مہربانی کر کے ان باتوں کو ذہن میں اچھی طرح دہرا کر دوبارہ لطف اندوز ہونے کی سعی کریں۔لیکن اب آپ کو پرانے قصوں کی کیا ضرورت ہے؟ اب تو آپ خود کئی قصوں کے مرکزی کردار ہوں گے۔

آپ کے بعد ہم نے جینا تو نہیں چھوڑا لیکن آپ جو ویرانیاں پھیلا گئے ہیں وہ آسانی سے نہیں جا رہی ہیں ۔ میرے لئے ہر صبح سکول جانے میں جو آمادگی ہوتی تھی وہ آپ سے "ٹاکرا" ہونے کی امید کی وجہ سے ہوتی تھی اور کبھی کبھار آپ کا چھٹی پر ہونا بھی نہایت ناگوار گذرتا تھا۔آپ کی صحبت میں، جو اَب شاید ہی میسر آوے، زندہ ہونے کا یقین ہو جاتا تھا۔ میں شاعری کرنے کی کوشش نہیں کر رہا حقیقت حال بیان کر رہا ہوں۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے ان گنت خوش کن لمحات سے آشنا کیا۔

میں آپ کی ادبی کامیابیوں پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ صحیح جگہ پہنچ گئے ہیں اور وقت بھی بالکل صحیح ہے۔آپ جو کچھ لکھیں گے اس کی قدر کی جائے گی۔شکر کریں بے قدروں سے آپ کی جان چھوٹی۔ جرمنی اپنی فراخدلی کی وجہ سے مشہور ہے۔آپ اگر کسی Skin Head کے ہتھے نہ چڑھے تو آپ زندگی کا بقیہ حصہ (جسکے نہایت لمبا ہونے کا قومی امکان موجود ہے) نہایت عافیت سے گذاریں گے۔ ہم سب یہاں خیریت سے ہیں۔ بھابی مبارکہ کو میری اور ریحانہ کی طرف سے سلام اور مبارکباد بھی کہیں کہ آپ کو دوبارہ پا لیا ہے۔خواہ چھ ماہ بعد مجھے اس مبارکباد دینے پر کوسنے دیں۔آپ کا مخلص **اظہر علی**

بریگیڈئیر اعجاز اکبر (پرنسپل) بنام حیدرقریشی

پاکستان انٹرنیشنل پبلک سکول وکالج ایبٹ آباد

۱۲_۵_۹۴

محترم قریشی صاحب

وعلیکم السلام۔

مدت کے بعد آپ کا خط اور چیک ملے۔ چیک کی رسید بھیج رہا ہوں اتنے عرصہ کے بعد آپ اس چھوٹے سے قرض کو نہیں بھولے۔اصول کی بات ہے اور قابل تعریف۔

آپ کے جانے کے بعد، وہ ادبی محفلوں کا جو سلسلہ چلا تھا، بند ہو گیا، آپ نے تھوڑے سے عرصہ میں ادارہ کے لئے کافی کچھ کیا۔ میں اور دوسرے احباب آپ کو نہیں بھولے۔

اللہ آپ کو خوش وخرم رکھے اور کامرانی سے نوازے۔ والسلام

خیر اندیش **بریگیڈئیر (ریٹائرڈ) ایم اعجاز اکبر**

نسیم سیفی بنام حیدرقریشی

ربوہ

۱۱_۳_۹۲

مکرمی حیدر قریشی صاحب سلامت باشد

"سلگتے خواب" پا کر خوشی ہوئی۔ آپ نے تو یہ تحفہ ۹۱_۱۱_۱۷ کو بھیجا تھا مجھے ۹۲_۲_۱۳ کو ملا۔لیکن جلد شکریہ اس لئے نہ روانہ کر سکا کہ اس عرصہ میں دو تین دفعہ مقدمات کے سلسلہ میں کراچی جانا پڑا اور وہاں دس دس بارہ بارہ دن قیام کرنا پڑا۔آپ نہ جانے کیا سوچتے ہوں گے؟۔ کیا آپ کو الفضل دیکھنے کا موقعہ ملتا ہے؟ ربوہ کب آنے کا پروگرام ہے؟ آئیں تو مجھ سے ضرور ملیں۔والسلام خاکسار **نسیم سیفی**

نجمہ منصور بنام حیدر قریشی

سرگودھا

۱۳مئی۱۹۹۲ء

محترم حیدر قریشی صاحب!

السلام علیکم

آپ کی کتاب "سلگتے خواب" پڑھی۔ایک ایک شعر نے دل پر اثر کیا۔آپ یقین کریں کہ پوری کتاب مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے اسے بار بار پڑھا اور ہر بار ایک نیا پن محسوس کیا۔آپ کا ہر شعر قاری کو اپنی طرف اس طرح متوجہ کرتا ہے کہ نہ صرف وہ اسے پڑھتا ہے بلکہ دل میں اتار لیتا ہے۔

آپ کی کتاب مجھ تک سجاد نقوی صاحب کے ذریعے پہنچی۔حالانکہ کتاب میں نے پڑھنے کے بعد انہیں واپس بھی کر دی ہے مگر بعض شعر مجھے اب بھی زبانی یاد ہیں۔

کافی دنوں سے جناب ڈاکٹر وزیر آغا صاحب سے بھی ملاقات نہیں ہوسکی۔مجھے آپ کی کتاب کی اشاعت کے بارے میں "تخلیق" سے پتہ چلا تھا اور میں نے جناب سجاد نقوی صاحب سے آپ کی کتاب لی تھی۔یقین کریں مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے اور اب فخر بھی محسوس ہونے لگا ہے کہ آپ نے میری کتاب "میں، سپنے اور آنکھیں" کا فلیپ لکھا۔

میری ایک دوست نے بھی آپ کی کتاب پڑھی ہے۔اسے بھی بہت پسند آئی۔میری طرف سے ایک بار پھر بہت مبارکباد قبول کریں۔اچھا اجازت اللہ حافظ!

آپ کی صحت وعافیت کے لئے دعا گو **نجمہ منصور**

جمیل زبیری بنام حیدر قریشی

کراچی

۱۳اپریل۱۹۹۴ء

محترم حیدر قریشی صاحب السلام علیکم۔

میں نے آپ کو کہاں کہاں نہ ڈھونڈا۔کس کس سے نہ پوچھا۔متعدد خطوط ایبٹ آباد لکھے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔آخر قسمت نے یاوری کی اور سعید شباب سے ملاقات ہوگئی۔ان سے پتہ چلا کہ آپ اس دوزخ سے نکل کر جا چکے ہیں۔مگر آپ نے غضب یہ کیا کہ وہاں پہنچ کر مجھے بالکل ہی فراموش کر دیا۔بہر حال میں آپ کو یاد کرتا رہتا ہوں اور جب میں نے ریڈیو کی یادداشتیں مرتب کیں آپ کی محبتوں کا ذکر لکھا اور بہت جی چاہا کہ کتاب آپ تک پہنچے۔کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔بہر حال پھر سعید صاحب کام آئے۔انہوں نے بتایا کہ وہ آپ کو کوئی بنڈل بھیجنے والے تھے اور اس میں کتاب بھی جا سکتی تھی چنانچہ آپ کے لئے کتاب ان کو بھیج دی تھی مگر ابھی تک علم نہ ہو سکا کہ وہ آپ تک پہنچ گئی یا ابھی نہیں۔

بہر حال اب نئے سرے سے ملاقات ہوگئی ہے اور امید ہے کہ یہ سلسلہ قائم ودائم رہے گا۔وہاں کے حالات سے مطلع کریں کیا مصروفیات ہیں؟ وقت کیسے گذر رہا ہے۔امید ہے بیگم صاحبہ و بچے بخیریت ہوں گے۔تفصیلی خط کا انتظار کروں گا۔

فقط آپ کا مخلص

جمیل زبیری

ڈاکٹر صادق بنام حیدر قریشی

نئی دہلی

۲۲مارچ۱۹۹۴ء

برادرم حیدر قریشی صاحب

دیویندر اسر صاحب سے آپ کا مکتوب ملنے کے بعد جواب لکھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ "تجدید نو" کا ایک شمارموصول ہوا جس میں آپ کا کلام بلاغت نظام بھی جگمگا رہا تھا۔نقد و نظر میں "جرمن شاعری کے فکری زاویے" خصوصی دلچسپی سے پڑھا لیکن وہاں فکر اور زاویے دونوں ہی غائب پائے۔

آپ نے جو شرط بیگم صاحبہ کے ہمراہ دلی آنے کی رکھی ہے اس کی تکمیل کے لئے ہم بسر وچشم تیار ہیں اب اس کی فکر اور مکمل ذمہ داری ہماری سمجھیں--- پتہ چلا ہے کہ آپ کے افسانوں

کے ہندی ترجمہ کا کام مکمل ہو چکا ہے۔امید ہے اسی برس اب یہ مجموعہ پبلشر چھاپ دے گا۔

میں بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ ڈوکیومینٹری والا کام چھوڑ کر صرف ادب اور مصوری ہی کے شوق میں بقیہ عمر صرف کروں اس باب میں مزید آگے خط میں لکھوں گا۔ بھابی صاحبہ کی خدمت میں ہم دونوں کا سلام کہیے گا۔بچوں کو دعائیں۔شاہینہ آپ کو آداب لکھواتی ہیں۔

آپ کا مخلص---**صادق**

پرویز پروازی بنام حیدر قریشی

پیارے حیدر قریشی---السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ابھی فون پر بات ہوئی۔الحمدللہ کہ تمہاری آواز سننے کو ملی۔اے دوست کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا وغیرہ وغیرہ۔اکبر حمیدی کی کتاب "قدِ آدم" ملی تھی۔اس کی رسید میں میں نے جو خط لکھا اس میں تمہارے بارے میں پوچھا۔جواب ندارد۔آغا صاحب سے پوچھا کل پرسوں ان کا خط آیا۔اس میں لکھا تھا کہ "امید ہے آپ کا حیدر قریشی سے رابطہ ہو گیا ہوگا"۔ میں نے فوراً ڈاکٹر منیر الدین احمد سے پوچھا اس نے بتایا کہ وہ بھی اصلاً لاعلم ہے مگر بھارت کے کسی رسالہ میں تمہاری غزل ہے اس کے ساتھ تمہارا پتہ ہے۔وہ پتہ ملا تو بھائی عطاء اللہ کلیم کو فون کیا۔وہ تو تشریف نہیں رکھتے تھے۔وہاں اتفاق سے میرا کوئی شاگرد بیٹھا تھا۔اس نے Hattersheim کے صدر جماعت سے رابطہ کیا۔کوئی محمود انور صاحب ہیں۔ان سے تمہارا فون نمبر مل گیا---یہ روداد محض رعب ڈالنے کے لئے لکھ رہا ہوں ورنہ دوستوں کی تلاش میں ہم صحرائے گوبی بھی چھاننے کو تیار ہیں!(جرمنی کو Karautland یعنی گوبھی خوروں کا ملک کہتے ہیں)

میں ٹھیک ہوں،دو سال پہلے دل کا بائی پاس ہوا تھا۔اب مرمت شدہ دل کے ساتھ زندہ ہوں۔دسمبر میں نانا بنا تھا اب مارچ میں دادا بھی بن گیا ہوں۔الحمدللہ۔بڑا بیٹا اور بیٹی کینیڈا میں ہیں۔چھوٹا بیٹا انڈونیشیا میں ہے۔دو بیٹیاں میرے پاس ہیں۔بیوی آج کل ساس کے فرائض ادا کرنے کے لئے کینیڈا گئی ہوئی ہے۔امید ہے اس مہینہ کے آخر تک واپس آجائے گی۔

اب اپنی روداد عشق بیان کرو! کونسی وادی میں ہے،کونسی منزل میں ہے عشق بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں!

سیفی صاحب بے چارے ۸۰ سال کی عمر میں گرفتار ہو گئے ہیں۔دو ہفتے ہو گئے ابھی تک ضمانت نہیں ہوئی۔پولیس والے ہر پیشی پر اہتمام سے ہتھکڑی لگا کر عدالت میں پیش کرتے ہیں (معلوم ہوتا ہے کم بخت پولیس والوں نے ان کی شاعری پڑھ لی ہے) بڑا دکھ ہوتا ہے۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

اپنی بیوی،بچوں کو مرا پیار دو "پروفیسر ناصر احمد۔حاتم طائی۔خدائی خدمت گار" کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ خط لکھو تو میرا سلام لکھ دینا۔

والسلام

تمہارا **پرواز**

۵-۳-۱۹۹۴---اپسالا۔سویڈن

ہیرانند سوز بنام حیدر قریشی

اے/۱۷/۲۷۔فرید آباد۔انڈیا

۱۲-۳-۹۳

محترم بھائی حیدر قریشی خلوص و نیاز

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ ماہیا گوئی پر آپ کا مضمون پڑھ لیا ہے اور آپ کے بہت پیارے ماہیے بھی جن میں روایت اور رنگ جدید کا خوبصورت امتزاج ہے۔آپ نے ماہیے کے بارے میں درست بحور اور اوزان کا بھی پورا احترام کیا ہے اور آپ کے فکری رویوں نے اس صنف سخن میں خیال آرائی اور مضمون آفرینی کے نئے در بھی وا کئے ہیں۔ان ماہیوں میں موضوعات کے تنوع کا بھی احساس ہوتا ہے۔مرجھائے درختوں کو---دیں گی بہاریں کیا---ہم سوختہ بختوں کو

دکھ حق تھا غریبوں کا---تم سے گلہ کوئی---نہ ہی شکوہ نصیبوں کا

ملنے کو ترستے ہیں---منزل گم ہے کہیں---بکھرے ہوئے رستے ہیں

اس نئے فکری اسلوب کے ساتھ ساتھ ماہیوں میں رشتوں کی تصویر کشی بھی نہایت خوبصورتی سے کی گئی ہے اور مکالمہ تو ایک پر اثر ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

آپ کا مضمون پوری وضاحت کے ساتھ یہ بیان کرتا ہے کہ ماہیا شاعری کی ایک ایسی

صنف ہے جس میں سر زمین پنجاب کی تہذیب، ثقافت اور روایات کا عکس نظر آتا ہے۔ اس میں حسن وعشق کی داستانوں کی رنگینی اور لطافت ہے۔ آپ نے اس صنف کے ارتقائی مراحل پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس کے عروضی پہلوؤں کا بھی عالمانہ انداز سے تجزیہ کیا ہے جو اس صنف سخن کو سنوارنے میں ممد ومعاون ثابت ہوگا۔

مجھے کل رحیم یار خان سے جناب احسان اعوان کا خط موصول ہوا ہے۔ انہوں نے گذشتہ سال سرائیکی دوہڑوں کا ایک انتخاب "انگارے" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اب وہ سرائیکی قطعات کا انتخاب بھی ترتیب دے رہے ہیں اور جیسا کہ خط سے ظاہر ہے وہ مجھ سے اور دیگر احباب سے سرائیکی قطعات طلب کر رہے ہیں (خط کی فوٹو کاپی ارسال کر رہا ہوں) اگر آپ چاہیں تو انہیں سرائیکی قطعات ارسال کر سکتے ہیں یا مجھے بھیج دیں میں انہیں ارسال کر دوں گا۔ آپ کے لئے سرائیکی قطعات لکھنا کیا مشکل ہے۔ جبکہ آپ نے وزیر آغا صاحب کی نظموں کا اتنا خوبصورت منظوم سرائیکی ترجمہ کیا ہے۔ امید ہے آپ خط کے جواب سے نوازیں گے۔

آپ کا **ہیرانند سوز**

علّامہ منظور احمد رحمت بنام حیدرقریشی

(ایڈیٹر ہفت روزہ ''مدینہ بھاولپور)

آپ نے جدید ادب کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ ٹھوس بھی ہیں اور صحت مند بھی۔
آپ قلم کی آبرو کے محافظ ہیں۔ اور ایسے لوگ خوش نصیب بھی ہوتے ہیں اور مرجع خلائق بھی۔
راستے کی دشواری، حریفوں کی ملامت گری، وسائل کی کمیابی اور غمِ روزگار کی خلش یہ سب پُرخلوص انسانوں کے نصیبے میں لکھ دیئے گئے ہیں۔
منافق اور شوریدہ سران نعمتوں کے جلال و جمال کو کیا جانیں!

(خط مطبوعہ ''**جدید ادب**'' کتابی سلسلہ نمبر۴۔۱۹۷۹ء)

حیدرقریشی ڈاٹ کام

کی گیسٹ بک میں سے چند تاثرات

www.haiderqureshi.com

(**نوٹ:** گیسٹ بک میں لکھا جانے والا سارا میٹر انگلش میں ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض احباب رومن رسم الخط میں اردو لکھ دیتے ہیں۔ ان کے تاثرات کو اردو کے اصل رسم الخط میں یہاں دیا جا رہا ہے۔ باقی جو تاثرات انگلش یا جرمن میں ہیں ان کو ویسے ہی دیا جا رہا ہے۔ یہ گیسٹ بک میں درج تاثرات سے ایک انتخاب ہے۔ **نذر خلیق**)

☆☆ **محمد منشا یاد** (اسلام آباد) مورخہ ۲رمئی ۲۰۰۲ء

It is very beautifully prepared site,I have not seen such a complete and well designed site in urdu.It gives full information about Haider Qureshi a veteren poet of Pakistan.I wish I could have a site just like it.I am inspired and will have my own site like this.Congratulation to Haider Qureshi and his Family members.

☆☆ **پروفیسر ڈاکٹر حمید سہروردی** (گلبرگہ یونیورسٹی۔انڈیا):
مورخہ ۱۵رجون ۲۰۰۲ء

حیدر قریشی نئی نسل کا ایک اہم اور تخلیقی فنکار ہے۔ ان کے تخلیقی اظہار کے مختلف ذرائع ہیں۔ وہ شعر اور نثر میں یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں عصری حسّیت موجود ہے۔ اردو میں ان کا کام وقیع ہے۔۔ اردو میں ان کا ویب سائٹ اردو والوں کے لئے ایک تحفہ ہے۔

☆☆ **ڈاکٹر سعادت سعید** (انقرہ یونیورسٹی، ترکی) مورخہ ۹؍ستمبر ۲۰۰۲ء

What a grand website it is!

congratulation.

I have always cared for ur pains taking for Literature and humanity.

☆☆ **ڈاکٹر لڈمیلا** (ماسکو۔روس) مورخہ ۳۰؍اپریل ۲۰۰۲ء

I was very happy to see a new urdu site in I-T and read the poetry of Mr.Haider Qureshi as well as to have some information about himself particularly.I have some books by H.Qureshi sahib,once I even had a tel. talk to him.So your site was like a meeting of an old friend.It was nice.Besides that,these days I am writing an article about urdu poetry in western countries,so your site give me some new materials.

آپ کی محنت بہت قابلِ تعریف ہے۔مبارک باد!

☆☆ **احمد سہیل** (امریکہ) ۲۳؍اپریل ۲۰۰۲ء

Just visited your website and it is very interesting and has a lot information about your life,creative and critical work.I have always read your writings and it is an inspiration in my work.

☆☆ **سلطان جمیل نسیم** (کینیڈا) ۲۱؍اپریل ۲۰۰۲ء

I have visited new website.۔۔۔مبارک۔۔مبارک۔سلامت۔۔سلامت۔

اللہ کرے ذوقِ سخن اور زیادہ!۔۔۔۔حیدر قریشی کا قلم رواں رہے۔

☆☆ **پیٹر آساؤیر** Peter Assauer (فرینکفرٹ۔جرمنی) ۲؍مئی ۲۰۰۲ء

bin ein Lehrer von Tariq Haider,dem sohn die seite gefällt mir gut! vielleicht könnten Sie einige links in english schalten und die Gedichte übersetzen.

☆☆ **آنّے لوئرس** (ویزبادن۔جرمنی) مورخہ ۳۰؍اپریل ۲۰۰۲ء

sehr nett gemacht! Viele Grüße,

Anne Lüers

☆☆ **مولانا مفتی خالد محمود** (کراچی) مورخہ ۲؍جون ۲۰۰۲ء

Your SAFARNAMA is very useful and valuable.I read in 1 sitting.

☆☆ **پروفیسر عبدالرب استاد** (گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ، انڈیا)

مورخہ ۲۶؍مئی ۲۰۰۲ء

آج کے اس دور میں جہاں اردو انحطاط پذیر سمجھی جا رہی ہے، اس میں ایسا اقدام۔۔۔واللہ قابلِ تحسین، مبارک صد مبارک۔۔۔۔اللہ کرے اردو کی خدمت اور علمی میدان میں ’’ھل من مزید‘‘ عطا ہو۔تشنگانِ علم و ادب کی پیاس بجھانے میں آپ کی کوششیں ممد و معاون ثابت ہوں گی۔انشاءاللہ

☆☆ **خالد حمید فاروقی** (نیدرلینڈ) مورخہ ۱۴؍جون ۲۰۰۲ء

Nice Website,passionate work gone into it.I must admit this is an impressive work.

☆☆ **ترنّم ریاض** (نئی دہلی۔انڈیا) مورخہ ۶؍مئی ۲۰۰۲ء

A Multi-dimentional literary personality...............

Haider Qureshi.the site is a must for urdu lovers.

☆☆ **ارشاد ہاشمی** (ہنگن۔جرمنی) ریذیڈنٹ ایڈیٹر ڈیلی اوصاف یورپ ایڈیشن

مورخہ ۲۳؍اپریل ۲۰۰۲ء

It is very pleasant and refreshing itself with a writing flavour from Haider Qureshi`s natural, spontane and all round best literary efferts.my best wishes and futher new ideas.

☆ ☆ **محسن خان** (ایش بورن، جرمنی) ایڈمن ایڈیٹر ڈیلی اوصاف یورپ

مورخہ ۲۴/اپریل ۲۰۰۲ء

I have already heared about Mr.Haider Qureshi and his literary work, but is my first touch with his poetry and other writings.i have spend many hours in his web.I have got every thing in his poetry and literature like love,vision,humanfeelings,friendship,reality and dreams.I think I visit this web frequently.

☆ ☆ **صغیر احمد جعفری** (ابوظہبی) مورخہ ۲۳/اپریل ۲۰۰۲ء

It is an interesting and informative website.You are carrying out excellent work for promotion of urdu language and literature. welldone.

☆ ☆ **عارف فرہاد** (راولپنڈی) مورخہ یکم جون ۲۰۰۲ء

Haider Qureshi has realised the outer world by means of his inner eye.No one can forget his work for urdu Adab.He is a writer of today and future.I pray for his long life.

☆ ☆ **قاضی عنایت الرحمٰن** (برمنگھم۔انگلینڈ) مورخہ ۲/اکتوبر ۲۰۰۲ء

well done.this is a kind of website that will perform miracles in the service of ADAB.

حیدر قریشی کا خط نذر خلیق کے نام

برادرم نذر خلیق صاحب سلام مسنون

یار۔۔۔۔زندگی بھی کتنی عجیب ہے۔کبھی کچھ لوگ کتنے قریب ہوتے ہیں اور پھر یکا یک نہ صرف دور ہو جاتے ہیں بلکہ ذہن اور دل سے بھی محو ہو جاتے ہیں۔آپ کے ساتھ ایک ہلکی سی تلخی وابستہ تھی اور اس میں تب اضافہ ہوا جب میں نے جرمنی پہنچ کر آپ کو خط لکھا اور آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔تب مجھے یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ خط ضائع بھی ہو سکتا ہے۔بس پھر شعوری طور پر ہی نہیں، لاشعوری طور پر بھی کچھ یاد نہ رہا۔چلیں آپ کے ساتھ تو ایک ہلکی سی تلخی وابستہ تھی۔نقوی احمد پوری، مظہر مسعود، ڈاکٹر انور صابر، خورشید ناظر اور نواز کاوش جیسے نام بھی یاد نہیں رہے۔لیکن دیر آید درست آید۔۔۔۔اب آپ سے رابطہ ہوا ہے تو مذکورہ سارے دوست یاد آ گئے ہیں اور ان کے ساتھ جڑی ہوئی یادیں بھی جگمگانے لگی ہیں۔دیکھیں اب یہ یادیں تخلیقی طور پر مجھے کیا ''عطا'' کرتی ہیں۔

نقوی احمد پوری صاحب کی ایک نظم جو میں نے لگ بھگ بیس سال پہلے ''جدید ادب'' میں چھاپی تھی۔عنوان تو اس وقت ذہن میں نہیں آ رہا لیکن اس کی ابتدائی سطریں اس وقت یاد آ رہی ہیں:

اے خوش گلو خوش کلام لوگو

اے واجب الاحترام لوگو

اے خواہشوں کے غلام لوگو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آپ نے تو خورشید اقبال صاحب اور سعید شباب کے ساتھ مل کر میرے ادبی کام کی ویب سائٹ بنوا کر اپنی ساری تاخیر اور غیر حاضری کی تلافی کر دی ہے۔اب اوپر سے یہ کتاب جو آپ مرتب کر رہے ہیں۔اب میں کیا کہوں؟ کبھی کسی سے بہت زیادہ توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں اور خدا دکھاتا ہے کہ وہ کسی توقع کو بھی پورا نہیں کرتا۔اور کسی سے کوئی توقع تو کیا توقع کا گمان تک نہیں ہوتا اور خدا وہیں سے اتنی محبت دے دیتا ہے کہ جھولی بھر جاتی ہے۔پہلے خورشید اقبال صاحب سے رابطہ ہونا

اوران کے بعد آپ سے اچانک رابطہ بحال ہونا اور پھر ویب سائٹ کا قائم ہو جانا، میرے لئے ناممکن کا ممکن ہو جانا ہے۔ اللہ آپ دونوں کو خوش رکھے۔

پروفیسر آفاق صدیقی صاحب نے اپنے زاویہ نگاہ سے اچھا مضمون لکھا ہے۔ مجھے ان کا انداز اچھا لگا۔ ڈاکٹر شفیق صاحب کا مضمون اس لحاظ سے بہت دلچسپ اور عمدہ ہے کہ انہوں نے میری شاعری میں سے میرے سوانحی اشارے بڑی وضاحت کے ساتھ ڈھونڈ نکالے ہیں۔ میری شاعری کا اس انداز سے پہلی بار کسی نے جائزہ لیا ہے۔ مجھے اس سے دلی مسرت ہوئی ہے۔ آپ کو ایک بات بتاؤں، جب میں نے ہمت رائے شرما جی پر اپنی کتاب شائع کرالی تھی تو ایسے ہی ایک دن مجھے خیال آیا کہ میرے ذریعے خدا نے ایک ایسے شخص کو نئی ادبی زندگی دے دی ہے جو گزشتہ کئی دہائیوں سے گوشۂ گمنامی میں پڑا تھا۔ ہوسکتا ہے مدت بعد کبھی کوئی مجھ پر بھی اسی طرح تھوڑا بہت کام کر دے۔ لگتا ہے خدا نے میرے دل کے بہت اندر ہونے والے اس حساب کتاب کو دیکھ کر مجھے ''مدت بعد'' کے ادھار پر نہیں رکھا اور اسی وقت نقد ادائیگی کر دی۔ پہلے نذیر فتح پوری اور سنجئے گوڑ بولے کی خوبصورت کتاب آئی، پھر آپ کی کتاب کی خبر آئی، پھر منزہ بی بی کے مقالہ کی خبر آئی۔۔۔ تو صاحب مجھے تو نقد ادائیگی بھی سود کے ساتھ ہو رہی ہے۔ اس کے لئے خدا کا شکر گزار ہوں اور اس کے بعد آپ سب کا شکر گزار ہوں۔

سوالات کی بھر مار سے آپ نے مجھے بہت مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اس سے بہتر تھا آپ الگ الگ ای میلز کے بجائے ایک ہی نشست میں انٹرنیٹ انٹرویو کر لیتے۔ بہرحال آپ کی ساری ای میلز کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ کی مطلوبہ وضاحتیں کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

آپ نے اپنے پیش لفظ میں ''مذہبی'' حوالے سے کچھ لکھنے کا ذکر کیا تھا۔ دراصل اس میں اخفا والی تو کوئی بات نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے تعلق سے اگر کوئی بات آئے تو اپنے اصل سیاق سباق کے ساتھ آئے۔ میرا نئے سرے سے ''کھٹی میٹھی یادیں'' لکھنے کا ارادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس تعلق سے بیشتر باتیں ان یادوں میں آجائیں گی۔ کچھ بچ رہیں تو ایک آدھ آرٹیکل کی صورت میں بیان کر دوں گا۔ یہ بہرحال میری زندگی کے اہم موڑ ہیں اور ان کے بغیر میری زندگی کا ایک حساس حصہ یا بالکل مخفی رہے گا یا پھر شبہات میں ملفوف ہو جائے گا۔ لیکن کب میرا موڈ بنتا ہے اور کب لکھنا شروع کر پاتا ہوں، اس کے بارے میں حتمی طور پر ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہوسکتا

ہے موڈ بن جائے تو آپ کی کتاب چھپنے سے پہلے ہی لکھنا شروع کر دوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی کافی وقت لگ جائے۔ اس لئے آپ اپنے طور پر کچھ لکھنا چاہیں تو بے شک لکھیں۔ سیاق سباق سے ہٹ کر کوئی بات ہوئی تو پھر مجھے اس کی وضاحت کرنا پڑے گی۔ ویسے یہ ہوسکتا ہے کہ ایسی وضاحت کے نتیجہ میں ہی مجھے ازسرِ نو اپنی یادیں لکھنے کی تحریک مل جائے۔

ویسے آپ کی اخفا والی بات سے یاد آیا کہ بہت پہلے میں نے ڈاکٹر انور سدید صاحب کا خاکہ لکھا تھا۔ اس میں اپنا خاندانی فکری پس منظر اور انور سدید صاحب کا خاندانی فکری پس منظر کھل کر لکھا تھا۔ ان کے خاکے میں یہی ایک اہم بات تھی جو ان کے بارے میں باقی دوستوں کے مضامین سے مختلف تھی۔ لیکن انہوں نے دبی زبان میں مجھے کہا کہ مذہبی حصہ کو حذف کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ وہ اپنے حساب سے درست تھے اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ بات نہ آئی تو یہ خاکہ ان کے دوسرے دوستوں کے مضامین جیسا ہو جائے گا۔ اس ذکر سے مقصد یہ ہے کہ بھائی اخفا والی بات کوئی نہیں ہے۔ البتہ اس عرصہ میں اس ''رہِ عشق'' میں دو چار سخت مقام آچکے ہیں اور اپنی اس کہانی کو، فکری سفر کو میں خود ہی بہتر طور بیان کر سکوں گا۔ یا پھر ڈاکٹر شفیق صاحب میری ساری تخلیقات میں سے میرے فکری سفر کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ لیکن ان کی تحقیق میرے مرنے کے بعد ہی مفید ثابت ہوگی۔ جیتے جی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس لئے میں نے کہا تھا کہ اسے مجھ پر چھوڑ دیں تو زیادہ بہتر ہے۔ بہرحال اخفا والی کوئی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر انور سدید صاحب کی کتاب ''شام کا سورج'' سے آپ نے جو حوالہ نکالا ہے بہت عمدہ ہے۔
لیکن انشائیے اور ماہیے کے تعلق سے چند امور توجہ طلب ہیں۔ انشائیہ انگریزی سے اردو میں آیا تھا اس لئے اس کی تفہیم میں کنفیوژن کی گنجائش ہوسکتی تھی۔ ماہیا تو اپنی ہی دھرتی کی لوک شاعری تھی اس کی تفہیم میں کوئی کنفیوژن پیدا نہیں ہوا بلکہ جان بوجھ کر پیدا کیا گیا، کرایا گیا۔ غالب پر ڈاکٹر لطیف کی جارحانہ تنقید اور ان کی اپنی شاعری کی ''اوقات'' والی بات انشائیہ کی طرح ماہیے کے مخالفین پر بھی ویسے ہی فٹ بیٹھتی ہے۔ شخصیات کو ہدف بنانے والے چاہے انشائیہ کے مخالفین تھے یا ماہیے کے حاسدین وہ سب ڈاکٹر لطیف جیسے لوگ تھے۔ لیکن ماہیے کے مخالفین میں کچھ اور طرح کے لوگ بھی ہیں۔ ایسے لوگ جو ماہیا کہتے ہیں تو ہمارے ہی وزن کو ملحوظ رکھتے ہیں اس کے باوجود ''کسی کے اشارے پر'' ہدفِ تنقید بھی ہمیں ہی بناتے ہیں۔ بہرحال آپ جیسے چاہیں اس

حوالہ کو اپنے پیش لفظ میں شامل کریں اور جیسے چاہیں لکھیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں اور میرا خیال ہے انور سدید صاحب کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

آپ نے جو مطبوعہ خطوط منتخب کئے ہیں، مناسب ہیں۔ میں چند ایسے خطوط آپ کو بھیج رہا ہوں جو غیر مطبوعہ ہیں اور جن کی اشاعت کسی نہ کسی حوالے سے اہم ہو سکتی ہے۔ آپ چاہیں تو ان خطوط میں سے اپنی پسند کے خط منتخب کر لیں۔

ان دنوں میں انٹرنیٹ پر خاصا متحرک ہوں۔ اس جدید ٹیکنالوجی کا مجھے کوئی علم نہیں ہے۔ بس ٹیپو جتنا سکھا دیتا ہے اس کے مطابق رٹا لگا لیتا ہوں اور اپنا گزارا ہو جاتا ہے۔ اردو پروگرام کے سلسلے میں خواجہ محمد آصف کوپن ہیگن ڈنمارک سے خاص طور پر مجھے سمجھانے کے لئے آئے تھے۔ ان کو میں اس سلسلے میں اپنا استاد مانتا ہوں (ویسے بھی وہ استاد ہیں۔ وہاں پڑھاتے ہیں)۔ کچھ مسائل ارشاد ہاشمی صاحب حل کر دیا کرتے ہیں۔ آپ مسلم لیگ (ن) والے جاوید ہاشمی کے کزن ہیں۔ پہلے ''اردو دنیا'' جرمنی کے چیف ایڈیٹر تھے۔ اب ڈیلی اوصاف یورپ کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر ہیں۔ بنیادی طور پر کمپیوٹر انجینئر ہیں۔ اس لئے کمپیوٹر میں کوئی مشکل آ جائے تو وہ آڑے آ جاتے ہیں۔ اردو کی ان ویب سائٹس کو تو میں اب اپنی ویب سائٹس سمجھنے لگ گیا ہوں۔

www.urdudost.com

www.urdustan.net

www.alqamaronline.com

www.urduclassic.com

ان کے علاوہ کینیڈا سے فیصل فارانی کی ویب سائٹ ''اردو ادب'' اور ''اردو ڈٹ کے'' والے بھی عزت سے پیش آتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ دن میں ۲۰، ۲۵ خطوط آسانی سے لکھ لیا کرتا تھا۔ اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ عزیزی منزہ کو اپنے مقالہ کے لئے میری ہینڈ رائٹنگ میں میرے خط کی ضرورت تھی اور اسے لکھنے کے لئے موڈ بناتے ہوئے دو دن لگ گئے۔ دراصل اب انٹرنیٹ کے ذریعے رابطوں کے بعد پین اور بال پین سے لکھنا بھول سا گیا ہوں۔ انٹرنیٹ سے اردو میں بھیجنا بھی آسان ہو گیا ہے۔ اب ایک لطیفہ سنیں۔۔۔۔۔ ایک دن میں پنجابی کی ایک ویب سائٹ ''اپنا آرگ ڈاٹ کام'' سے طفیل ہوشیارپوری صاحب کا مشہور گانا ''چٹھی میری ڈھول نوں

پچائیں وے کبوترا'' سنتے ہوئے دوستوں کی ای میلز کے جواب دے رہا تھا۔ گانے سے اپنی بعض یادوں کے باعث میں کچھ جذباتی سا بھی ہو رہا تھا۔ اسی دوران کمرے میں مبارکہ آ گئی اور ہنسنے لگ گئی۔۔۔۔۔ میں نے حیران ہو کے پوچھا کیا ہوا ہے؟

کہنے لگی انٹرنیٹ پر ای میلز کے جواب لکھ رہے ہیں اور ساتھ ''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' سن کر جذباتی ہو رہے ہیں۔

مبارکہ کی بات سن کر میں اپنی جذباتی کیفیت ہی میں مسکرا دیا۔

لیکن بعد میں غور کیا تو مجھے کبوتروں کے ذریعے پیغام بھیجنے والے دَور سے ای میل کے ذریعے پیغام بھیجنے والے دَور تک کے سارے زمانے اپنے اندر برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔ نیا دور اپنی طرف بلاتا ہے اور اس میں بڑی کشش ہے، اس کا مضبوط جواز بھی ہے۔ پہاڑ کی چوٹی تک جانا آسان ہے لیکن دوسری طرف پرانے دور کی یادیں مسلسل بلاتی ہیں۔ روتی ہوئی، ہنستی ہوئی، ہر طرح کی آوازیں بلاتی ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ گزرے زمانے کی آوازوں پر مڑ کر دیکھنے والے شہزادے پتھر کے ہو جاتے ہیں۔ اس کے باوجود میں نہ صرف مڑ کر دیکھتا ہوں بلکہ ہر قدم پر مڑ کر دیکھتا ہوں اور خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی کوشش بھی کرتا جاتا ہوں۔ ''چٹھی میری ڈھول نوں پچائیں وے کبوترا'' جذباتی ہو کر سننا، پہاڑ پر جاتے ہوئے مڑ کر دیکھنے جیسا ہے اور ساتھ ساتھ ای میلز کے جواب لکھتے جانا خود کو مکمل پتھر ہونے سے بچانے کی کوشش ہے۔

یار۔۔۔ یہ میں خط لکھتے لکھتے ''یادیں'' لکھنے کی طرف تو نہیں آنے لگا؟

ابا جی سے آپ خود بارہا ملے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کے بارے میں خود آپ کی اپنی ایک رائے ہوگی۔ میری رائے میں تو بیٹا ہونے کی نسبت سے محبت کا غلبہ زیادہ ہو جائے گا۔ بہر حال ابا جی کے بارے میں میرا احساس یہ ہے کہ ان میں قریشیت والی روحانیت کے گہرے اثرات تھے۔ لیکن مجھے اب آپ کی باتوں پر مزید لکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ یا تو کبھی انٹرویو کر لیجئے گا یا پھر مجھے موقعہ ملا تو اپنے طور پر آپ کے استفسارات کے حوالے کے بغیر ان باتوں کو کسی نہ کسی رنگ میں بیان کر دوں گا۔ فی الحال اتنے پر ہی گزارا کریں۔

بھابی کو بہت بہت سلام اور بچوں کو پیار۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

والسلام آپ کا **حیدر قریشی** مورخہ ۱۶ر نومبر ۲۰۰۲ء